ACADEMIC & LITERARY CONTRIBUTION OF ABID MOIZ

(ABID MOIZ KI ILMI O ADBI KHIDMAT)

A THESIS SUBMITTED TO THE UNIVERSITY OF HYDERABAD IN PARTIAL FULFILMENT OF THE REQUIREMENT FOR THE AWARD OF DEGREE OF
DOCTOR OF PHILOSOPHY
IN URDU.

SUBMITTED BY
MD MAJEED MIYAN
M.A,M.Phil

Supervisor
Dr.RIZWANA MOIN
Associate Professor,
Dept. of Urdu,University of Hyderbad

DEPARTMENT OF URDU
SCHOOL OF HUMANITIES.
UNIVERSITY OF HYDERABAD
(P.O) CENTRAL UNIVERSITY, GACHIBOWLI
HYDERABAD - 500 046.
Andhra Pradesh , India
July 2013

عابد معز کی علمی و ادبی خدمات

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

نگران

ڈاکٹر رضوانہ معین

اسوسیئیٹ پروفیسر شعبہ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

مقالہ نگار

محمد ماجد میاں

ایم اے، ایم فل

شعبہ اردو اسکول آف ہیومانٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد۔۵۰۰۰۴۶

جولائی ۲۰۱۳ء

فہرست

ابتدائیہ I - IV

باب اول: 1

سوانح اور شخصیت

(الف) سوانحی حالات

(ب) شخصیت

باب دوم: 48

عابد معز بحیثیت طنز و مزاح نگار

باب سوم: 162

عابد معز بحیثیت افسانہ نگار، انشائیہ نگار، کالم نگار

باب چہارم: 230

اسلوب اور تکنیک

باب پنجم: 283

عابد معز کی طبی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ

(الف) ذیابیطس کے ساتھ ساتھ

(ب) کولسٹرال کم کیجیے

(ج) چکنائی اور ہماری صحت

(د) غذا اور تغذیہ (زیر اشاعت)

اختتامیہ 379

کتابیات 384

☆☆☆

ابتدائیہ

ڈاکٹر عابد معز کی ادبی شخصیت کے ہمہ جہت پہلو ہیں وہ بہ یک وقت کالم نگار، انشائیہ نگار، افسانہ نگار اور طبی سائنسی مضمون نگار کے علاوہ ممتاز طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔ دراصل انہوں نے ادبی دنیا میں ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ہی قدم رکھا۔ ان کی بیشتر ادبی تحریروں میں طنز و مزاح کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

عابد معز نے اپنے گردو پیش کے ماحول کی ناہمواریوں کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا لیکن ان کے طنز کے پیچھے اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے۔ وہ روزمرہ معاملات و واقعات کو مزاحیہ انداز میں نہایت آسان و سلیس زبان میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں سماج و معاشرے کے نشیب و فراز کی ترجمانی کرتے ہیں۔

تحقیق میں سب سے اہم مرحلہ موضوع کا انتخاب ہوتا ہے۔ مجھے طنز و مزاح سے فطری لگاؤ ہے اس لیے میں نے اپنا ایم فل کا مقالہ زندہ دلان حیدرآباد کے سابق صدر جناب نریندر لوتھر صاحب کی مزاح نگاری پر تحریر کیا۔ میں چاہتا تھا کہ پی ایچ ڈی بھی اسی میدان میں کروں۔ لہٰذا میں نے پی ایچ ڈی کے موضوع کی تلاش میں کئی مزاح نگاروں کا مطالعہ کیا جس میں سے ایک ڈاکٹر عابد معز بھی تھے۔ مجھے ڈاکٹر عابد معز کے مزاحیہ کالم سے دلچسپی پیدا ہوئی، چنانچہ میں سابقہ صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد پروفیسر بیگ احساس کے سامنے ڈاکٹر عابد معز کی مزاحیہ کالم نگاری پر کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے کچھ دیر سوچ کر فرمایا کہ ڈاکٹر عابد معز کے کالموں کے علاوہ ان کی علمی اور ادبی خدمات پر کام کریں تو بہتر ہوگا۔ میری نگران محترمہ ڈاکٹر رضوانہ معین صاحبہ نے بھی ڈاکٹر عابد معز پر کام کرنے کے تعلق سے رضامندی کا اظہار کیا۔ یوں صدر شعبہ اور نگران کی رضامندی سے پی ایچ ڈی کے لیے میرا موضوع ''عابد معز کی علمی اور ادبی خدمات'' طے پایا۔

موضوع کے انتخاب کے بعد دوسرا اہم مرحلہ مواد کی فراہمی کا ہوتا ہے، یہ مشکل مرحلہ تھا کیونکہ ڈاکٹر عابد معز صاحب ریاض سعودی عرب میں رہتے ہیں اور چھٹیوں میں حیدرآباد تشریف لاتے ہیں۔ ان کی آمد تک انتظار کرنا تاخیر کا باعث بن سکتا تھا۔ میں نے ان سے فون پر عرض مدعا بیان کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے صرف دو دن میں خاصا مواد اپنے فرزند سید خواجہ تقی الدین کے ذریعہ فراہم کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی دوری مواد اکٹھا کرنے میں حائل نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر عابد معز کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقات سلیقہ مندی سے کمپیوٹر میں اور کتابی مسودوں کی شکل میں محفوظ رکھتے ہیں۔ چنانچہ مواد کی فراہمی کا یہ مشکل مرحلہ بھی آسانی سے طے ہو گیا۔

اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب عابد معز کی حیات اور شخصیت کے متعلق ہے۔ اس باب میں عابد معز کے آباواجداد، والدین، بھائی بہن کی تفصیلات دیتے ہوئے ان کی ولادت، تعلیم وتربیت، ملازمت، شادی، سماجی وادبی خدمات، ادبی سفر کی ابتدا کے علاوہ ان کی تمام تصانیف کا اختصار سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مشاغل، حلقہ احباب کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اسی طرح آگے عابد معز کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں جیسے ملنساری، شگفتہ مزاجی، اصول پسندی، قائدانہ صلاحیت وغیرہ کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔

دوسرا باب عابد معز بحیثیت طنز ومزاح نگار رکھا گیا ہے۔ عابد معز نے اپنے گردوپیش کے ماحول کی ناہمواریوں کو طنز ومزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ چنانچہ اس باب میں ان موضوعات کا تجزیہ کیا گیا ہے جن کو عابد معز نے اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بنایا ہے جیسے مہنگائی، معاشرے کی اخلاقی گراوٹ، جنگ ودہشت گردی، بڑھتی آبادی، مغربی معاشرے کی تقلید وغیرہ۔

تیسرا باب عابد معز بحیثیت افسانہ نگار، انشائیہ نگار، کالم نگار کے عنوان کے تحت بات کی گئی ہے۔ اس باب میں عابد معز ا کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے افسانوں کے نمائندہ موضوعات کا تجزیہ

کیا گیا ہے۔اس کے بعد عابد معز کی انشائیہ نگاری کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے ان کے انشائیوں کی خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ عابد معز کی کالم نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کالموں کے اہم موضوعات و مقاصد کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں عابد معز کے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے طنز ومزاح کی تکنیک کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔جیسے لطیفہ گوئی، چٹکلہ بازی، خود بردشتہ مزاح، بزلہ سنجی، ضرب الامثال، کہاوتیں، تراکیب، تلمیح موازنہ، لفظی بازی گری اور مزاحیہ صورت واقعہ وغیرہ۔

پانچواں باب عابد معز کی طبی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ ہے جس میں ان کی چار اہم تصانیف جو طب، صحت وتغذیہ کے موضوع پر مشتمل ہیں۔ذیابیطس کے ساتھ ساتھ، کولیسٹرال کم کیجئے، چکنائی اور ہماری صحت اور غذا اور تغذیہ۔پر مفصل روشنی ڈالتے ہوئے طبی وسائنسی ادب میں ان تصانیف کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

مقالہ کے آخر میں اختتامیہ رکھا گیا ہے، جس میں عابد معز کی علمی وادبی خدمات کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

شکریہ کے فرائض میں سب سے پہلے میں اپنی نگران اسوسیٹ پروفیسر ڈاکٹر رضوانہ معین صاحبہ کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ومشکور ہوں کہ انہوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تکمیل تک ہر موقع پر مجھے بھر پور تعاون دیا اور رہنمائی کی۔حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے گراں قدر مشورے اور بے پایاں تعاون کے بغیر یہ مقالہ مکمل ہی نہیں ہو پاتا۔میں شعبہ کے اساتذہ میں سب سے پہلے صدر شعبہ اردو استاد محترم پروفیسر مظفر شہ میری صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو تحقیق کے دوران وقتاً فوقتاً مشورے دیتے رہے، ان کے مخلصانہ تعاون کے لیے میں استاد محترم کا شکر گزار ہوں۔

میں پروفیسر انورالدین صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے دوران تحقیق نہ صرف

اپنے مفید مشوروں سے نوازا بلکہ میری خبر گیری بھی کرتے رہے۔ میں استادمحترم پروفیسر بیگ احساس صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے نہ صرف موضوع کے انتخاب میں میری مدد فرمائی بلکہ دوران تحقیق بھی مجھے ان کا تعاون اور مشورے حاصل رہے۔ میں ڈاکٹر حبیب نثار صاحب کا بھی ممنون ومشکور ہوں جنہوں نے مجھ میں تحقیق کے لیے محنت ومشقت کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ میں ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے دوران تحقیق مفید مشوروں سے مجھے نوازا اور میری خبر گیری کی۔ اسی طرح میں شعبہ کے دیگر اساتذہ ڈاکٹر عبدالرب منظر، ڈاکٹر کاشف احمد، ڈاکٹر نشاط احمد، اور ڈاکٹر زاہد الحق، کا بھی ممنون ومشکور ہوں جنہوں نے تحقیق کے ہر موڑ پر میری حوصلہ افزائی کی۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں موضوع تحقیق ڈاکٹر عابد معز صاحب اور ان کے افراد خاندان کا شکریہ ادا نہ کروں۔ ڈاکٹر عابد معز نے مواد کی فراہمی میں جب کبھی مجھے دشواری ہوئی تو بلا جھجک مجھے گھر آنے کی اجازت دی بلکہ اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود وقت نکال کر مجھے مواد فراہم کیا اور مجھے ان کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔

میں ڈاکٹر عابد معز کے ان دوست واحباب کا بھی ممنون ومشکور ہوں جن کی مطبوعہ تحریروں سے مدد ملی۔ جن میں ڈاکٹر ماجد قاضی، ڈاکٹر سعید نواز، ڈاکٹر محمد عبدالحیط (افسر آرموری)، ڈاکٹر محمد اسلم، پرویز، پروفیسر لیق صلاح، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر اعجاز، ڈاکٹر محسن جلگانوی، پروفیسر کلیم چغتائی، پروفیسر حسین سحر، فہیم سحر مداعلیٰ، طارق متخلص، شجاع اور غور، غوث ارسلان، میر فراصت علی، خسرو، نعیم جاوید، علیم خان فلکی، پروفیسر یداللہ مہدی، فیاض احمد فیضی، محمد یوسف رحیم بیدری، مصطفیٰ کمال شامل ہیں۔

میں اپنے کرم فرماؤں کا بھی شکریہ ادا کرنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے دوران تحقیق میری رہنمائی کی اور بھرپور تعاون کیا۔ ان میں ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی، بیدر ڈاکٹر عبدالرب استاد، ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی، محمد فاروق احمد پرنسپل فرسٹ گریڈ کالج بیدر، محمد خلیل مجاہد لکچرار، محمد یوسف عبدالرحیم بیدری، ڈاکٹر خلیل

احمد لکچرر بیدر، ظہیر احمد خاں لکچرر، ڈاکٹر محمد نظام الدین لکچرر، ڈاکٹر محمد شمس الدین، عبدالمقتدر تاج کا بھی تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

میں اپنے والدین کی کرم فرمائیوں کا کسی طرح شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ میرے والد سید عبدالرشید اور والدہ صاحبہ جنہوں نے مجھے صغیر سنی سے آج تک اپنی بے پایاں شفقت کے سائے میں پروان چڑھایا اور دینی و دنیاوی تعلیم سے سرفراز کیا۔ آج میں جس مقام پر ہوں اللہ رب العزت کی عنایت کے بعد اپنے والدین کی محنتوں اور کاوشوں کے طفیل سے ہوں۔ رب العزت میرے والدین کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور مجھے اپنے والادین کی ہمیشہ فرمابرداری کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین، گھر کے دیگر افراد بالخصوص بڑے بھائی سید جاوید پاشاہ اور بھابی سیدہ اسریٰ بیگم، میری بہنیں سیدہ انجم بیگم، سیدہ ناظمہ بیگم، سیدہ اسماء بیگم، سیدہ تحسین النساء، اور میری اہلیہ سیدہ اسماء بیگم اور میرے چھوٹے بھائی سید ساجد پاشاہ، سید واجد پاشاہ، کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جن کے تعاون کی وجہ سے میرا یہ تعلیمی سفر آسان ہوا۔ میں اپنے بہنوئی جناب محمد قیوم صاحب، ظہیر آباد کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میرے تعلیمی سفر میں میری حوصلہ افزائی کی، میں محمد علیم الدین صاحب اور محمد ممتاز احمد محیب کا میں بے حد شکر گذار ہوں۔ میں اپنے خسر سید ہاشم علی اور برادر نسبتی سید آصف، سید عمران کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے میرے حق میں دعا کی۔

میں اپنے ہر دل عزیز دوست ڈاکٹر اسمٰعیل خان چمکوڑ (بیدر) کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں، جن کے ساتھ تحقیق کے دشوار کن راہیں با آسانی طے ہوگئیں اور میں اپنے دیگر دوست احباب میں محمد شفیع الدین، محمد اقبال گلبرگہ، محمد معین الدین، محمد عباس علی، محمد خالق، محمد جمال احمد، شاہ ولی، ڈاکٹر نثار احمد ظہیر آباد، ڈاکٹر سائی ناتھ، ڈاکٹر رئیس باجی، ڈاکٹر تحسین النساء، ڈاکٹر عطیہ بیگم، زرینہ خانم، غوثیہ بیگم، اور میرے گاؤں بگدل کے دوست احباب میں محمد احمد، محمد ضمیر احمد، محمد اعظم الدین، محمد لئیق، نثار احمد، محمد مشتاق احمد، حافظ محمد مقیم، ڈاکٹر محمد سمیع الدین، ڈاکٹر علاء الدین، ڈاکٹر ایم اے ہادی، محمد ایاز بیدر، محمد جمیل احمد، شیخ محمد

وسیم، عبدالسمیع بیدر   اور ایس آئی او بگدل کے ممبران محمد آصف، محمد اقبال، محمد سید، محمد مصطفیٰ، محمد عظیم کا بھی ممنون ومشکور ہوں جنہوں نے ہر وقت میرے حق میں دعا کی۔

آخر میں اس مقالے کے کمپوزر جناب محمد مخدوم محی الدین صاحب اور ان کے فرزند محمد کلیم محی الدین   کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے خوبصورتی کے ساتھ اس مقالے کو کمپوز کیا اور وقت پر میرا مقالہ داخل کرنے میں مدد کی۔

شکریہ

محمد ماجد میاں

ریسرچ اسکالر

باب اول

سوانح اور شخصیت

(الف) سوانحی حالات

آباء واجداد

ڈاکٹر عابد معز کے آباء واجداد کی نسبت چشتیہ سلسلے کے ایک بزرگ حضرت خواجہ رکن الدین اولیا ؒ سے ہے۔ حضرت خواجہ رکن الدین اولیاؒ کے جدامجد عراق سے تبلیغ و اشاعت دین کے سلسلہ میں ترک وطن کر کے ہندوستان آئے پہلے دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ جب سلطان محمد تغلق حکمران ہوئے انھوں نے سیاسی حالت کی بناء پر دارلسطنت کو دہلی سے دیوگری (دولت آباد) منتقل کرنے کا حکم دیا اس شاہی فرمان سے تمام لوگوں کی ہدایت کی کہ وہ دہلی چھوڑ کر دولت آباد منتقل ہو جائیں چنانچہ دیگر سینکڑوں افراد کے ہمراہ آپ کا خاندان بھی دولت آباد منتقل ہو گیا۔ ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد آپ کے آبا و اجداد نقل مقام کرتے ہوئے بیجاپور تشریف لے گئے۔ وہیں حضرت خواجہ رکن الدین اولیاؒ کی ولادت ہوئی۔ عہد طفلی اور عہد شباب بیجاپور ہی میں گذارا اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ پھر سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے خلفاء سے بعیت کر کے منصب رشد و ہدایت پر فائز ہوئے۔ اپنے مریدین کے ساتھ اشاعت دین کی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہوئے آپ نے وہاں سے نقل مقام کیا اپنے خاندان کے ہمراہ حیدرآباد سے ہوتے ہوئے ضلع محبوب نگر کے تعلقہ کلواکرتی کو اپنا مرکز رشد و ہدایت بنایا۔ یہیں سے اپنی تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ آپ کی ہدایت سے ہزاروں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ بالآخر آپ نے ۲۴ ذی الحجہ ۱۰۶۲ھ مطابق 1651ء کو وفات پائی آپ کا مزار کلواکرتی میں ہے۔ ہر سال ۲۴ تا ۲۶ ذی الحجہ تین دن تک عرس منعقد ہوتا ہے۔ آج بھی درگاہ شریف کو سید سراج الدین صاحب کے مکان سے صندل برآمد ہوتا ہے۔ سید سراج الدین صاحب ڈاکٹر عابد معز کے والد کے چچا زاد بھائی ہیں۔ غرض ڈاکٹر عابد معز کے آبا و اجداد کا

تعلق ضلع محبوب نگر تعلقہ کلوا کرتی کے ایک عزت دار مرشدی گھرانے سے ہے۔آج بھی وہاں ان کے گھر کو درگاہ والوں کا گھر کہتے ہیں۔

دادا۔دادی:

ڈاکٹر عابد معز کے دادا میر سید محمد علی وطن تعلقہ کلوا کراتی ضلع محبوب نگر میں پیدا ہوئے ،عدالت میں محرر تھے،ان کو کل چھے اولاد ہوئیں۔جن میں پانچ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ان کا انتقال تب ہوا جب ڈاکٹر عابد معز ۸ یا ۱۰ سال کے تھے۔ان کی دادی کا نام محبوب بیگم تھا۔ماڑاپور ضلع محبوب نگر کے جاگیر دار محمد علی کی صاحبزادی تھیں۔سید میر محمد علی کی چھ ۶ اولاد تھیں ان میں پانچ لڑکے سید عبدالحلیم ،سید خواجہ قطب الدین ،سید خواجہ معین الدین ،سید خواجہ رکن الدین ،سید خواجہ رشید الدین ،ایک لڑکی خورشید بیگم تھیں عابد معز کے والد سید خواجہ قطب الدین سید محمد علی کے دوسرے صاحبزادے تھے۔

والد:

ڈاکٹر عابد معز کے والد محترم سید خواجہ قطب الدین کی پیدائش 12/مئی 1926ء کو کلوا کرتی ضلع محبوب نگر میں ہوئی۔اور انتقال ۱۲/جون ۱۹۹۳ء میں شہر حیدر آباد میں ہوا۔ابتدائی تعلیم میٹرک محبوب نگر کے تعلقوں میں ہوئی۔ انٹر میڈیٹ سٹی کالج حیدر آباد سے کیا ۔B.Sc بھی اسی کالج سے کیا ۔عثمانیہ یونیورسٹی سے M.Sc فزکس میں کیا۔ M.Sc کے بعد بحیثیت لیکچرار تقرر ہوا۔وہ زیادہ عرصہ سائنس کالج سیف آباد میں رہے۔کچھ عرصہ نظام کالج اور عثمانیہ یونیورسٹی پی جی سنٹر ورنگل میں بھی رہے۔وہ ریڈر اور صدر کی حیثیت سے سائنس کالج سیف آباد سے ۱۹۸۶ میں ریٹائر ہوئے۔سید خواجہ قطب الدین نہایت شریف اور مذہبی انسان تھے اور نہایت ہی سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے عابد معز نے اپنے والد محترم کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”والد محترم بے انتہا شریف اور مذہبی انسان تھے اصولوں کے پکے زندگی

بہت سادگی سے بسر کرتے تھے ایک مسلمان کے لیے ہوتا ہے۔ میں نے انھیں
دیکھا ہر دم دوسروں کے کام آتے تھے خود دو چار کپڑے جوڑوں میں زندگی
گزارا کیے۔ بس میں سفر کرتے تھے کبھی کار یا موٹر سیکل نہیں خریدی۔ نماز کے
پابند تھے عصر کے بعد محلّہ کی مسجد میں مختصر درس قرآن دیا کرتے تھے اپنے سبجکٹ
کے علاوہ دینی تفسیر سے دلچسپی تھی۔ چند لوگوں کا حلقہ تھا جو قرآن کی تفصیر پر غور و
فکر کیا کرتے تھے۔ گھر پر مولانا مودودی کی تفسیر اور دیگر کتابیں تھیں۔ ماہنامہ تجلّی
پابندی سے آتا تھا۔ دو مرتبہ حج کیا اور دو مرتبہ عمرہ کیا۔ انھیں ادب سے شوق نہ
تھا۔ کبھی بھی مشاعروں اور ادبی محفل میں جاتے نہیں دیکھا''۔ ۱

دوران انٹر یو پوچھے گئے سوال یعنی سائنس میں آپ کے والد سید خواجہ قطب الدین کا محبوب موضوع کیا تھا تب عابد معز نے اس طرح کہا ہے:

''نیوکلیر فزکس والد صاحب کا محبوب موضوع تھا۔ Nuclear Fission پر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ تحقیق بھی کی اس کا کیا نتیجہ نکلا اب مجھے یاد نہیں ہے''۔ ۲

جناب محمد نعیم شریف اپنے بہنوئی سید خواجہ قطب الدین کے تعلق سے اپنے ایک مضمون ''ہمارے خاندان کا فرد عابد معز'' میں یوں لکھا ہے:

''عابد معز کے والد جناب سید خواجہ قطب الدین صاحب عرصہ تک
سائنس کالج سیف آباد میں فزکس کے ریڈر اور صدر شعبۂ رہے۔ موصوف ایک
معقول شخصیت بااصول اور باکردار خوش مزاج اور محتاط انداز بیان کے مالک
تھے۔ میں نے انھیں کبھی غیر ضروری بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ عابد معز کو

۱۔ شخصی انٹرویو۔ ڈاکٹر عابد معز، بتاریخ۔ 15/ جولائی 2012ء

۲۔ شخصی انٹرویو۔ ڈاکٹر عابد معز، بتاریخ۔ 15/ جولائی 2012ء

اپنے والد کی کئی خوبیاں ورثہ میں ملی ہیں‘‘۔ ؁۱

والدہ

ڈاکٹر عابد معز کی والدہ محترمہ خیر انساء بیگم کی پیدائش ماڑا پور ضلع محبوب نگر میں ہوئی۔ان کی وفات ۲۸ فروری ۱۹۸۶؁ء میں حیدآباد میں ہوئی۔محترمہ خیر انساء بیگم اپنے بھائیوں اور بہنوں میں سب سے بڑی تھی، وہ ایک ملنسار فرض شناس نیک وخوش مزاج مہمان نواز خاتون تھیں۔جناب نعیم اللہ شریف اپنی بڑی بہن خیر انساء بیگم زوجہ سید خواجہ قطب الدین کے تعلق سے لکھتے ہیں:

’’عابد معز سے ملتا ہوں تو مجھے ان کی والدہ اور والد یاد آتے ہیں عابد معز کی والدہ خیر انساء بیگم صاحبہ ایک فرض شناس نیک وخوش مزاج اور مہمان نواز خاتون تھیں وہ ہمیشہ اپنے شوہر اور بچوں کی خدمت میں مصرف رہتی تھیں حتیٰ کہ خاندانی تقاریب اور محفلوں میں کم ہی شریک ہوئی تھیں‘‘۔ ؁۲

والدہ خیر انساء بیگم خوش حال خاندان کی ہونے کے باوجود زیادہ تعلیم حاصل نہیں کر پائیں۔لیکن انھیں قرآن شریف پڑھنا یعنی ناظرہ اور اردو پڑھنا اور لکھنا آتا تھا۔وہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم گھر میں دیا کرتی تھیں ڈاکٹر عابد معز اپنی والدہ کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

’’زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں شاید چہارم یا پنجم تک تعلیم حاصل کی اردو پڑھنا اور لکھنا جانتی تھیں۔ میں نے قرآن مجید کی ابتدائی تعلیم والدہ سے سیکھی۔ ہمارا بہت خیال رکھتی تھیں‘‘۔ ؁۳

؁۱۔نعیم اللہ شریف۔ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر۔ص :211

؁۲۔نعیم اللہ شریف۔ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر۔ص نمبر 211

؁۳۔شخصی انٹرویو۔15/جولائی۔2012ء

بھائی اور بہن:

سید خواجہ قطب الدین اور خیر انساء کو تین صاحبزادے ہوئے۔ بڑے صاحبزادے سید خواجہ معز الدین (عابد معز) سید خواجہ فیض الدین اور سید خواجہ رضی الدین۔ سید خواجہ فیض الدین کی پیدائش اکٹوبر ۱۹۵۶ء میں ہوئی ان کی ابتدائی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔ اب وہ ایک سیول انجینئر ہے۔ چند برس سرکاری نوکری کی پھر عرب ممالک چلے گئے۔ اس وقت وہ دبئ اور حیدرآباد میں سیول کنیٹرکشین (civil cansteaetoamn) کا اپنا ذاتی کاروبار کرتے ہیں۔ سید خواجہ رضی الدین کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم بھی حیدرآباد سے کیا۔ MBA کیا ہے۔ انہوں نے بھی اپنے بھائیوں کی طرح تعلیم حاصل کرنے کے بعد عرب ممالک کا رخ کیا۔ اس وقت ایک کمپنی میں سلیز مینجر کے طور پر برسر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز کی کوئی بہن نہیں ہے۔ وہ اپنے خالہ زاد اور پھوپی زاد بہنوں کو ہی اپنی خاص بہنیں سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز نے اپنے اور بھائیوں کے بچوں کے تعلق سے اس طرح کہا ہے:

> ''ہم تین بھائی ہیں۔ کوئی بہن نہیں ہے۔ والدہ کو لڑکی کی بڑی خواہش تھی لیکن اللہ کی مرضی۔ وہ دعا کرتی رہتی تھیں''۔ [۱]

سید خواجہ معز الدین (ڈاکٹر عابد معز) کی ولادت:

ڈاکٹر عابد معز کی ولادت ۲۵ جنوری ۱۹۵۵ء کو ننھیال قصبہ ماڑاپور ضلع محبوب نگر آندھرا پردیش میں ہوئی۔ ان کا خاندانی نام سید خواجہ معز الدین ہے، ادبی دنیا میں وہ عابد معز کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ایک جگہ عابد معز نے اپنی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں پچیس جنوری ۱۹۵۵ء کو حیدرآباد سے سو کیلومیٹر دور محبوب نگر میں پیدا ہوا اور چند دنوں بعد میں اپنی ماں کے ساتھ ساتھ پلنے اور پڑھنے کے لئے حیدرآباد اپنے والد کے پاس چلا آیا۔ اس لحاظ سے میں حیدرآباد

۱۔ شخصی انٹرویو۔15/جولائی۔2012ء

کواپناوطن گردانتا ہوں‘‘۔ ۱؎

جیسے ذکر آچکا ہے کہ ڈاکٹر عابد معز کا خاندانی نام سید خواجہ معزالدین ہے۔لیکن لوگ انھیں عابد معز کے نام سے زیادہ جانتے اور پہنچانتے ہیں۔نریندرلوتھر نے اپنے ایک مضمون ’’نام میں کیا رکھا ہے‘‘میں عابد معز کے دوناموں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’افلاطون نے اپنی ’مثالی جمہوریت میں شاعروں کو نہ صرف شہریت سے محروم رکھا تھا بلکہ ان کو ملک بدر کر دیا تھا اس کا قول تھا کہ شاعر غلط بیانی کرتے ہیں۔اس فتوے کے بعد کئی شاعروں نے شاعری چھوڑ دی جو اس لت سے باز نہ آسکے انھوں نے اپنا نام بدل لیا۔ نہ جانے کیوں اس فتوے سے سب سے زیادہ اردو شاعر ہی دہشت زدہ ہوئے۔تخلص رکھنے کا رواج شروع ہوا تا کہ اصلی شاعر پکڑا نہ جاسکے۔اسداللہ خان نے بھی جیل کی ہوا کھانے کے بعد ہی نام غالب رکھ لیا۔آج تک بیشتر لوگ اس کے اصلی نام سے ناواقف ہیں۔شاعروں کے نام چھپانے اور تخلص اپنانے کا جواز تو سمجھ میں آ گیا لیکن ادیبوں کو اسکی کیا ضرورت تھی۔اب دیکھئے ’’سید خواجہ معزالدین‘ جیسے دبدبے والے نام میں کیا خامی تھی کہ اسے نہ صرف مخفف کر دیا بلکہ اس میں معنویت سمو کر ’عابد معز‘ جیسا چھوٹا سا نام اپنا یا گیا۔لوگ عزت سادات کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں کہ اس سے سلسلہ امام حسین کی ذات سے جا ملتا ہے۔اور یہاں یہ صورت کہ وراثت میں ملی ہوئی خالص سادات تیاگ کر عابد بن گے۔خواجہ بھی ہر لحاظ سے نام کا ایک باعث فخر حصہ ہے۔وہ بھی ترک کر دیا۔میں سمجھتا ہوں کہ ایسا انھوں نے پکڑے جانے کے ڈر سے نہیں بلکہ منکسرالمزاجی کی وجہ سے کیا ہے‘‘۔۲؎

۱؎ ۔خاکہ بقلم خود،اپنے منہ میاں مٹھو،ماہنامہ شگوفہ عابد معز نمبر۔۲۰۰۸ء۔ص:۷۹

۲؎ ۔نریندرلوتھر’’نام میں کیا رکھا ہے‘‘ ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر۔ص نمبر ۱۳۶

عابد معز کا بچپن:

جناب محمد نعیم اللہ شریف نے ان کے بچپن کے تعلق سے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''ہمارے خاندان اور قریبی رشتہ داروں کے بچوں کی خواہش رہتی تھی کہ چھٹیاں ماڑا پور میں گزاریں سب بچے صبح سے شام تک کھیل کود اور مختلف قسم کی شرارتوں میں مصروف رہتے تھے۔ گاؤں کا ہر کنواں پہاڑ اور جھاڑ پیڑ سب ہی بچوں کی شرارت کا نشانہ بنتے تھے۔ گاؤں کے لوگ دعائیں کرتے رہتے تھے کہ چھٹیاں جلد ختم ہوں اور بچے واپس شہر چلے جائیں۔ عابد معز کی شرارتیں محتاط اور مہذب ہوتی تھیں۔ پیڑ پر چڑھنے اور پانی میں کودنے کے لیے وہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے تھے''۔[۱]

تعلیم:

عابد معز کی ابتدائی وثانوی تعلیم انگلش میڈیم سے حیدرآباد میں ہوئی۔ اپنی ابتدائی وثانوی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ:

''میری ابتدائی وثانوی تعلیم ذریعہ انگریزی سے ''مفید الانام'' ہائی اسکول اعتبار چوک حیدرآباد سے ہوئی۔ اسی اسکول سے ۱۹۷۰ء میں ایس ایس سی کا امتحان کامیاب کیا''۔ [۲]

عابد معز میٹرک کے بعد اپنا تعلیمی سفر جاری رکھتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کے لیے اس وقت کا شہریت یافتہ معارف درسگاہ انوار العلوم کالج ملے پلی حیدرآباد میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۳ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد ڈگری اور ڈگری کے بعد وہ آئی اے ایس کا امتحان دینا چاہتے تھے لیکن اپنے والد کی مرضی کے مطابق انہوں نے انٹرمیڈیٹ کے بعد میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے انٹرنس ٹسٹ میں شرکت کی اور

---

[۱] نعیم اللہ شریف، ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر، ص: نمبر ۲۱۱

[۲] شخصی انٹرویو۔ بتاریخ: 15/جولائی 2012ء

اس میں اچھا رینک ملا۔ جنکی بناء پر ۱۹۷۳ میں انھیں عثمانیہ میڈکل کالج میں داخلہ ملا۔ فیاض احمد فیضی نے ایک جگہ ان کے زمانہ طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''سید خواجہ معزالدین نے اسکول اور کالج کی تعلیم ہنستے کھیلتے گل رخوں کے آس پاس رہنے کے باوجود مکمل کرلی۔ اس وقت تک ان کی بارعب مونچھیں ان کے چہرے پر سج چکی تھیں اور وہ جب بھی اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتے انہیں محسوس ہوتا کہ ان کی شخصیت کلکٹر بننے کے لیے بے حد موزوں ہے۔ چنانچہ انہوں نے آئی اے ایس کرنے کی ٹھانی مگر قسمت اور والد محترم کو کچھ اور ہی منظور تھا اس لیے فرماں بردار معزالدین نے سر اطاعت خم کیا۔'' [1]

۱۹۷۹ء میں عثمانہ میڈیکل کالج سے MBBS پاس کیا اور ۱۹۸۵ء میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف نیوٹریشن اور عثمانیہ یورسٹی سے تغذیہ اور استحالی امراض میں پوسٹ گریجویشن ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔

ملازمت:

حصول تعلیم کے فوری بعد ۱۹۷۹ء میں حیدرآباد کے ایک محلّہ محمدی لائین میں کلینک پر کٹیس شروع کی بعد میں انہوں نے یہ کلنیک اپنے گھر کے قریب کوٹلہ عالیجاہ میں منتقل کر دیا۔ ۱۹۸۲ء میں حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے ان کا تقرر سیول انٹینٹ سرجن کی حیثیت سے ضلع محبوب نگر میں ہوا اس کے بعد ان کا تبادلہ حیدرآباد مولاعلی اوپن جیل، مشیرآباد جیل میں ہوا، پھر عدالت عالیہ (رہائی کورٹ) میں خدمات انجام دی۔ اپنے ایک انٹرویو میں ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے عابد معز نے کہا ہے کہ:

> ''سرکاری ملازمت کی ابتدء اکٹوبر ۱۹۸۲ء میں بحیثیت سیول اسٹنٹ سرجن کی۔ پہلے پرائمری ہیلتھ کیر سنٹر محبوب نگر میں تھا۔ وہاں سے شہر حیدرآباد کی اوپن ایر جیل مولاعلی میں کام کیا پھر ہا کی کورٹ آف آندھرا پردیش میں تبادلہ ہوا۔

---

[1] ۔ فیاض احمد فیضی، ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ میگزادوں میں گل کھلانے والا۔ فیاض اور فیضی۔ ص نمبر: ۱۷۰

مارچ ۱۹۸۷ء تک سرکاری ملازمت کی ہے۔‘‘

پانچ سال سرکاری ملازمت کرنے بعد ۲۷اپریل ۱۹۸۷ء کو سودی عرب روانہ ہوگئے جہاں وزارت صحت، ریاض میں ماہر طبیب تغذیہ کے عہدے پر کل ۲۳ سال تک معمور رہے۔سعودی عرب میں ملازمت کے تعلق سے اپنے ایک انٹرویو میں فرمایا ہے کہ:

’’۲۷/اپریل ۱۹۸۷ء کوسعودی عرب روانہ ہوا وزارت صحت ریاض میں ماہر طبیب تغذیہ کے عہدے پر اگسٹ ۲۰۱۰ء تک کام کیا اور استعفیٰ دے کر واپس حیدرآباد آیا‘‘۔ ۲؎

ڈاکٹر عابد معز سعودی عرب کے وزارت صحت میں تغذیہ کے ماہر nutrition specialist یعنی غذاؤں پر تحقیق کر کے حکومت کو رپورٹ بھجوانا ہوتا تھا، چنانچہ سعید نواز انڈین ڈاکٹر فورم ریاض۔سعودی عرب میں ڈاکٹر عابد معز کی ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

’’ایک اور وجہ نوکری کے معاملے میں ان کی فارغ البال بھی ہے۔مریضوں کی نبض دیکھنا انھوں نے کوئی پندرہ بیس سال پہلے چھوڑ دیا اور وہ دواخانے کے ہنگامی ماحول کو چھوڑ کر محکمہ تغذیہ کی پرسکون چھاؤں میں آگئے۔عابد معز تغذیہ کے ماہر یعنی Nutrition Specialist ڈاکٹروں کی طرح نہ دوا کے نسخے لکھتے ہیں نہ لال پیلے انجکشن لگاتے ہیں۔نہ رات کی ڈیوٹی۔نہ کوئی ایمرجنسی لاحق۔میز پر بیٹھے ڈبے کے دودھ پر تحقیق کرتے ہیں اور خون کی کمی پر غور فرماتے ہیں۔آبادی میں پائی جانے والی کیلشیم یا آیوڈین کی کمی کا سراغ لگاتے ہیں۔سروے کرتے اور رپورٹ لکھتے ہیں۔یوں سمجھئے وقت ہی وقت ہے۔چھٹیاں بھی انھیں تھوک کے حساب سے ایسی ملتی جیسی پرائمری اسکولوں ٹیچروں کو دستیاب

ا۔ انٹریو۔بتاریخ:15/جولائی۔2012ء

۲؎۔ انٹرویو بتاریخ:15/جولائی۔2012ء

ہوئی ہیں۔" [1]

ڈاکٹر عابد معز اپریل ۱۹۸۷ء سے اگست ۲۰۱۰ء تک وزارت صحت سعودی عرب میں مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دی اب وہ فیمیلیا ہاسپٹل، روڈ نمبر ۱۲ بنجارہ ہلز، حیدرآباد میں خانگی پریکٹس کررہے ہیں۔

شادی اور بیوی:

ڈاکٹر عابد معز کی شادی ۱۹۸۳ء میں فرحانہ محمدی صاحبہ سے ہوئی ان کی پیدائش، 1/ جون ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔فرحانہ محمدی کا تعلق جنوبی ہند سے ہے۔ان کی مادری زبان تیلگو ہے۔ ملیالم و تمل اور انگریزی خوب جانتی ہیں، شادی سے پہلے تھوڑی بہت ہندی سے واقفیت رکھتی تھی لیکن اردو سے بالکل ناواقف رہیں۔شادی کے بعد انھوں نے نہ صرف اردو میں بات کرنا سیکھا بلکہ اردو پڑھنا بھی سیکھا۔

ان کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم ضلع نیلور میں ہوئی تعلیم کے دوران وہ اپنے اسکول اور کالج میں اپنے وقت کی بہترین طالبات میں شمار کی جاتی تھیں۔بی ایس سی نرسنگ عثمانیہ میڈکل کالج سے کیا محترمہ فرحانہ محمدی صاحبہ پروفیشنل تعلیم سے ہونے کے باوجود بھی امور خانہ داری اور بچوں کی پروش اور تعلیم و تربیت کے لیے ملازمت نہیں کی۔نعیم اللہ شریف محترمہ فرحانہ محمدی صاحبہ کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عابد معز اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہیں کہ انھیں ایک سمجھدار، خوش مزاج اور مہمان نواز خاتون کا ساتھ ملا ہے بلکہ یہ انتخاب خود عابد معز کا ہے۔اس معاملہ میں عابد معز نے خاندان والوں کو تکلیف نہیں دی عابد معز کی اہلیہ فرحانہ محمدی محنتی خاتون ہیں۔ بچوں کی پیشہ وارانہ تعلیم کے حصول میں ان کی شبانہ روز محنت کا بڑا دخل ہے۔ عابد معز کم و بیش پچھلے دس برسوں سے خاندان سے دور ریاض میں رہتے ہیں اور ہر چار چھ مہینوں میں چھٹی پر گھر آتے ہیں۔ عابد معز کی اہلیہ کی نگرانی میں دو بڑی لڑکیاں ڈاکٹر بن کر اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔تیسری لڑکی بھی

---

[1] ۔ڈاکٹر سعید نواز انڈین ڈاکٹر فورم۔ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر۔ص:199

ایم بی بی ایس کررہی ہے یقین ہے کہ چھوٹا لڑکا سید خواجہ تقی الدین اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا''۔ ۱؎

اولاد:

عابد معز اور فرحانہ محمدی کی کل چار اولاد ہیں۔ جن میں تین لڑکیاں سیدہ خیر انساء ناز جبین کی پیدائش ۲۵ اپریل ۱۹۸۴ء کو حیدرآباد میں ہوئی۔ سیدہ مہ جبین جن کی ولادت ۱۸ اکٹوبر ۱۹۸۵ء کو حیدرآباد میں ہوئی تیسری لڑکی سیدہ مہ طلعت ہے۔ سیدہ مہ طلعت کی پیدائش ۶ جنوری ۱۹۸۸ء میں سعودی عرب میں ہوئی۔ تین لڑکیوں کے بعد عابد معز کو ایک لڑکا ہوا جن کا نام سید خواجہ تقی الدین ہے، سید خواجہ تقی الدین کی ولادت ۱۳ اکٹوبر ۱۹۹۲ء کو ریاض سعودی عرب میں ہوئی۔ ڈاکٹر عابد معز کی تینوں بیٹیاں اس وقت MBBS ڈاکٹر ہیں اور لڑکا بی ای کمپیوٹر سائنس کر رہا ہے۔

ادبی سفر کا آغاز:

ڈاکٹر عابد معز نے طالب علمی کے زمانے سے لکھنا شرع کیا، تب وہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو انکا پہلا مضمون 'لائبریری میں چند گھنٹے'' جونو جوانوں کا صفحہ روزنامہ ''رہنماء دکن'' میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اردو کے نامور مزاح نگار مسیح انجم نے ان کا تعارف شگوفہ کے مدیر سے کروایا۔ باقاعدگی سے چھپنے کا آغاز ماہنامہ شگوفہ سے ہوا۔ شگوفہ میں ان کا پہلا مضمون 'پیسہ' کے عنوان سے مارچ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ ماہنامہ شگوفہ میں ''میرا شہر لوگاں سو معمور کر' کے عنوان کے تحت حیدرآباد پر موضوعاتی مضامین کا سلسلہ جون ۱۹۸۳ء سے مارچ ۱۹۸۷ء تک چلتا رہا عابد معز نے ایک جگہ اپنے ادبی سفر کے آغاز کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''لکھنا دسویں جماعت یعنی ۱۹۷۰ء سے شروع کیا لیکن چھپانے کا مہورت سات سال بعد نکلا۔ ۱۹۷۷ء میں حیدرآباد کے ایک مقامی روزنامہ رہنمائے دکن میں دو مضامین چھپے۔ اتنی مسرت ہوئی کہ چار سال تک خوش ہوتا رہا اور اسی

۱؎۔ نعیم اللہ شریف۔ ماہنامہ شگوفہ، عابد معز نمبر۔ ص:۲۱۱

خوشی میں میں نے ایم بی بی ایس کی ڈگری بھی حاصل کرلی۔ باقاعدگی سے لکھنے اور شائع ہونے کا سلسلہ مارچ ۱۹۸۱ء میں ماہنامہ شگوفہ سے شروع ہوا۔ نامور مزاح نگار جناب مسیح انجم نے شگوفہ اور مدیر شگوفہ سے میرا تعارف کروایا تھا۔تب سے ہند و پاک اور سعودی عرب کے مختلف رسائل اخبارات اور جریدوں میں شائع اور ڈاجسٹ ہوتا آرہا ہوں‘‘۔ ۱؎

۱۹۸۷ء میں عابد معز ملازمت کے سلسلے میں سعودی عرب روانہ ہوئے جہاں انہوں نے ۲۳ سال گذارے۔سعودی عرب میں بھی ملازمت کے ساتھ ادب تخلیق کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔سعودی عرب میں قیام کے بعد قیام نامہ عنوان کے تحت روز نامہ اردو نیوز جدہ میں تاثراتی مضامین لکھتے رہے۔اس کے علاوہ ہفتہ روزہ اردو میگزین جدہ میں ’فکاہیہ‘ کے عنوان سے لکھا۔ اگسٹ ۱۹۹۹ء سے فروری ۲۰۰۳ء تک کالم شائع ہوتے رہے۔روز نامہ اعتماد حیدرآباد کے ادبی ایڈیشن اوراق ادب میں ہر دوشنبہ کالم ’پھر چھڑی بات‘ کے عنوان سے شائع ہوتے رہے جس کا سلسلہ مارچ ۲۰۰۶ء سے اگسٹ ۲۰۰۸ء تک چلتا رہا۔عابد معز کا ایک اور کالم ’بات سے بات‘ کے عنوان سے ہفت روزہ اردو میگزین جدہ سے ۲۵ مئی ۲۰۰۷ سے ۱۳ اکٹوبر ۲۰۰۹ء تک چلتا رہا۔

عابد معز ادیب، مضمون نگار، کالم نگار، انشائیہ نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ان کی تخلیقات ہند پاک کے علاوہ سعودی عرب کے مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔جیسے ماہنامہ شگوفہ، روابطہ ،آج کل، افکار، چہارسو، اردو ڈائجسٹ، اردو پنچ، اردو نیوز، اردو میگزین وغیرہ۔بحثیت ادیب عابد معز کی اب تک چھ کتابیں شائع ہوئی ہیں ایک کتاب زیر اشاعت ہے۔ان کتابوں کی تفصیل اس طرح ہے:

(۱)۔ واہ حیدرآباد۔ مضامین کا مجموعہ، جنوری ۱۹۹۶ء

(۲)۔ سگ گزیدہ۔مضامین کا مجموعہ، جنوری ۱۹۹۵ء

(۳)۔ عرض کیا ہے۔شگفتہ افسانے۔اگست ۲۰۱۱ء

۱؎ ۔خاکہ تعلیم خود۔ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر ص نمبر ۸۱

(۴)۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت، شگفتہ افسانے، جنوری ۲۰۱۲ء

(۵)۔ بات سے بات۔ کالم، جون ۲۰۱۲ء

(۶)۔ فارغ البال۔ انشائیے، مئی ۲۰۱۳ء (۷) اردو ہے جس کا نام (زیر طبع)

(۱)۔واہ حیدرآباد

بحیثیت ادیب عابد معز کی پہلی تصنیف ہے۔جس میں کل ۳۳ مضامین شامل ہیں۔یہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کی اشاعت جنوری ۱۹۹۶ء کو زندہ دلان حیدرآباد سے ہوئی۔اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جتنے مضامین شامل ہیں ان تمام موضوعات کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔

(۲)۔سگ گزیدہ:

سگ گزیدہ عابد معز کے شگفتہ مضامین کا مجموعہ ہے۔اس میں کل ۱۸ مضامین شامل ہیں یہ کتاب ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اس کی اشاعت جنوری ۱۹۹۵ء میں زندہ دلان حیدرآباد سے ہوئی۔

(۳)۔عرض کیا ہے

’عرض کیا ہے‘ عابد معز کے شگفتہ افسانوں کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔جس میں کل ۱۹ شگفتہ افسانے شامل ہیں۔یہ مجموعہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کی اشاعت اگسٹ ۲۰۱۱ء کو ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس حیدرآباد سے ہوئی۔ان افسانوں میں عابد معز نے سماج کے حساس مسائل کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔طنزومزاح کی چاشنی سے تحریر کو اس قدر لطف انگیز بنا دیا ہے کہ کسی بھی افسانے کا مطالعہ شروع کرنے کے بعد قاری پڑھ کر ہی دم لیتا ہے۔

(۴)۔یہ نہ تھی ہماری قسمت:

یہ عابد معز کے شگفتہ افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔اس میں کل ۱۸ افسانے شامل ہیں۔یہ مجموعہ

۱۷۶صفحات پر مشتمل ہے۔اسکی اشاعت جنوری ۲۰۱۲ء میں ھدیٰ بک ڈسٹر بیوٹرس حیدرآباد کی جانب سے عمل میں آئی۔عابد معز نے ان افسانوں میں ہماری زندگی کے روزمرہ مسائل کومزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اورطنز کے نشتر کے ذریعہ ان مسائل کو حل کرنے کی سعی کی ہے۔

(۵)۔بات سے بات

''بات سے بات'' عابد معز کے کالموں کا مجموعہ ہے۔ یہ کام ہفتہ روزہ اردو میگزین میں شائع ہوا۔ اس انتخاب میں جملہ ۵۸ کالمس ہیں۔جنہیں ۷ مختلف عنوانات مین تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۲۷۶صفحات پر مشتمل ہے۔اس کی اشاعت جون ۲۰۱۲ء کو ھدیٰ بک ڈسٹر بیوٹرس حیدرآباد سے ہوئی۔

(۶)۔فارغ البال

فارغ البال عابد معز کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں جملہ ۲۳،انشایئے ہیں۔ جو۱۶۴،صفحات پر مشتمل ہے۔اس کی اشاعت مئی ۲۰۱۳ء کو ھدیٰ بک ڈسٹ بیوٹرس حیدرآباد کی جانب سے عمل میں آئی ۔ یہ انشایئے مقبول عام قسم کے انشائیوں سے بہت مختلف ہیں۔موضوعات کے انوکھے اور اچھوتے انتخاب اوران کے غیر روایتی طرز بیان کی وجہ سے ان انشائیوں میں ایک نئی تازگی اور وسعت کا احساس ملتا ہے۔

ادبی تخلیقات کے علاوہ ڈاکٹر عابد معز نے ''صحت ،طب اورتغذیہ، کے موضوعات پر اردو زبان میں بے شمار مضامین اور کالم لکھے ہیں۔ جو مختلف اخبارات اور رسائل جیسے سائنس کی دنیا،کتاب نما، اردو نیوز، سیاست،منصف،اعتماد وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔روزنامہ منصف میں 'صحت وطب' کے عنوان سے ایک کالم ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۷ء تک لکھتے رہے۔اس کے علاوہ 'غذائیات'' کے عنوان سے روزنامہ 'اعتماد' میں ہر بدھ کے دن تغذیہ کے موضوع پر مختصر معلومات ۵/دسمبر ۲۰۱۲ء سے لکھ رہے ہیں۔اوراسی روزنامہ میں 'شکر ریزے' کے عنوان سے مرض ذیابیطس کے متعلق اختصار سے ہر اتوار کولکھ رہے ہیں۔ یہ سلسلہ ۲۰۱۲ء سے

جاری ہے۔عابد معز نے اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی صحت وتغذیہ کے موضوعات پر چند مضامین بھی لکھے ہیں۔

صحت،طب وتغذیہ کے موضوعات پر عابد معز کی اردو زبان میں اب تک چھ(۶) کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

ا۔ذیابیطس کے ساتھ ساتھ۔

صحت،طب وتغذیہ کے موضوع پر عابد معز کی یہ پہلی تصنیف ہے۔اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن مئی ۲۰۰۹ دوسرا ایڈیشن جنوری ۲۰۱۱ء اور تیسرا ایڈیشن مارچ ۲۰۱۲ء تیسرا ایڈیشن ۴۱۶صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں ڈاکٹر عابد معز نے ذیابیطس کی شرح،اسباب،وجوہات،تدراک کی تدابیراور زیابیطس کوقابو میں رکھنے کے طریقوں پرآسان اور جامعہ انداز میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔چند مضمون کوواضح کرنے کے لیے خاکوں،اشکال اور جدولوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۲۔ چکنائی اور ہماری صحت۔

صحت،طب وتغذیہ کے موضوع پر عابد معز کی یہ دوسری کتاب ہے۔اس کے اب تک دو ایڈیشن منظر عام پر آئے ہیں۔ پہلا ایڈیشن جنوری ۲۰۱۱ء اور دوسرا ایڈیشن مئی ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا یہ کتاب کل ۱۶۸صفحات پر مشتمل ہے۔عابد معز اس کتاب میں چکنائی اوراس کے متعلقات جیسے چکنائی کیا ہے، چکنائی اور مختلف روغنی ترشے، چکنائی کے اقسام،اچھی اور بری چکنائیاں، چکنائی کی ضرورت وغیرہ پر اچھے انداز میں گفتگو کی ہے۔

۳۔کولیسٹرال کم کیجئے۔

صحت اور تغذیہ کے موضوع پر ڈاکٹر عابد معز کی یہ تیسری کتاب ہے۔ جو جون ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔یہ کتاب کل ۲۵۲صفحات پر مشتمل ہے۔اس تصنیف میں ڈاکٹر عابد معز کولیسٹرال کے بارے میں تقریباً

ہر ضروری تفصیل کو عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ کولیسٹرال کم کرنے کے تدابیر پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی جگہ جگہ اشکال، جدول اور خاکوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

۴۔رمضان اور ہماری صحت:

صحت کے موضوع پر عابد معز کی یہ ایک اہم کتاب ہے۔یہ کتاب انگریزی اور اردو زبان میں شائع ہوئی ہے۔اردو زبان میں اس کتاب کی اشاعت جون ۲۰۱۲ء میں عمل میں آئی۔جو کل ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔اس طرح انگریزی زبان میں یہ کتاب جولائی ۲۰۱۲ء میں منظر عام پر آئی جو کل ۷۴ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب کی اہم خوبی ہے کہ صحت اور مختلف امراض میں روزے رکھنے کے متعلق رہنمائی فراہم کی ہے۔

۵۔ حج وعمرہ اور ہماری صحت۔

عابد معز کی یہ کتاب ستمبر ۲۰۱۲ء کو شائع ہوئی جو ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب میں ڈاکٹر عابد معز سفر حج وعمرہ کے دوران صحت کو درپیش اہم مسائل سے بچنے کی تدابیر اور دیگر کارآمد مشوروں پر بحث کی ہے۔یہ کتاب ''حج اور ہماری صحت'' حاجیوں کے لیے بہترین طبی گائیڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۶۔فاسٹ فوڈ اور سافٹ ڈرنکس:

فاسٹ فوڈ اور سافٹ ڈرنک بھی صحت اور تغذیہ کے موضوع پر عابد معز کی ایک اہم کتاب ہے۔اس کتاب کی اشاعت مئی ۲۰۱۳ء کو ہوئی۔جو ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔عابد معز نے اس کتاب میں فاسٹ فوڈ اور سافٹ ڈرنکس کے مضر اثرات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر عابد معز کی مذکورہ صحت، طب وتغذیہ کے موضوعات پر لکھی گئی تمام تصانیف ھدیٰ پبلی کیشنز حیدرآباد سے شائع ہوئی ہیں۔

۷۔صحافت سے وابستگی:

عابد معز مختلف اوقات میں مختلف اخبارات ورسائل سے وابستہ رہے ہیں جیسے اردو زبان کے منفرد طنزیہ ومزاحیہ رسالے ماہنامہ شگوفہ کے جنوری ۱۹۹۲ء سے اگست ۲۰۱۰ء تک ایڈیٹر اردو سینئر کی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر ستمبر ۲۰۱۰ء اگست ۲۰۱۱ء تک ماہنامہ شگوفہ کے معاون مدیر کے بھی فرائض انجام دیئے۔ سعودی عرب کی وزارت صحت کے ادارہ التغذ والصحت کے مجلّہ التغذیہ والصحت کے انگریزی حصہ کے مدیر رہے۔ اس کے علاوہ دہلی سے شائع ہونے والے اردو ماہنامہ ''سائنس'' کی مجلس مشاروت کے رکن بھی رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے تین مضامین دہلی سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ماہنامہ 'کتاب نما'' میں مہمان اداریہ کی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ماہنامہ کتاب نما میں ان کا پہلا مہمان اداریہ ''اردو زبان میں سائنسی اور طبعی علوم کی پیش کش' کے عنوان سے اکٹوبر ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا اور دوسرا مہمان اداریہ اکٹوبر ۲۰۰۳ء کے شمارے میں ''اردو زبان کی تعلیم لازمی قرار دی جائے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ تیسرا مہمان اداریہ اکیسویں صدی: مزاح اور طنز کی صدی ہے' کے عنوان سے مارچ ۲۰۰۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ بحیثیت کالم نویس، روزنامہ اردو نیوز جدہ' ہفتہ روزہ اردو میگزین جدہ اور روزنامہ اعتماد، حیدرآباد سے وابستہ رہے ہیں۔

۸۔ مختلف علمی وادبی اداروں سے وابستگی:

عابد معز مختلف علمی وادبی انجمنوں سے وابستہ رہے ہیں۔ ۱۹۸۳ء سے زندہ دلان حیدرآباد کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے وابستہ ہوئے۔ بعدازاں زندہ دلان حیدرآباد کے شریک معتمد اور معتمد عمومی کے فرائض بھی انجام دئے۔ سعودی عرب پہنچنے کے بعد ریاض میں اردو کی ترقی وترویج کے لیے ۱۹۹۶ء میں'' ہندوستانی بزم اردو'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ اس انجمن کے بانی ممبر کے علاوہ ۲۰۱۰ء تک اس کے نائب صدر بھی رہے ہیں۔ ایک جگہ میر فراست علی خسرو''ہندوستانی بزم اردو'' اور عابد معز کی گراں خدمت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

’’بزم احباب دکن ویران ہوئی تو وہ سمٹ کر بزم کے رکن قاری صدیق حسین کی خواب گاہ میں تکیہ لگا کر سوگئی۔ بزم احباب دکن پر فاتحہ پڑھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے بہت قریبی رفقاء کے ہاتھ ایک اور نئی انجمن کی شمع روشن کی۔ نام رکھا۔ ہندوستانی بزم اردو‘ یہ دراصل ان سجادگان اردو کا ہندوستانی جواب تھا۔ جو ادب میں بھی سرحدوں کی تقسیم کے قائل تھے اور ہندوستانی کا نام سنتے ہی ان کی حمیت وطن پھڑک کر ان کے منہ میں آجاتی۔ بارہا یہ اس تعصب لسانی سے ڈسے گئے اور پھر یہ طے کیا کہ تم ادھر تو ہم ادھر۔ اس کے باوجود بھی اہل پاکستان ڈاکٹر صاحب کی محافل میں شریک ہوتے ہیں اور کبھی دکنی نمک کے ذائقہ کے طور پر یہ بھی ان کی محافل کو عزت بخشتے ہیں۔ پچھلے تقریباً بارہ سال سے یہ اردو کا خومہ گر اپنے دامن کو اردو کی خوش بو میں بسائے وہ کام کررہا ہے جو ہم سب کے کرنے کا ہے مگر توجہ کم ہی ہوتی ہے۔ ریاض کے ہندوستانی اسکولس میں پرائمری سے جونیئر کالج کی سطح پر تقریری، تحریری اور نظم خوانی کے مقابلے اور جیتنے والوں کو بزم کی جانب سے ٹرافی، تمغے اور اسناد کی تقسیم پچھلے سال کی محفل میں بطور مہمان خصوصی شریک ہونے کا اعزاز مجھے بھی ملا۔ بچوں کی تقریری اور تحریری صلاحیتوں کو ان کی اپنی مادری زبان میں ابھارنے اور ان کو اردو زبان، ثقافت سے جوڑنے کا جو کام ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقا کررہے ہیں، یہی وہ کام ہے جس کے نتائج کل ہمیں قاریان اردو، حامیان اردو اور ادبیان اردو کی شکل میں ملیں گے‘‘۔ [۱]

ڈاکٹر عابد معز سعودی عرب میں ہندوستانی سفارت خانے کی جانب سے انڈین اسکولس، سعودی عرب کے ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۶ء تک بورڈ کے ممبر بھی رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سعودی عرب ریاض برسر خدمت گزار ہندوستانی ڈاکٹرز کی انجمن ’انڈین ڈاکٹر فورم کے جون ۲۰۰۶ء سے جون ۲۰۱۰ تک اس انجمن

۱۔ میر فراست علی خسرو۔ مزاح سے مسیحائی۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص ۲۰۹

کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دی ہے۔

عابد معز کی ادبی خدمات ماہنامہ شگوفہ کے حوالے سے: معاصرین کی آراء

ماہنامہ شگوفہ زندہ دلان حیدرآباد اردو زبان کا منفرد طنز و مزاح کا رسالہ ہے۔ جو پچھلے ۴۶ سال سے پابندی کے ساتھ اور مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

عابد معز نے اس رسالے کو بیرونی ہند میں توسیع اشاعت کے لئے بے مثال کام انجام دیا جس کی بنیاد پر مدیر شگوفہ نے اردو رسالوں کی تاریخ میں ایڈیٹر اوورسیز کے نام سے ایک نئے عہدے کی تخلیق کی۔ عابد معز کو جنوری ۱۹۹۲ء بحیثیت ایڈیٹر اوورسیز کے عہدہ پر فائز کیا۔ اس حیثیت سے عابد معز نے بڑے ادبی کارنامے انجام دیے اور شگوفہ ہندوستان کے باہر اور خاص طور پر سعودی عرب کے دور دراز علاقوں تک پہنچایا۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر عابد معز کا ایک تعارف زندہ دلان حیدرآباد اور ماہنامہ شگوفہ کے نمائندہ کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔

اکٹوبر ۱۹۹۲ء میں عابد معز شگوفہ کا سعودی عرب نمبر نکالنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس نمبر میں سعودی عرب میں موجود ادیبوں اور شاعروں کی طنزیہ اور مزاحیہ تخلیقات کو شامل کیا۔ ان کے ساتھ محمد شجاع الدین غوری، غوث ارسلان اور محمد اکرم نے تعاون دراز کیا۔ شگوفہ کی اشاعت کے ۲۵ سال مکمل ہونے پر ۲۵ سالہ نثری و شعری انتخاب شائع کروانے میں عابد معز کا اہم رول رہا ہے۔ اسی طرح انہوں نے ۲۰۰۴ء میں شگوفہ کا خلیج نمبر جشن شگفتہ دکن کے موقع پر شائع کیا۔

ڈاکٹر عابد معز نے شگوفہ کی توسیع اشاعت کی غرض سے سعودی عرب اور اردو کی نئی بستیوں میں متعارف کرنے کے لیے اپنا قیمتی وقت ملازمت سے زیادہ شگوفہ کو دیا۔ صرف ان ہی کی کوششوں کی بدولت شگوفہ کو معاشی استحکام حاصل ہوا۔ آج اردو کے کئی ماہنامے معاشی کمزوری کی وجہ سے دم توڑ چکے ہیں۔ عابد معز واحد شخص ہیں جنہوں نے سعودی عرب میں اردو کو خوب مستحکم کیا اسے معاشی استحکام بھی دلایا۔ غرض ڈاکٹر

عابد معز کی شگوفہ سے بے پنا محبت کو دیکتے ہوئے فیاض اور فیضی بمبئی نے یہ لکھا ہے کہ:

''عابد معز کی جلا وطنی کا دوسرا بڑا فائدہ سعودی عرب اور اردو ادب دونوں کو بیک وقت یہ ہوا کہ اب سعودی عرب کے ریگزاروں میں سے تیل کے ساتھ ہنسی کے فوارے بھی چھوٹنے لگے انہوں نے طنز و مزاح کو حیدرآباد سے اسمگل کر کے ریاض اور جدہ میں گھر گھر مفت تقسیم کرنے کا انتظام کیا اور وہاں کے لوگوں نے مسکرانے کا ہنر سیکھ لیا۔ عابد معز کی غیر حاضری کا ہندوستان کو یہ فائدہ ہوا کہ ماہ نامہ شگوفہ کے منہ پر رونق آ گئی۔ اس کا کاغذ جاذب نظر اور دبیز ہو گیا، طباعت روشن ہونے لگی یہاں تک کہ کبھی کبھی مضامین کے معیار پر بھی خوشگوار اثرات پڑنے لگے''۔ ؎۱

؎۱ ۔فیاض احمد فیضی بمبئی، شگوفہ نمبر ص نمبر ۱۷۰

میر فراست علی خسرو، شگوفہ اور عابد معز کے تعلق سے اس طرح فرماتے ہیں:

''زندہ دلان کے ترجمان شگوفہ کو اردو کی نئی بستیوں اور خلیج میں خصوصاً سعودی عرب میں متعارف کروانے کا سہرا کسی ایک شخص کو جاتا ہے تو وہ یہی مہاشے ہیں۔ ان دنوں جب اس کی خریداری اور خریدار بنانے کی مہم زوروں پر تھی تو ایک نوجوان نانا ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ آ گئے ۔ جناب شجاع الدین غوری صبح شام ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہم پیالہ، ہم قدم ہم رکاب تھکن اور بیزارگی سے دور بلکہ سر پر ٹوپی اوڑھ کر بطور مذہبی فریضہ کے فروغ اردو اور توسیع اشاعت شگوفہ انجام دیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شگوفہ کو زندگی کا تیل ملا اور وطن سے باہر کسی ایک شہر میں شگوفہ کے سب سے زیادہ خریدار اگر تھے تو وہ شہر ریاض تھا''۔؎۱

ڈاکٹر لئیق صلاح سابقہ صدر شعبۂ اردو جامعہ گلبرگہ فرماتی ہیں کہ عابد معز کے خواب وخیال میں صرف شگوفہ ہی رہتا ہے۔ گویا شگوفہ ان کے ویور پر مسلط ہو گیا ہے۔ وہ اپنے مضمون ''شگوفہ کا سند باز'' میں

؎۱ ۔میر فراست علی خسرو۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص نمبر ۱۰۹

لکھتی ہیں:

''وہ اپنے تو سعودی عرب میں ہیں مگر ایسا لگتا ہے کہ ان کے خوب وخیال میں صرف شگوفہ ہی بسا رہتا ہے۔شگوفہ سے دوری ان کے لئے سوہان روح بن جاتی ہے۔ پیشے سے وہ اپنے آپ کو طبیب ثابت کرنے کا لاکھ لاکھ دعویٰ کریں لیکن ثبوت اس پیشے کا کم اور شگوفہ سے وابستگی کا زیادہ ملتا ہے۔چھٹیاں گزارنے سال یا چھ ماہ بعد جب وطن لوٹتے ہیں تو شگوفہ ان کے وجود پر مسلط ہوجاتا ہے''۔ ۱؎

شجاع الدین غوری کراچی پاکستان فرماتے ہیں عابد معز کسی ادبی محفل میں اپنا مضمون سنانے سے پہلے شگوفہ کا تعارف کرواتے ہیں وہ اپنے مضمون ''عابد معز شگوفہ اور میں'' میں اس طرح لکھا ہے:

''عابد معز نے ۱۹۹۱ء میں ماہنامہ شگوفہ کو سعودی عرب میں متعارف کروانے کی مہم شروع کی۔اس مہم میں انھوں نے مجھے شریک کرلیا۔شام شگوفہ کے عنوان سے ریاض، جدہ اور الخبر میں کامیاب تقاریب کا اہتمام کیا جس میں طنز مزاح سیکھنے والوں کو مدعو کیا گیا۔ادبی انجمنوں سے بھی تعاون حاصل کیا گیا۔مشاعرہ یا ادبی محفل میں عابد معز اپنا مضمون سنانے سے پہلے شگوفہ کا تعارف ضرور کرواتے ہیں اور شگوفہ کے تعارف کے بغیر وہ اپنے مضمون کو ادھورا تصور کرتے ہیں''۔ ۲؎

محترمہ عذرا نقوی فرماتی ہیں کہ عابد معز دوسرے لوگوں میں اس لیے ممتاز ہیں کہ وہ اپنے کارشوق میں بہت focussed رہے۔انھیں مزاح نگاری کے علاوہ کوئی صنف سے لگاؤ نہیں ہے خصوصاً شاعری سے لیکن شگوفہ کی خاطر انھوں نے مشاعروں کا انعقاد شروع کیا وہ لکھتی ہیں:

''عابد معز صاحب کو جو بات ریاض کے دوسرے قلم کاروں سے ممتاز کرتی

۱؎ ۔ڈاکٹر لئیق صلاح۔ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر۔ص نمبر ۱۷۲

۲؎ ۔شجاع الدین غوری کراچی پاکستان۔عابد معز شگوفہ اور میں۔ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر۔ص:۱۷۶

ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے کارشوق میں بہت focussed رہے وہ اپنی پہچان بطور مزاح نگار بنانا چاہتے تھے سو یہ کیا۔ ادھر ادھر بھٹکے نہیں۔ یہ نہیں کہ لوگوں کی طرح افسانہ نگاری، صحافت اور شاعری ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ ویسے شاعری عابد معز کرتے ہی کیوں! ان کے فکاہیہ مضامین میں شاعروں کے بارے میں کچھ کلمات خیر نہیں لیکن شگوفہ کے لیے مزاحیہ مشاعرہ انھیں کروانا ہی پڑا''۔ ۱؎

عابد معز عرب ممالک اور خاص طور پر سعودی عرب میں طنز ومزاح کے فروغ کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ جشن شگفتہ دکن کے موقع پر شگوفہ کا یہ منفرد خلیج نمبر شائع ہوا اس کے اصل محرک اور سارے مراحل کے ذمہ دار و نگہباں ڈاکٹر عابد معز ہیں۔ ایڈیٹر ماہنامہ شگوفہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال۔ شگوفہ خلیج نمبر میں اس طرح لکھا ہے:

''ہندوستانی بزم اردو کے زیر اہتمام سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں ۹، ۱۰، اور ۱۱ جون ۲۰۰۴ء کو منعقد ہونے والے سہ روزہ جشن شگفتہ دکن کے موقع پر شگوفہ کا یہ منفرد خلیج نمبر شائع ہو رہا ہے۔ اس سے قبل ۱۹۹۲ء میں شگوفہ کا ایک خصوصی سعودی عرب نمبر شائع ہو چکا ہے۔ عرب ملکوں میں جاری اردو والوں کے تخلیقی کاموں پر محیط ان دونوں خصوصی شماروں کے اصل محرک اور سارے مراحل کے ذمہ دار و نگہبان، شگوفہ کے ایڈیٹر و سینئر ڈاکٹر عابد معز ہیں''۔ ۲؎

ڈاکٹر عابد معز شگوفہ کی ترقی و ترویج میں سعودی عرب کے بڑے بڑے شہروں میں شاندار پیمانے پر جلسوں کا انعقاد کرایا۔ شعرا و شعری محفلیں برپا کرائیں نئے نئے ادیبوں اور شاعروں کو مواقع فراہم

۱؎ محترمہ اسریٰ نقوی۔ ماہنامہ شگوفہ عابد معز نمبر۔ ص نمبر ۱۹۳ اور ۱۹۲

۲؎ مصطفیٰ کمال۔ شگوفہ خلیج نمبر جون ۲۰۰۴ء ص نمبر ۲۲۱

کروائے۔شگوفہ کے لیے مناسب مالیہ فراہم کیا۔ یہ تمام کام ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ عابد معز نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کا لوہا منوایا خاص طور سے ۲۰۰۰ء میں ریاض میں جس عظیم الشان پیمانے پر جلسوں کا انعقاد ہوا۔جس میں بڑی تعداد میں مشاعرے اور ادبی اجلاس میں لوگ دور دراز سے شریک ہوئے، اس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ جلسے شگوفہ کے نام پر صرف ڈاکٹر عابد معز کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ان جلسوں کا معیار اور ان کی سطح نہایت بلند و بے مثال ہے کیونکہ سعودی عرب کے پابند ماحول میں ایسی سرگرمیاں جاری رکھنا وہاں پر ناممکن تھا، لیکن عابد معز اپنے حسن سلوک اور اثر رسوخ سے یہ ممکن کر دکھایا۔

ڈاکٹر عابد معز ایک محبّ اردو۔معاصرین کی آراء:

ڈاکٹر عابد معز نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی اور پلے بڑھے جہاں ادبی ماحول نہ تھا گو علمی ضرور تھا۔ دادیال و ننھیال اور رشتہ داریوں میں بھی کوئی اپنے وقت کا مشہور ادیب یا شاعر نہیں گذرا۔ان کی ابتدائی تعلیم انگریزی میں ہوئی۔ مادری زبان اردو ثانوی زبان کی حیثیت سے سیکھی اس کے باوجود آج وہ اردو زبان کے اسیر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اس تعلق سے انہوں نے کہا ہے کہ:

> ''شروع سے آخر تک میری تعلیم انگلش میڈیم میں ہوئی۔اردو صرف ایک مضمون کی حیثیت سے وہ بھی ۷۰ فیصدی اردو اور ۳۰ فیصد ہندی جیسے composite urdu کہا جاتا ہے۔ دسویں جماعت تک پڑھی انٹر میں اردو کے بجائے عربی رہی۔اس کے باوجود مجھے خود حیرت ہوئی ہے کہ میں کیسے اردو زبان کا اسیر ہوا اور کس طرح پڑھنے اور لکھنے کی طرف مائل ہوا''۔ [1]

جب وہ ہائی اسکول میں پڑھ رہے تھے حیدر آباد میں علیحدہ تلنگانہ تحریک کا بڑے زور وشور سے آغاز ہوا۔ یہ تحریک ایک سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی اس تحریک کے زیر اثر علاقہ تلنگانہ کے تمام طلباء نے تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا۔تمام مدارس و کالجس وغیرہ بند ہوگے۔تعلیمی سرگرمیاں ٹھپ ہوگئیں۔اس اثناء

---

[1] ۔شخصی انٹر یو۔بتاریخ۔۲۰۱۱۔۸۔۵

میں ان کا یک سال ضائع ہوا ان حالات میں ڈاکٹر عابد معز نے معروضیات کا ایک نیا میدان تلاش کیا انہوں نے اردو ادب کا مطالعہ شروع کیا۔

اس ایک سال کے دوران انہوں نے بے شمار کتابیں پڑھ لی۔اس مطالعہ کے طفیل وہ مزاح نگاری کی طرف راغب ہوئے نہ صرف ان کی معلومات میں اضافہ ہوا بلکہ زبان و بیان پر بھی عبور حاصل ہوتا گیا۔ خصوصاً طنز و مزاح نگاری کے لیے انہیں کافی مدد حاصل ہوئی دسویں جاعت سے ہی لکھنے کی ابتدا افسانہ نگاری سے شروع کی۔لیکن اشاعت کی ابتداء سات سال بعد ''مسیح انجم'' کے توسط سے ۱۹۷۷ء روز نامہ رہنمائے دکن میں ''شیطانی چکر اور لائبریری کی سیر'' کے عنوان سے ہوئی۔

چنانچہ فیاض احمد فیضی عابد معز کے لکھنے کی ابتداء اور طنز و مزاح کی جانب راغب ہونے کا اصلی سبب مزاحیہ انداز میں یوں بیان کیا ہے:

> ''۱۹۸۱ء سے انہوں نے با قاعدگی کے ساتھ لکھنا اور چھاپنا شروع کر دیا۔ مسیح انجم مرحوم نے انہیں مزید گمراہ کیا اور ان کی انگلیاں پکڑ کر بیچلرز کوارٹرز کی ۹۵ سیڑھیاں چڑھنا سکھا دیا۔ مصطفیٰ کمال، مدیر شگوفہ نے بھی موقع کو غنیمت جانا اور ان کو طنز و مزاح کے ایسے سبز باغ دکھائے کہ ڈاکٹر سید خواجہ معز الدین، عابد معز بن کر وہیں کے ہو رہے۔''[۱]

ڈاکٹر عابد معز ایک محبّ اردو۔۔۔۔دوستوں اور معاصرین کی آراء

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق انہیں اردو زبان سے عشق کی حد تک محبت ہے۔ان افراد پر انہیں بہت غصہ آتا ہے جن کی مادری زبان اردو ہونے کے باوجود سینہ تان کر فخر یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اردو نہیں آتی۔

عابد معز اردو زبان و ادب کے ایک سچے عاشق ہیں۔اس کی بقاء اور ترقی و ترویج میں ہمہ تن گوش لگے ہوئے ہیں۔غرض ان کے عاشقان اردو حامیان اردو، محبان اردو ہونے کا ثبوت چند قلم کاروں کے

۱۔ فیاض احمد فیضی بمبئی۔ریگ زاروں میں گل کھلانے والا۔ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر ص169

اقتباسات سے ملاحظہ کیجئے۔

عطیہ فاطمہ ایم فل (عثمانیہ) ریاض سعودی عرب لکھتی ہے:

''ڈاکٹر عابد معز کو سارا شہر جانتا ہے۔ وہ نہ صرف ہندوستانیوں اور پاکستانیوں بلکہ افریقی باشندوں میں مقبول ہیں۔ اردو لکھتے ہیں اور اردو کی فکر میں دن رات گھلتے رہتے ہیں۔ ہمیشہ یہ خدشہ رہتا ہے اگر انھیں کچھ ہو جائے تو اردو کا کیا ہوگا۔ حالانکہ کئی بار انھیں یہ باور کرا یا گیا ہے کہ اردو کو آب حیات پلا دیا گیا ہے وہ کبھی مر نہیں سکتی۔ پھر بھی وہ بے چین رہتے ہیں''۔

ان کے اردو، اردو کرنے سے کئی ایک یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ علاج معالجے کے ڈاکٹر نہیں بلکہ اردو کے پی ایچ ڈی ہیں اور اسی مناسبت سے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لگاتے ہیں۔ جب کسی شخص کی بیماری کی تشخیص کرتے دواؤں کا نسخہ تجویز کرتے ہیں۔ تو پتہ چلتا ہے کہ یہ انسانوں کے ڈاکٹر بھی ہیں''۔ [1]

سید ضیاء الرحمٰن سی ای او۔ یا ہنڈ ڈاٹ کام اپنے مضمون ''میرے دوست ڈاکٹر عابد معز'' میں لکھا ہے:

''میں ایک اور اہم بات کہنا چاہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود پوری دیانت داری کے ساتھ اردو کی خدمات انجام دے رہے۔ وہ نہ صرف اردو کے اخبار اور رسائل میں علمی تعاون کرتے ہیں بلکہ اردو کے رسالوں کی توسیع اشاعت میں بھی حصہ لیتے ہیں''۔ [2]

ڈاکٹر لئیق صلاح، سابق صدر شعبہ اردو جامعہ گلبرگہ ڈاکٹر عابد معز کے اردو کے تئیں فرماتی ہیں:

''۲۰ مارچ ۱۹۹۷ء کو ہندوستانی بزم اردو ریاض کے زیر اہتمام انڈین ایمبسی ریاض کے آڈیٹوریم میں شام شگوفہ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی تفصیل شگوفہ مئی

---

[1] ۔عطیہ فاطمہ ریاض۔ ماہنامہ شگوفہ عابد معز نمبر۔ ص:196

[2] ۔سید ضیاء الرحمٰن ۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر ص ۱۹۷۔۱۹۶

۱۹۹۷ء کے شمارے میں موجود ہے۔ خطبہ استقبالیہ میں ڈاکٹر عابد معز نے طنز ومزاح کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے اردو زبان کی بقاء ترویج وترقی کی طرف بھی حاضرین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس مزاحیہ اجلاس میں سفیر ہند محمد حامد انصاری کے علاوہ پرنسپل انٹرنیشنل اسکول اور سفارت خانہ ہند کے ہیڈ آف چانسلر ڈاکٹر اوصاف سعید نے شرکت کی''۔ [1]

حفیظ الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''ریاض کے ادبی افق پر ڈاکٹر عابد معز کا نام پوری آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ جدہ سے شائع ہورہے ہفتہ روزہ اردو میگزین کے ادبی صفحات پر عابد معز کی ظریفانہ تحریروں سے میری واقفیت تو پرانی ہے لیکن انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع گذشتہ دس مہینوں سے مل رہا ہے۔ جب سے میں سفارتی کار گزاری کے سلسلے میں ریاض میں مقیم ہوں۔ یہاں ان کے شخصی تجزیہ سے گریز کرتے ہوئے صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ موصوف خوش خلق، ملنسار اور ظریف ہونے کے ساتھ انتہائی مصروف اور سرگرم بھی ہیں۔ وہ خود بھی اردو پڑھتے اور لکھتے ہیں اور ریاض میں مقیم ہندوستانی طلباء وطالبات کو بھی اردو پڑھنے اور لکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ موصوف پیشہ کے اعتبار سے طبیب ہیں لیکن ادب پر ان کی فریفتگی دیکھ کر خیال گزرتا ہے کہ وہ پیشہ ور ادیب ہیں۔ کبھی ذہن اس طرف مائل ہوتا ہے کہ طبیب ان کی منکوحہ اور ادب معشوقہ ہے''۔ [2]

محمد یوسف رحیم بیدری نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''اردو زبان اور خواتین کی تائید میں جتنے مضامین عابد معز نے لکھے ہیں۔ اس سے امید ہے کہ عابد معز اہل زبان اور خواتین میں بھی مقبولیت حاصل

۱۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص نمبر: ۱۷۴

۲۔ حفیظ الرحمٰن اعظمی۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص: ۱۳۸

کر چکے ہوں گے''۔ ۱؎

بیگم الیاس آفریدی جدہ سعودی عرب کہتی ہیں:

''ان کی دلکش اردو جس سے ہماری آبائی سرزمین کی خوش بو آتی ہے۔ جس سے ہمارے معاشرے کی روح بولتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ماضی میں والیان دکن نے اردو کو خون دل سے سینچ کر پروان چڑھایا اور عصر حاضر میں والیان دکن نے اس کا بہت مان بڑھایا، جن میں عابد معز بھی شامل ہیں''۔ ۲؎

ڈاکٹر اسلم پرویز ایڈیٹر اردو سائنس ماہنامہ دہلی فرماتے ہیں:

''سائنس کا طالب علم رہا ہے اور بخوبی واقف ہے کہ آج اردو میں سائنس کی عدم مقبولیت کی اہم ترین وجہ وہ بانجھ و بوجھل تراجم جو اردو میں سائنسی ادب و معلومات کے تحت دستیاب ہیں اور وہ بھی محض چند ہستیوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ اردو زبان میں اور یجنل سائنس لکھنے والے عنقا ہیں۔ ایسے میں ڈاکٹر عابد معز صاحب کی شخصیت ہم اردو والوں کے لیے کسی قیمت سے کم نہیں کہ جن کی تحریریں نہ جانے کتنے نوجوانوں میں سائنس کے تئیں دلچسپی پیدا کر کے ایک ثواب جاریہ کا حصہ بن چکی ہیں''۔ ۳؎

محمد سیف الدین۔ ریاض سعودی عرب لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب اردو سے جتنی محبت کرتے ہیں محبان اردو سے بھی اتنے ہی خلوص دل سے ملتے ہیں۔ اردو زبان سے محبت کرنے والے کئی افراد کو قلم اٹھانے کے لیے راغب کرنے کی کامیاب سعی کر چکے ہیں۔ ان کی کوششوں اور حوصلہ افزائی سے خلیج بالخصوص سعودی عرب کے شہروں میں کئی افراد اہل قلم اور کئی

۱؎۔ محمد یوسف رحیم بیدر۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص نمبر۔ ۱۲۵

۲؎۔ بیگم الیاس آفریدی۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص: ۲۰۴

۳؎۔ ڈاکٹر اسلم ایڈیٹر۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص نمبر۔ ۱۵۱

اہل قلم مزاح نگار بن چکے ہیں‘‘۔ [۱]

ڈاکٹر خورشید احمد شفقت اعظمی سابق ڈپٹی ڈائرکٹر وزارت صحت حکومت ہند ڈاکٹر عابد معز کی اردو زبان کی بے لوث خدمت پر اس طرح خراج تحسین پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

’’ڈاکٹر عابد معز کی مشک بیز تحریریں نہ صرف ملک و بیرون ملک کے مقتدر رسائل کی زینت بنتی رہیں بلکہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اردو ہی کے بارے میں سوچتے اور گیسوئے اردو کی مشاطگی میں منہمک رہتے ہیں۔ بیرون ہند سعودی عرب میں ایک طویل مدت تک قیام کے دوران وہاں کی مختلف انجمنوں اور اردو اداروں کی سربراہی کا قرعہ فال بھی ان کے حصے میں آیا۔ اس اثنا میں انھوں نے اردو ابان وادب کے فروغ وارتقا میں غیر معمولی کردار ادا کیا جو آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ دیار غیر میں ادبی علمی ماحول بنانا اور اسے ایک مدت تک برقرار رکھنا موصوف کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں ان کے سینے میں اک دل مضطر ہے جو ہر وقت اردو کے لئے دھڑکتا رہتا ہے‘‘۔ [۲]

میر فراست علی خسرو لکھتے ہیں:

’’لوگوں کو گھیرنے، انھیں لکھنے کے لیے راضی کرنے، ادبی پرچوں کی سرپرستی کرنے، کتابیں خرید کر پڑھنے، زندگی کو ہنسی اور قہقہہ سے ہم آہنگ کرنے اور طنز و مزاح جیسے اہم اور ضروری صنف ادب کو روزمرہ کی زندگی سے وابستہ کرنے کی جتنی شعوری اور عملی کوشش ڈاکٹر صاحب نے کی ہے یہ سعادت میں نے کسی کسی کے حصے میں آتے دیکھی ہے۔۔۔اردو کی محبت میں ڈاکٹر صاحب کچھ اس حد تک جا چکے ہیں کہ اس کے خلاف یا اردو کے کاز کے خلاف کوئی بات سننے کے

۱۔ محمد سیف الدین۔ ماہنامہ شگوفہ عابد معز نمبر۔ ص نمبر ۲۰۰۔۲۰۱

۲۔ شخصی انٹرویو بتاریخ ۲۰۱۲۔۴۔۸

لیے بالکل تیار نہیں ہوتے۔احباب کے ساتھ ان کی جھڑپیں اور ناراضگی اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اس محبوبہ فن کو کسی حالت میں اپنی ذات سے علیحدہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے''۔ ۱؎

آرکیٹکٹ محمد عبدالرحمٰن سلیم صدر ہندوستانی بزم اردو ریاض اپنے مضمون ''معز زمعز'' میں عابد معز کی اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت پر اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے، لکھتے ہیں:

''ان دو دہوں کی دوستی میں کئی یادگار لمحے ایسے ہیں۔ جو قارئین تک پہنچایا جانا ہم نے ضروری سمجھا۔ بلا مبالغہ شہر ریاض میں گزشتہ پندرہ سالوں میں ہندوستانیوں کی جانب سے منعقد کردہ اردو کی ۸۰ فیصد محافل کے انعقاد کا سہرہ معز زمعز کے سر ضرور جاتا ہے''۔ ۲؎

بیرونی ممالک کا سفر

ڈاکٹر عابد معز ۱۹۸۷ء سے ۲۰۱۰ء تک ۲۳ سال سعودی عرب میں مقیم رہے۔ان ہی ایام میں وہ صرف خلیج کے ممالک کا سفر کیا ہے۔اس تعلق سے کہتے ہیں:

''میں صرف خلیج کے ممالک کا سفر کیا ہے جیسے عرب امارت، کویت، بحرین، عمان، وغیرہ''۔ ۳؎

مقامی اور بین الاقوامی سمینار اور مشاعرے میں شرکت

ڈاکٹر عابد معز زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے منعقد ہونے والے قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شریک رہے ہیں۔وہ سعودی عرب کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے سمینار، مشاعروں ادبی اجلاس، مختلف کانفرنسوں میں شریک رہے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

۱؎ ۔میر فراست۔ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر۔ص نمبر:۲۱۰۔۲۰۸

۲؎ ۔آرکیٹک محمد عبدالرحمٰن سلیم۔ماہنامہ شگوفہ عابد معز نمبر۔ص نمبر ۱۸۹

۳؎ ۔انٹریو۔بتاریخ۔۲۰۱۳۔۵۔۱

''مقامی کانفرنسوں میں حیدرآباد میں منعقد ہونے والی زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقریبات میں حصہ لیا ہے۔پہلی مرتبہ ۱۹۸۶ء میں مزاحیہ مضمون پڑھا تھا۔اس کے بعد جب بھی حیدرآباد میں رہا سالانہ تقریب میں شریک رہا ہوں۔ سعودی عرب کے مختلف شہروں میں ریاض، جدہ دمام، الاحسار، تبوک وغیرہ میں منعقد ہونے والے ادبی اجلاسوں، مشاعروں اور مختلف سمیناروں اور مذاکروں میں شریک رہا ہوں۔جون ۲۰۰۰ء میں ریاض، سعودی عرب میں جشن شگفتہ دکن بڑے پیانے پر منعقد کیا گیا تھا۔اس کا محرک اور منتظمین میں میں شامل تھا''[1]

پسندیدہ ادیب، شعراء

ڈاکٹر عابد معز کے پسندیدہ شعراء وادباد مندرجہ ذیل ہیں۔ان شعراء ادباء کو پسند ہی نہیں کرتے بلکہ ان سے متاثر بھی رہے ہیں۔اور چند کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات بھی رہے ہیں ان کا ذکر اپنی تحریروں میں جا بجا کیا ہے۔

شعراء میں:۔ میرؔ، غالبؔ، داغؔ، شکیلؔ، فیضؔ، ساحرؔ، راحتؔ اندوری، آغا سروشؔ، منصورؔ عثمانی،

مزاح نگاروں میں:

شوکت تھانوی، مشتاق احمد یوسفی، فکر تونسوی، یوسف ناظم، کرنل محمد خان، مسیح انجم، شفیق الرحمٰن، وغیرہ۔

افسانہ اور ناول نگاروں میں:

پریم چند، نسیم انہونوی، شوکت تھانوی، رضیہ بھٹ وغیرہ

کالم نگاروں میں:

---

[1] انٹرویو۔ بتاریخ۔۲۰۱۳۔۵۔۱۰

عطاالحق قاسمی، خامہ بگوش (مشفق خواجہ)

مزاحیہ شاعروں میں:

اکبرالہ آبادی، ضمیر جعفریؔ، سلیمان خطیبؔ، علی صائبؔ میاں طالب، خوندمیری اور گلی نلگنڈوی وغیرہ

نقادوں میں:

خامہ بگوش (مشفق خواجہ)

حلقہ احباب

ڈاکٹر عابد معز کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ان کے حلقہ احباب میں ہند پاک کے علاوہ عرب ممالک کے افراد جس میں ادباء شعراء ڈاکٹر، سائنس دان، انجینئر وفن کار، ملکوں کے سفیر، یونیورسٹیوں کے پروفیسر، رسالوں کے ایڈیٹر اور زندہ دلان حیدرآباد کے ساتھی، وغیرہ۔ چنانچہ ڈاکٹر سید نواز، انڈین ڈاکٹرز فورم، ڈاکٹر عابد معز کے حلقہ احباب کے مطابق اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''حیرت ہوتی ہے کہ عابد معز کے دوستوں کی فہرست کافی طویل ہے۔اس فہرست میں ادباء اور شعراء، ڈاکٹر اور سائنس دان، انجینئر اور فن کار رسالوں کے ایڈیٹر اور یونیورسٹی کے پروفیسر اور ملکوں کے سفیر سے لے کر ہوٹلوں کے بیرے اور دفتر میں صاف صفائی کرنے والے کارندے تک شامل ہیں۔ان سب کے نمبران کے یہاں محفوظ ہوتے ہیں اوران کے سب کی خیریت انھیں عزیز ہوتی ہے۔'' [۱]

ان کے حلقہ احباب میں ہر قسم کے لوگ شامل ہیں۔ان کی ملنساری اور منکسر المزاجی کی وجہ سے

۱۔ ڈاکٹر سید نواز انڈین ڈاکٹر فورم ریاض، ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر۔ص نمبر:۱۹۹

بہت جلد ہر کوئی ان کا دوست بن جاتا ہے۔

محمد حامد انصاری نائب صدر جمہوریہ ہند ایم او ہچ فاروقی سفیر ریاض، ڈاکٹر اوصاف سعید قونصل جنرل جدہ، ڈاکٹر ماجد قاضی (سعودی) ڈاکٹر ابوالفضل سید علی (امریکہ) ڈاکٹر ستیہ پال آنند، ڈاکٹر منان، ڈاکٹر محمد عبدالمجید، ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، ڈاکٹر خورشید، احمد شفقت اعظمی (دہلی)، ڈاکٹر سعید نواز (سعودی عرب)

پروفیسر فاطمہ پروین، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر عبدالشکور، پروفیسر مقبول فاروقی، پروفیسر لئیق صلاح، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر اعجاز، پروفیسر وہاب قیصر، پروفیسر یوسف کمال ڈاکٹر محسن جلگانوی، پروفیسر کلیم چغتائی (کراچی پاکستان) پروفیسر حسین سحر (پاکستان) فہیم سحر مدیر اعلیٰ سہ ماہی سحاب (سعودی عرب)، طارق شخص مینجنگ ایڈیٹر سعودی گزٹ، شجاع الدین غوری پاکستان، ہمایوں (پاکستان) شاہین نظر (پاکستان)

غوث ارسلان عذر نقوی، تابش دہلوی، نور جہاں غازی، محمد یوسف رحیم بیدری، رشید انصاری، میر فراست علی خسرو، نعیم جاوید، آرکیٹکٹ محمد عبدالرحمٰن سلیم، محمد عبدالرشید جنید، حفیظ الرحمٰن اعظمی۔ وغیرہ

زندہ دلان حیدر آباد، کے ساتھیوں میں جناب نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین، مصطفیٰ کمال، طالب خوندمیری، حمایت اللہ، پرویز یداللہ مہدی، مصطفیٰ علی بیگ، روف رحیم، ڈاکٹر عباس، فرید سحر سردار، علیم خان فلکی، حمید عادل، فیاض احمد فیضی وغیرہ۔

☆☆☆

(ب): شخصیت

شخصیت کسی کی باطنی خصوصیات اور ظاہری خدوخال کے مجموعہ کا نام ہے۔کوئی شخص اپنے چہرے قدوقامت رکھ رکھاؤ، بول چال،حرکات وسکنات اور طور طریقوں سے سماجی زندگی میں دوسروں پر اپنا جو تاثر قائم کرتا ہے وہی اس کی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے۔

شخصیت کا دوسرا پہلو باطنی خصوصیت ہے شخصیت کا خارجی پہلو جتنا روشن اور عیاں ہوتا ہے، اتنا ہی اس کا داخلی اور باطنی پہلو پیچیدہ اور پر اسرار ہوتا ہے۔ باطنی خصوصیت کے زمرے میں شرافت، اخلاق ،فکرو خیال، ہمدردی ،ملنساری ، اورخلوص وغیرہ شامل ہیں۔غرض شخصیت دراصل تعلیم وتربیت اور مذہبی اثرات کے ذریعہ کسی انسان میں پیدا ہوتی ہیں اور کبھی ان خصوصیات میں نسلی محرکات وعوامل کی کارفرمائی بھی ہوتی ہے تو کبھی خاندانی طور پر یہ خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔

بہرکیف کسی کی شخصیت کا مطالعہ ایک دلچسپ کام ہونے کے ساتھ ایک پیچیدہ عمل بھی ہے۔ڈاکٹر عابد معز کی شخصیت بھی ان خصوصیات سے مبرا نہیں ہے،ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں نسلی محرکات وعوامل کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ خاندانی سماجی ،سیاسی ،تہذیبی ،معاشرتی وعملی ماحول کا بڑا دخل ہے۔

ڈاکٹر عابد معز نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جہاں ادبی ماحول کی بجائے علمی ماحول رہا ہے۔دور دور تک ان کے خاندان میں کوئی شاعر یا ادیب پیدا نہیں ہوا۔اس کے باوجود وہ اپنی محنت ،کوشش اور لگن سے بیک وقت علمی ادبی ،اورطبی میدان میں ایک متحرک فعال شخص بن گئے۔

ڈاکٹر عابد معز گوناگوں اوصاف کے حامل اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں ۔ وہ نہ صرف ایک طبی ڈاکٹر ہیں بلکہ اردوادب میں طبی ومعلوماتی کالم نگار، انشائیہ نگار،شگفتہ افسانہ نگاراور کامیاب مزاح

نگار بھی ہیں۔ان کی شخصیت بڑی پہلودار ہمہ رنگ اور پرکشش ہونے کے ساتھ اپنی ذات سے خود ایک انجمن ہیں۔تاریخی،سماجی،سیاسی،مذہبی،طبی اور سائنسی موضوعات پر ان کی گہری نظر رہتی ہے۔وہ انتہائی مصروفیت کے باوجود کسی مسئلے اور کسی بھی موضوع پر تر و تازہ معلومات دیتے اور کھلے ذہن سے بات کرتے ہیں خاموش طبیعت کے مالک لیکن تحریروں سے ظرافت کے پھول جھڑتے ہیں۔غرض ڈاکٹر عابد معز کی شخصیت میں بیک وقت کئی خوبیاں جمع ہوگئی ہیں۔جو بھی ان سے ملتا ہے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حلیہ

ڈاکٹر عابد معز کی وضع قطع اور عکس جمیل کچھ اس طرح ہے۔دراز قد،مناسب جسم،گوری رنگت کشادہ پیشانی مناسب ہونٹ اور ناک،ڈاڑھی منڈھی ہوئی (Clean shave) اور کشادہ موچھیں چہرا بھرا بھرا جھریوں سے پاک ہے۔ڈاکٹر عابد معز نے خود اپنا حلیہ اس طرح ظاہر کیا ہے:

> ''وہ باتیں سن لیجئے جن کے سبب میں اپنی تصویر سے خوش نہیں ہوں اور جنہیں تصویر بیان کرنے سے قاصر ہے۔جلد کا رنگ کالا سانولا اور نہ ہی گورا بلکہ وہ مخصوص تانبا جیسا ہے برصغیر کی پہچان ہے۔چہرا بھرا بھرا اور ابھی تک جھریوں سے پاک ہے ماضی میں ناک اور کان مناسب لگتے تھے۔لیکن اب فارغ البالی کے سبب ناک موٹی اور کان بڑے نظر آتے ہیں۔ہونٹ، پتلے نہ موٹے ہیں اور اوپر کے ہونٹ پر گھنی مونچھیں سائبان کیے ہوئے ہے۔آنکھیں پلکوں کی اوٹ میں روشن اور چمکدار،موضوع کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔قد عام مردوں جیسا یعنی خواتین کے درمیان اونچا نظر آتا ہوں، پانچ فٹ آٹھ انچ ،وزن بڑھ رہا ہے اس لیے بتانے کا فائدہ نہیں ۔ وزن کو قابو میں کرنے کا جتن کر رہا ہوں لیکن وہ ہے کہ عمر کی طرح اپنی ایک رفتار سے بڑھتا جارہا ہے۔سینہ کی چوڑائی کا ادب میں کوئی مقام نہیں ۔ یہاں سر کی گولائی کی پیمائش ہوتی ہے۔میں یہ کام نقادوں کے لیے چھوڑتا ہوں۔ چال چلن بیان کرنے سے زیادہ دیکھنے بلکہ

پر کھنے کی چیز ہے‘‘ ۔[1]

ڈاکٹر عابد معز کا رنگ کالا۔ سانولا اور نہ ہی گورا، چہرہ ابھرا ہونٹ پتلے نہ موٹے، آنکھیں پلکوں کی اوٹ میں روشن اور چمکدار، ہنس مکھ، پیشانی کا رقبہ چوڑا قد پانچ فٹ آٹھ انچ، علیم خاں فلکی عابد معز کے فارغ البال اور ان کی خوبصورتی کے تعلق سے اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

’’ہم نے کئی مزاح نگاروں کی تصویریں دیکھی ہیں، اس لیے ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عابد معز اس دور کے سب سے خوبصورت مزاح نگار ہیں اور ایماندار بھی کیونکہ مضمون کے ساتھ ہمیشہ تازہ ترین نئی تصویر ہوتی ہے۔ پتہ نہیں پڑھنے والوں پر ہنستے ہیں یا جن پر لکھا ہے ان پر ہنستے ہیں، بہر حال ہنسی اور تصویر دونوں اوریجنل ہوتے ہیں۔۔۔ یہ غصہ چھپا بھی نہیں سکتے کیونکہ پیشانی کا رقبہ اتنا بڑا ہے کہ تالو کے چٹیل میدان میں پیشانی کا کوئی بل چھپ نہیں سکتا۔ اپنی تالو کی تعریف یہ اپنے مضامین میں کرتے نہیں تھکتے۔ لیکن اگر کوئی دوسرا کردے تو برا مان جاتے ہیں۔ کوئی ’’سر‘‘ کہہ کر مخاطب کرے تو پہلے یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ وہ ان سے مخاطب ہے یا ان کے سر سے دھوپ میں جب وہ تالو چمکتی ہے تو لگتا ہے پیدل بھی جاتے ہیں تو ہیلمٹ لگا کر جاتے ہیں‘‘۔ [2]

فیاض احمد فیضی نے ڈاکٹر عابد معز کے حلیہ کو مزاحیہ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے:

’’ان سب کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے بارے میں خاکہ فرسائی کرنا ناممکن تو نہیں البتہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بے حد خاموش طبیعت کے ہوتے ہیں اور سوائے ہوں، ہاں، کے لب کشائی نہیں کرتے۔ ان کے منہ پر ان کی تعریف کر دیجئے تو ذرا مسکرا دیتے ہیں، بس اور مسکراہٹ میں بھی ایسی جس میں اس بات کا پورا اہتمام ہوتا ہے کہ دانت نہ

---

[1] ۔ خاکہ بقلم، اپنے منہ میاں مٹھو، ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص:80

[2] ۔ علیم خان فلکی۔ شگوفہ کا ٹڑی پار ایڈیٹر او ورسیز۔ (ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص:164-166)

دکھائی دے جائیں۔ ڈاکٹر عابد معز تو اس معاملے میں اتنے محتاط ہیں کہ انہوں نے حفظ ما تقدم کے طور پر موٹی اور گھنی مونچھیں اُ گالی ہیں تا کہ خود اپنے مضامین پڑھ کر اگر ہنسی آجائے تو اوپری دانت مونچھوں کے نیچے پناہ لے سکیں اور ظاہر نہ ہونے پائیں۔ آج سے ٹھیک پچیس برس پہلے معز سے معظم جاہی مارکٹ پر مجرد گاہ نامی عمارت کی چوتھی منزل پر واقع ماہ نامہ ''شگوفہ'' کے دفتر میں ملاقات ہوئی تو اس وقت تک وہ رائٹر اور ڈاکٹر دونوں سابقوں سے سرفراز ہو چکے تھے لیکن چہرے پر کھلنڈرا پن برقرار تھا جس کے سبب وہ ابھی تجرد کی زندگی ہی گزار رہے تھے۔ ان کی شخصیت میں جو چیز سب سے نمایاں تھی وہ ان کا ''گنج'' تھا جس نے ان کی پیشانی کو وسعت بخشی ہوئی تھی۔ پچھلے پچیس برسوں میں یہ ''گنج'' پھیل کر ان کی کار، کوٹھی، بینک بیلنس اور توند میں تبدیلی ہو گیا ہے۔ حیرت انگریز طور پر جن بالوں نے ان کے سر پر اُ گنے سے صاف انکار کر دیا تھا، انہوں نے مونچھوں کے ساتھ وفاداری نبھائی اور انہیں اتنا گھنا بنا دیا کہ وہ بچوں کو ڈسپلین کا پابند رکھنے کے علاوہ خود اپنے مالک کے کردار کو قائم رکھنے کا کام بحسن وخوبی انجام دے رہی ہیں۔ ان ہی مونچھوں کی وجہ سے سر کا گنج باوقار معلوم ہوتا ہے۔ اور انہوں نے ان کی کتابوں کی پشت پر چھپی ان کی تصویر کو وہ متانت بخشی ہے جسے دیکھ کر لوگ کتاب پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں''۔ [1]

ملنساری وشرافت

ڈاکٹر عابد معز بڑے ہمدرد اور انسان دوست واقع ہوئے ہیں انہوں نے کبھی کسی کے لیے اپنے دل میں بغض و کینہ نہیں رکھا۔ بعض مخلص دوستوں سے نقصان بھی پہنچا لیکن وہ بدلہ لینے کے قائل نہیں ہیں۔ کسی کو ناراض کر کے دل دکھانا ان کا شیوہ نہیں۔ جب کبھی کسی محفل میں انہیں بلایا جاتا ہے تو وہ خوشی خوشی شرکت بھی

---

[1] ۔فیاض احمد فیضی۔ ریگ زادوں میں گل کھلانے والا۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص:169

کرتے ہیں۔ابوالفرح ہمایوں نے عابد معز کی چند خوبیوں کو اس طرح بیان کیا ہے:

''اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ عابد معز مجسم خوبیوں کا مرقع ہیں؟ جی نہیں، ایسا بھی نہیں ہے۔ ہر انسان کی طرح ان کے اندر بھی چند خامیاں موجود ہیں، ہم نے ان کی تین عظیم الشان خرابیوں کا سراغ لگایا ہے۔ وہ خرابیاں حسب ذیل ہیں:۔

۱)۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ان کی خصلت ہے۔ نت نئے مشورے دیتے ہیں اور مزید لکھنے پر اکساتے ہیں۔ دل دکھانا ان کا شیوہ نہیں۔ شاید وہ ''دل بدست آرد کہ حج اکبر است'' کے صدق دل سے قائل ہیں۔

۲)۔کوئی ناراض ہو جائے، یہ بات انہیں ہرگز گوارا نہیں۔اپنی معصوم فطرت اور نرم طبیعت کے باعث خود کو ہی قصوروار گردانتے ہیں اور ناراض دوست کے گھر جا کر اس کو مناتے ہیں۔

۳)۔ادب میں سیاست کے قائل نہیں۔کسی خاص تنظیم سے جڑے رہنا بھی انہیں پسند نہیں۔جس محفل میں انہیں بلایا جاتا ہے وہ خوشی خوشی شرکت کرتے ہیں اور ہر ایک سے دوستی بنا کر رکھتے ہیں''۔ [۱]

ڈاکٹر عابد معز اپنے عزیزوں اور دوستوں کی خوشی و غم دونوں میں شامل ہوتے ہیں۔یعنی دوستوں کی بیماری کی خبر سنتے ہی عیادت کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور شادی بیاہ کی تقریبات میں بھی شریک ہوتے ہیں۔نواب سکندر علی خاں، عابد معز کی ملنساری انکساری و شرافت پر اس طرح اظہار کیا ہے:

''وہ رکھ رکھاؤ میں ملنے ملانے کا خاص خیال رکھتے ہیں، خاص موقعوں پر شادی ہو یا کسی کی وفات پر یا اپنے دوست و احباب میں کوئی بیمار پڑ جائے اس وقت ملنے کا موقعہ مل جائے تو مزاج پرسی کر لیتے ہیں موقعہ میسر نہ ہو تو وہ فون کر کے خیر و عافیت پوچھ لیتے ہیں ۔ ایسی کئی

---

[۱] ۔ابوالفرح ہمایوں کراچی۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ص:179

خوبیاں ان کی شخصیت میں شامل ہیں‘‘۔ ۱؎

عابد معز مزاجاً مزاح نگار کے علاوہ ایک شرافت پسند انسان بھی ہیں۔ جناب نریندر لوتھر صاحب، عابد معز کی شرافت اور انکساری پر لکھتے ہیں:

’’میں عابد معز کی مزاح نگاری کے علاوہ ان کی شرافت، انکساری اور اردو کے تئیں بے پناہ محبت کا معترف ہوں‘‘۔۱؎

۱؎۔نریندر لوتھر۔ماہنامہ شگوفہ عابد معز شگوفہ نمبر۔ص:137

جناب رشید عبدالسمیع جلیل صاحب ڈاکٹر عابد معز کی شرافت اور انکساری اور چند خوبیوں کو دو اشعار میں اس طرح باندھا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

دشمنی بھی بھول جاتے ہیں انداز دشمنی
کچھ ایسا رنگ دوستی عابد معز میں ہے
اچھوں کے ساتھ اچھے ہیں نیت بری نہیں
سب جانتے ہیں خوش دلی عابد معز میں ہے‘‘ ۲؎

شگفتہ مزاجی اور انداز گفتگو

عابد معز ایک طنز مزاح نگار، سنجیدہ کالم نگار اور انشائیہ نگار ہیں۔لیکن روزمرہ زندگی میں حد درجہ زندہ دل اور شگفتہ مزاج بھی ہیں۔ابوالفرح ہمایوں عابد معز کی خوش مزاجی اور خوش گفتار انداز بیان پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’چینی اور شیرینی سے زیادہ رغبت نہیں اور مصری کے بارے میں ہمیں علم نہیں۔مگر نہ جانے گفتگو اور تحریر میں اتنی شیرینی اور مٹھاس کہاں سے گھل مل گئی کہ ایک جہاں ان کا دیوانہ ہے۔خوش خلق، خوش مزاج اور خوش گفتار بننے کے

۱؎ ۔شخصی انٹرویو۔نواب سکندر علی خان۔بتاریخ 15-6-2013

۲؎ ۔رشید عبدالسمیع جلیل۔ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر۔ص:150

لیے خوش خوراک ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ سبق ہم نے عابد معز سے سیکھا''۔ [1]

افسر آرموری (ڈاکٹر عبدالمجید) نے بھی ڈاکٹر عابد معز کی شگفتہ مزاجی کو دکنی لب ولہجہ میں اس طرح بیان کیا ہے:

''ڈاکٹر صاحب سادات ہیں۔نام کے نئیں پکے۔سیدے، سادے بھولے ، بھالے، اندر جیسے باہر بھی ویسے۔غصہ بھوت کم آتا ئے۔چہرے سے خفگی معلوم پڑ جاتیئے ۔جھوٹ سے سخت نفرت ہور حق بولنے میں پھٹ ۔ہنس مکھ ہور مزاج میں ظرافت، طبیعت میں شرافت، کڑوی بات کو بھی لڈو بنا کر پیش کرتیں مسکرا کو مل تیئں''۔ [2]

عابد معز کا لب و لہجہ معتدل ہے۔ وہ گفتگو صرف بقدر ضرورت ہی کرتے ہیں۔ رشید انصاری صاحب، عابد معز کے انداز گفتگو اور نفاست پسندی پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''نفاست پسندی میرے خیال میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ وہ نہ ہی کم گو ہیں اور نہ ہی ضرورت سے زیادہ بولنے والے۔ یعنی ضرورت اور توقع کے لحاظ سے ہر قسم کی گفتگو بقدر ضرورت ہی کرتے ہیں''۔ [3]

اصول پسندی

عابد معز کی شخصیت کا اہم پہلو صاف گوئی اور دوٹوک انداز گفتگو ہے وہ فیصلوں کے وقت مصلحت و مروت سے کام نہیں لیتے، جو محسوس کرتے ہیں فوراً بیان کر دیتے ہیں۔نواب سکندر علی خان عابد معز کی اصول پسندی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''ڈاکٹر عابد معز کی اصول پسندی ریاض میں زبان زد عام ہے۔ ایک ہی

---

[1] ۔ابوالفرح ہمایوں کراچی۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ص:178

[2]۔ افسر آرموری (ڈاکٹر عبدالحیط) ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ص:185

[3] ۔شخصی انٹرویو۔ رشید انصاری۔ بتاریخ 15-6-2013

صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز جیسا معاملہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی سخت
اصول پسندی کی وجہ سے کبھی اپنوں سے اور کبھی غیروں سے نقصانات اٹھائے
ہیں۔ اور میں نے اُن کی زندگی میں ہر جگہ ایک قسم کا Discipline دیکھا
ہے''۔ ۱

قائدانہ صلاحیت

عابد معز ہمہ جہت شخصیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ صاف گو، خوش مزاج، مخلص، قناعت پسند، اصول پسند کے علاوہ آپ کے اندر قائدانہ اور انتظامی صلاحیتیں بے پناہ موجود ہیں۔ علیم خان فلکی عابد معز کی قائدانہ اور انتظامی صلاحیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان میں قائدانہ اور انتظامی صلاحیتیں بے پناہ ہیں جب کوئی کام اپنے ذمہ لیتے ہیں تو مجال ہے اُس میں کوئی کمی رہ جائے۔ انڈین ایمبسی اسکولوں کی بائر بورڈ، حیدر آباد کے چار سو سالہ جشن، شگوفہ اور ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب کا ریاض میں استقبالیہ، جشن شگفتہ دکن اور ایسے ہی دوسرے کئی اہم مواقع پر ہم نے دیکھا کہ یہ مزاح نگار سے کہیں زیادہ ایک قائد اور منتظم ہیں۔ اگر سعودی عرب میں اردو ادب کے لیے کوئی اسمبلی یا پارلیمنٹ ہوتی تو بلا مقابلہ جیت کر آتے''۔ ۲

شجاع الدین غوری نے بھی ڈاکٹر عابد معز کی قائدانہ صلاحیتوں کو اس طرح اجاگر کیا ہے:

''عابد معز مزاجاً انتہائی ملنسار، یار باش اور مجلسی طبیعت کے مالک ہیں، جس کام کا بیڑا اٹھائیں گے اسے پایہ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں''۔ ۳

نواب سکندر علی خان، عابد معز کی قائدانہ صلاحیتوں کے تعلق سے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر عابد معز ڈاکٹر

---

۱ ۔شخصی انٹرویو۔نواب سکندر علی خان۔بتاریخ:15-6-2013

۲ ۔علیم خان فلکی۔ ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر۔ص:166-167

۳ ۔شجاع الدین غوری۔ماہنامہ شگوفہ عابد معز نمبر۔ص:176

سے بہتر ایڈمینسٹریٹر Adminstrator ہیں:

''وہ ڈاکٹر سے زیادہ بہترین ایڈمنسٹریٹر Administrator ہیں۔ وہ جو کوئی کام کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں اسے پایہ تکمیل تک ضرور پہنچاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑا بلکہ ہر کام کو منظّم انداز میں منصوبہ بند طریقے سے انجام دیتے ہیں''۔ [1]

مہمان نوازی

عابد معز پیشہ کے لحاظ سے ایک طبی ڈاکٹر ہیں اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی علمی و ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے چنانچہ عطیہ فاطمہ عابد معز کی ادبی خدمات اور مہمان نوازی کے تعلق سے لکھتی ہیں:

''سعودی عرب کی وزارت صحت میں ماہر تغذیہ و مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دن میں ڈھائی بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر دوسری ڈیوٹی پر لگ جاتے ہیں یعنی سارے جہاں کا درد وہ اپنے جگر میں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ شہر ریاض میں مشاعرے اور ادبی محفلیں سجاتے ہیں۔ ہندوستانی بزم اردو، ریاض انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے بانی رکن اور نائب صدر ہیں۔ ریاض آنے والے ادباء شعراء کی میز بانی اور ان کی خدمت میں ہمیشہ حاضر رہتے ہیں''۔ [2]

سعودی عرب کا دارالحکومت ریاض کی فضا اردو والوں کو خوب راس آئی، شعر و سخن کا ایک بڑا حلقہ یہاں قیام پذیر ہے، ادبی و ثقافتی بزم آرائیاں اس شہر کی ثقافتی تاریخ کا حصہ ہے۔ اسی لیے ہندو پاک کے اکثر شعراء ادباء، صحافیوں اور فن کار ریاض آیا کرتے ہیں۔ چنانچہ حفظ الرحمٰن اعظمی، عابد معز کی شعراء اور ادباء

---

[1] ۔ شخصی انٹرویو۔ نواب سکندر علی خان۔ بتاریخ: 15-6-2013

[2] ۔ عطیہ فاطمہ۔ ریاض سعودی عرب۔ معز بھائی۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص:194

کی مہمان نوازی کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

''مزید برآں، ہندوستان سے مہمان شعراء ادباء، ناقدین، صحافیوں اور فن کاروں کی ریاض تشریف آوری پر ان کی پذیرائی، شاندار استقبال سے اور پر تکلف عشائیے کا اہتمام بھی اپنا خوش گوار فریضہ سمجھتے ہیں''۔ ۱

ڈاکٹر عابد معز انتہائی مخلص انسان ہیں۔ اخلاقی قدروں کے علمبردار، خوش اخلاقی کے ساتھ ایک اچھے مہمان نواز بھی ہیں۔ اور ان کے اندر ترفع، تعلّی یا دکھاوے کا شائبہ تک نہیں دکھائی دیتا۔ ڈاکٹر خورشید احمد شفقت اعظمی، ڈاکٹر عابد معز کی مہمان نوازی کی ستائش ان لفظوں میں کی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''ڈاکٹر عابد معز انتہائی مخلص انسان ہیں ان کے اندر ترفع، تعلّی یا دکھاوے کا شائبہ تک نہیں، حیدرآباد کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کے علمبردار، انتہائی ملنسار، خوش اخلاق، حیدرآباد پہنچ کر میں نے جب بھی موصوف سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود نفس نفیس تشریف لاتے، کار میں لے کر دولت خانے پر پہنچتے اور شاندار ضیافت کا اہتمام کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر عابد معز سے آداب ضیافت کا درس لیا جا سکتا ہے''۔ ۲

عابد معز ایک اچھے انسان کے علاوہ مہمان نواز دوست بھی ہیں۔ عابد معز کی مہمان نوازی کے تعلق سے نواب سکندر علی خان نے اس طرح کہا ہے:

''تقریباً دو سال تک میں ڈاکٹر صاحب کا Non-paying مہمان رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے جتنا پیار دیا ہے جتنی محبت ان سے ملی ہے شائد میں کبھی اس کی پابجائی نہ کر پاؤں۔ میں اتنا کہوں گا کہ

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے دیکھے نہ ہوں شائد مگر ایسے بھی ہے ۳

۱۔ حفظ الرحمن اعظمی۔ عابد معز: طبیب / ادیب۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص:138

۲۔ انٹرویو، یا ذریعہ میل، خورشید احمد شفقت اعظمی سابق ڈپٹی ڈائریکٹر وزارت صحت حکومت ہند۔ بتاریخ: 8-2-2013

۳۔ شخصی انٹرویو۔ نواب سکندر علی خان۔ بتاریخ: 15-6-2013

بحیثیت شوہر

عابد معز ہمدرد، ملنسار، خوددار، قناعت پسند، مخلص انسان اور اچھے ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ ایک وفادار اور مہربان و مثالی شوہر بھی ہیں۔ بے شمار مصروفیات کے باوجود اپنی شریک حیات کے لیے وقت نکالتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز کی بیوی محترمہ فرحانہ محمدی اپنے ایک انٹرویو میں ڈاکٹر عابد معز کے بارے میں کہتی ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب پوری طرح سے ایک مثالی شوہر ہیں۔ میری بہنیں بھی ان کی مثال دیتی ہیں۔ اپنی ذات پر زیادہ خرچ نہیں کرتے اور افراد خاندان پر خرچ کا حساب نہیں رکھتے گویا وہ خود کے لیے کنجوس ہیں، لیکن ہمارے لیے نہیں، انہیں کچن میں میرے ہاتھ کی بنی ہر چیز پسند ہے۔ لیکن کچن میں جانا کبھی پسند نہیں رہا۔ چائے تک نہیں بنا سکتے! آرزو ہی رہ گئی کہ کبھی وہ چائے بنا کر پلائیں۔ جوار کی روٹی اور کھٹی دال انہیں بہت پسند ہے۔ مہنگائی سے چڑتے ہیں، اس لیے شاپنگ کے لیے ساتھ نہیں آتے، ان کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اچھے آدمی ہیں۔ جھوٹ نہیں بولتے، بہانے نہیں بناتے۔ لیکن سب سے خراب عادت وقت کی پابندی ہے۔ اس لیے ہم جب شادی خانے جاتے ہیں تو وہاں کوئی نہیں رہتا...... انہیں دکھاوا پسند نہیں ہے۔ جو ہیں سو ہیں بلکہ سب ایک جیسے ہیں۔ دینی معاملوں میں بھی دکھاوا پسند نہیں کرتے''۔[1]

بحیثیت والد

ڈاکٹر عابد معز کی چار اولاد ہیں تین لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ وہ بیٹے اور بیٹی میں فرق محسوس نہیں ہونے دیتے۔ اچھی تعلیم اور تربیت کے ساتھ انہیں آزادی دینے کے باوجود انہوں نے کبھی غیر ضروری چھوٹ بھی نہیں دی بلکہ بچوں کی تعلیم کے معاملے میں سخت مزاج ثابت ہوئے لیکن اپنے بچوں کے لیے ہر رول میں

---

[1] ۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص:216

اچھے باپ ثابت ہوئے ہیں۔ڈاکٹر سیدہ مہ طلعت نے (بیٹی) ایک انٹرویو میں اپنے شفیق ہمدرد والد ڈاکٹر عابد معز کے تعلق سے کہتی ہیں:

’’میں نے ابو کو کئی رول میں دیکھا ہے۔ بیٹا، بھائی، شوہر، باپ، دوست، ڈاکٹر، ادیب، میں نے انہیں ہر رول کو پرفیکٹ طریقے سے ادا کرتے ہوئے پایا ہے۔باپ کے رول میں ان کی یہ خوبی مجھے بہت پسند ہے کہ وہ بیٹے اور بیٹی میں فرق نہیں کرتے۔ وہ ہمیں ہر جائز کام کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ابو نے ہم تینوں بہنوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی ہے۔ہم نے کار چلانا چاہی تو ابو نے کار چلانا سکھایا ،اٹھارہ سال مکمل ہونے کے بعد،اس سے پہلے نہیں۔ کہتے ہیں کہ قانون ہماری بہتری کے لیے وضع کیے جاتے ہیں اس لیے ان کا احترام ضروری ہے......اچھی تعلیم اور تربیت کے لیے ہمیں آزادی دینے کے باوجود ابو نے ہمیں کبھی غیر ضروری چھوٹ نہیں دی۔ پڑھائی کے معاملے میں وہ بہت سخت گیر رویہ اپناتے ہیں۔ ہمارے خاندان کے بعض بزرگ انہیں پڑھائی کے معاملے میں ہٹلر کہتے ہیں۔ابو کا آمرانہ رویہ تھا کہ ہم تین بہنوں کو بغیر ڈونیشن ایم بی بی ایس میں داخلہ ملا۔میرے ابو سچ بولنا اور سننا پسند کرتے ہیں۔وہ لوگوں کا دل رکھنے کے لیے غلط بات کرنا تو دور خاموش بھی نہیں رہتے۔ جو صحیح سمجھتے ہیں کہہ گزرتے ہیں۔اس وجہ سے چند لوگ ان سے ناراض رہتے ہیں‘‘۔ [1]

عابد معز اپنی ماں سے بہت محبت وعقیدت رکھتے ہیں ان کا اندازہ ہم یوں لگا سکتے ہیں۔ ماں کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنے گھر کا نام ’’والدہ کے نام دعائے خیر‘‘ رکھا ہے انہوں نے زندگی میں جو کچھ حاصل کیا ہے، کہتے ہیں کہ ان کے ماں باپ کی دعا سے حاصل ہوا ہے۔ وہ بیوی بچوں سے بے حد پیار و محبت کرتے ہیں، اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود بچوں کو ان کے تعلیمی معاملات میں وقت دینے کے لیے بخل

---

[1] ۔ ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر۔ص:214

سے کام نہیں لیتے ، وہ اپنے بچوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں ۔ بچوں کا بھی کہنا ہے کہ ان کے والدان کے سب سے اچھے اور گہرے دوست ہیں ۔ ان کی بیوی کا کہنا ہے کہ میں اپنے شوہر سے بہت خوش ہوں ۔

بحیثیت دوست

ڈاکٹر عابد معزاعلیٰ انسانی قدروں کے علمبردار ہیں۔ رفتار وگفتار سے نفاست اور شائستگی بردوبار طبیعت کے مالک ہیں اپنے دوست واحباب کی ہمیشہ خبر گیری رکھتے ہیں۔لیکن کسی دوست کی دل آزاری نہیں کرتے ۔ اگر وہ کسی کو پسند نہ بھی کرتے ہوں تو اس کا ذکر مخلصانہ انداز میں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خورشید احمد شفقت اعظمی سابق ڈپٹی ڈائرکٹر، وزارت صحت حکومت ہند ڈاکٹر عابد معز کی دوستی کے تئیں جذبہ خلوص کی ستائش کرتے ہوئے انٹرویو میں اس طرح کہا ہے:

> ''وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوصف انتہائی علم دوست واقع ہوئے ہیں اور ارباب علم کے لیے دیدہ دل فریش راہ کئے رہتے ہیں۔ یہ اوصاف آج کل اگر معدوم نہیں تو کمیاب ضرور ہوگئے ہیں۔ موصوف خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت اور بااصول بھی ہیں۔ ایک دفعہ تعلق قائم ہونے کے بعد اسے برقرار رکھنے کی ممکنہ سعی کرتے ہیں، بے شک میں ان کی دوستی پر ناز کرتا ہوں''۔[1]

آپس میں صلاح ومشورے لینا دینا بھی دوستی کی مضبوطی کا ایک اہم پہلو ہے۔ ڈاکٹر عابد معز اپنی زندگی کے روزمرہ کے پہلوؤں پر اپنے خاص واہم دوستوں سے شیر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ابوالفضل سید محمد علی شکاگو امریکہ اپنے دوست عابد معز کے تعلق سے اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر عابد معز بہت اچھے دوست واقع ہوئے ہیں۔ میرا تجربہ تو کافی مثبت

---

[1] ۔ شخصی انٹرویو۔ بذریعہ میل۔ بتاریخ: 8-4-2012

رہا ان کے ساتھ ۔ ہماری دوستی میں مزاح تو ہمیشہ شامل رہا۔لیکن ساتھ ساتھ سنجیدہ پہلو بھی وقت ضرورت ظاہر ہوتا ہے۔ زندگی کے روزمرہ کے پہلوؤں پر بھی گفتگو ہوتی رہتی ہے اور آپس میں صلاح مشورے بھی ہوتے ہیں جو کہ دوستی کی مضبوطی کا ایک اہم پہلو ہے۔ بہر حال معز صاحب میں ایک صحیح دوست کی تمام خصوصیات موجود ہیں''۔ ١

مندرجہ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عابد معز پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بلند پایہ طنز و مزاح نگار۔سنجیدہ کالم نویس، انشائیہ نگار اور مزاحیہ افسانہ نگار کے ساتھ، مشفق، مہربان والد وفا شعار شوہر، اور ہمدرد دوست ہیں۔ ملنساری خلوص، قناعت پسندی، خوش مزاجی، سنجیدگی اور مہمان نوازی جیسے اقدار ان کی شخصیت کی خوبیاں ہیں۔

غرض ڈاکٹر عابد معز ایک حساس دل رکھنے والے انسان دوست اور ہمدرد واقع ہوئے ہیں۔نواب سکندر علی خان نے انہیں ایک قابل قدر انسان قرار دیا ہے:

میں اپنے ہم عصر دوستوں میں ڈاکٹر صاحب کو اردو کا سچا بے غرض عاشق ایک قابل قدر انسان اور بے غرض محسن سمجھتا ہوں ۔ میں اپنی عملی زندگی میں چند لوگوں سے متاثر رہا ہوں ان میں ڈاکٹر عابد معز صاحب کی شخصیت بھی شامل ہے''۔ ٢

---

١ ۔شخصی انٹرویو۔بذریعہ میل۔بتاریخ:6-5-2013

٢ ۔شخصی انٹرویو۔نواب سکندر علی خان۔بتاریخ۔15-6-2013

باب دوم

عابد معز بحیثیت
طنز و مزاح نگار

ڈاکٹر عابد معز بحیثیت طنز و مزاح نگار

ڈاکٹر عابد معز کی ادبی شخصیت کے ہمہ جہت پہلو ہیں وہ بہ یک وقت کالم نگار، انشائیہ نگار، افسانہ نگار اور طبی و سائنسی مضمون نگار کے علاوہ ممتاز طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔ دراصل ادبی دنیا میں انھوں نے ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ہی قدم رکھا۔ ان کی بیشتر ادبی تحریروں میں طنز و مزاح کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

انھوں نے اسکول کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کا پہلا فکاہیہ مضمون ''لائبریری میں چند گھنٹے'' کے عنوان سے نوجوانوں کا صفحہ روزنامہ رہنمائے دکن، حیدرآباد 28 مارچ 1973 کو شائع ہوا تھا۔ باقاعدگی سے لکھنے کا سلسلہ ماہنامہ شگوفہ مارچ 1981ء سے ہوا۔

ایک جگہ عابد معز مزاح نگاری کی ابتداء کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لکھنا دسویں جماعت یعنی 1970ء سے شروع کیا لیکن چھپانے کا مہورت سات سال بعد 1977ء میں حیدرآباد کے مقامی روزنامہ ''رہنمائے دکن'' میں دو مضامین چھپے۔ اتنی مسرت ہوئی کہ چار سال تک خوش ہوتا رہا اور اس خوشی میں میں نے ایم بی بی ایس کی ڈگری بھی حاصل کرلی۔ باقاعدگی سے لکھنے اور شائع ہونے کا سلسلہ مارچ 1981ء میں ماہنامہ شگوفہ سے شروع ہوا۔ نامور مزاح نگار جناب مسیح انجم نے شگوفہ اور مدیر شگوفہ سے میرا تعارف کروایا تھا تب سے ہندو پاک اور سعودی عربیہ کے مختلف رسائل اخبارات اور جریدوں میں شائع اور ڈائجسٹ ہوتا آرہا ہوں۔[1]

ان کی طنز و مزاح تحریروں میں کالم اور مضمون کے علاوہ افسانے بھی ہیں۔ ان تمام تحریروں میں عابد

---

[1] خاکہ بقلم، اپنے منہ میاں مٹھو، ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر، ص 81

معز نے جا بجا طنز و مزاح سے کام لیا ہے۔

مزاح دراصل اس شگفتہ کیفیت کا نام ہے جو زندگی اور ماحول کی ناہمواریوں اور بے ربطیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک مزاح نگار گرد و پیش کے ماحول کی ناہمواریوں اور بے قاعدگیوں کو دریافت کرتا ہے اور انھیں ہمدردانہ شعور کے ساتھ فنکارانہ انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری خندہ زیر لب کی کیفت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

بقول اسٹیفن لی کاک کے:

> مزاح کیا ہے؟ یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے۔ [1]

اس طرح طنز سے مراد زندگی کے تضاد، اس کی زیادتیوں اور بے انصافیوں پر غم و غصہ کا اظہار ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا طنز کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> طنز جو بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور احساس اور دردمند انسان کے ذہنی ردعمل کا نتیجہ ہے جس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختہ مشق بنایا ہو۔ [2]

غرض طنز زندگی کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں پر احساس اور دردمندانہ انسان کی ذہنی ردعمل کا نتیجہ ہے۔ عابد معز کی تحریروں میں طنز و مزاح کی یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ جیسا کے ذکر آچکا ہے کہ ایک طنز و مزاح نگار اپنے گرد پیش کے ماحول کی ناہمواریوں اور بے قاعدگیوں، زندگی کے تضاد اس کی زیادتیوں و بے انصافیوں کو کبھی ہمدردانہ شعور کے ساتھ مزاح کا نشانہ بنایا ہے تو کبھی غم و غصہ کا اظہار کرتا ہے۔ عابد معز نے بھی اپنے گرد و پیش کے ماحول کی ناہمواریوں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کے پیچھے اصلاح کا جذبہ ہے یوں تو انھوں نے اپنی فکاہیہ تحریروں میں اپنے عہد کی بے شمار ناہمواریوں کو اپنے طنز و

---

[1] اردو ادب میں طنز و مزاح، وزیر آغا، ص 47

[2] اردو ادب میں طنز و مزاح وزیر آغا، ص نمبر 56

مزاح کا موضوع بنایا ہے لیکن یہاں ان کے چند اہم موضوعات کا تجزیہ کیا جارہا ہے۔جن کے مطالعہ سے بلاشبہ ہم انھیں عصر حاضر کے بلند پایہ مزاح نگاروں میں شمار کرسکتے ہیں۔ان کے اہم موضوعات جیسے مہنگائی، بڑھتی ہوئی آبادی، محکمہ برقیات، ایرانڈیا، معاشرے کی اخلاقی گراوٹ ، بم سازی، اسلام مخالف، مغربی معاشرے کی تقلید، جنگ، دہشت گردی، یورپ اور امریکہ، اردو زبان ،انگریزی زبان، شعروشاعری، نقاد، مزاح نگاری، سماجی کردار، ڈاکٹر، دواخانوں کی صورتحال، پولیس، درزی، حجام، شوہر، بیوی، نوجوانان، وغیرہ۔

مہنگائی:

مہنگائی ایک معمہ ہے حل ہی نہیں ہوتا جو مسلسل اور مستقل بڑھتا جارہا ہے۔اس سے انسانی زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہے۔مہنگائی سے معاشرے میں مختلف برائیاں ابھر رہی ہیں۔مثلاً بے ایمانی، حرام خوری، رشوت خوری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی وغیرہ۔یہ آئیڈیل معاشرے کے لیے بدنما داغ ہے۔چنانچہ عابد معز نے ماضی اور حال کی روشنی میں بڑھتی ہوئی مہنگائی کا اس طرح جائزہ لیا ہے۔لکھتے ہیں

> دلی کے خواجہ حسن نظامی کے الہ آباد کے پہنچنے پر اکبرالہ آبادی کے بازار سے دو پیسے کی روٹی اور ایک پیسے کا کباب منگوا کر کھلایا تھا۔
>
> ایک زمانہ تھا جب ہاتھ کی گھڑی کی قیمت میں مہینہ بھر کا راشن خریدا جاتا تھا۔ ایسے دوسری کئی اشیاء کھانے کے مقابلے میں سستے دام مل جاتی ہیں۔ایک وقت کے کھانے کے بدلے میں بہترین جوتا یا ٹی شرٹ دستیاب ہوجاتا ہے۔چائے کی قیمت میں ٹائی یا موزے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔آئیسکریم کے دام میں ریڈیو مل جاتا ہے۔ٹھنڈے مشروب کے ساتھ دھوپ کی عینک مفت ملتی ہے اور تو اور فایو اسٹار ہوٹل میں ایک وقت کھانے کی قیمت میں شاندار سوٹ بنوایا جاسکتا ہے۔‘‘[1]

---

[1] دو پیسے کی روٹی ایک پیسے کا کباب، اعتماد۔بتاریخ 29/اکتوبر 2007ء

دورِ حاضر میں مہنگائی کا اصلی سبب پٹرول ہے۔ کیوں کہ پٹرول اور ڈیزل کے دام کے ساتھ ہی دوسری اشیاء کی قیمتیں طے ہوتی ہیں۔ جیسے ہی پٹرول کے دام بڑھ جائے تو تمام اشیاء کے دام اپنے آپ بڑھنے لگتے ہیں۔ چنانچہ عابد معز کا خیال ہے کہ پٹرول کی مہنگائی سے زندگی گراں اور موت سستی لگتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> غرض یہ کہ پٹرول کے دام بڑھنے سے چہار طرف مہنگائی مہنگائی ہوتی ہے۔ زندگی بھی بہت مہنگی ہو جاتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہماری رگوں میں خون کے بجائے پٹرول دوڑتا ہے۔ جب وہ مہنگا ہوتا ہے تو زندگی گراں ہوتی ہے موت سستی ہوتی ہے۔[1]

جس طرح پٹرول ہماری زندگی کے لیے ناگزیر ہو چکا ہے اسی طرح پکوان گیس بھی یہی صورت ہے۔ عابد معز پکوان گیس کی روز بہ روز بڑھتی ہوئی قیمت کے سبب پکوان گیس کو آنسو گیس کے مماثل قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> پکوان گیس کی قیمت ادا کرتے وقت خواتین کی حالت قابل دید ہوتی ہے۔ انھیں دن دھاڑے لٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ میری بیگم پکوان گیس کو آنسو گیس کے مماثل قرار دیتی ہیں کہ قیمت ادا کرتے ہوئے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ پکوان گیس پر اشک بہانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ ہم ترقی پذیر ہیں۔ اب واپس گھاس پوس اور لکڑی کے چولھوں پر لوٹ نہیں سکتے۔''[2]

عابد معز کا خیال ہے کہ پٹرول، پکوان گیس کے بعد مہنگائی کا ایک سبب گلوبلائزیشن بھی ہے۔ گلوبلائزیشن کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ غریب ممالک میں مہنگائی کو بلندی تک لے جاتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں مہنگائی کو نیچے اترنے نہیں دیتی اور ترقی یافتہ ممالک میں مہنگائی کو اوپر چڑھنے نہیں دیتیں بلکہ نیچے

---

[1] پٹرول کی خوشبو، اردو میگزین، 27 اکتوبر 2000

[2] ۔ میں ہر آنسو پونچھوں گا، اعتماد۔ 29 ؍مئی۔ 2006ء

کھینچتی ہے چنانچہ گلوبلائزیشن کے ذریعہ بڑھتی ہوئی مہنگائی کا محاسبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

گلوبلائزیشن اردو شاعری میں رباعی کی طرح ہے۔ رباعی میں سمندر کو کوزے یعنی چار مصرعوں میں بند کیا جاتا ہے۔اسی طرح گلوبلائزیشن میں ساری دنیا کو ایک چھوٹے سے گاؤں میں سمودیا جاتا ہے۔

گلوبلائزیشن دودھاری تلوار کی طرح ہے اس سے فائدے بھی ہوں گے اور نقصانات بھی۔ فائدے گنوانے والے گلوبلائزیشن کے گن گاتے نہیں تھکتے کہ گلوبلائزیشن کے گھوڑے پر سوار ہوکر دنیا ترقی کی نئی راہیں ڈھونڈے گی گلوبلائشین سے غربت کا خاتمہ بھی ہوگا (یہ غربت بھی بڑی عجیب شے ہے انسان کا ہر اقدام غربت کے خاتمہ کے لیے ہوتا ہے وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں غربت کو مٹانے میں صرف کردیتا ہے۔اس کے باوجود غربت جیسے تھی ویسے ہی ہے۔ یہ بڑی سخت جان لگتی ہے معلوم نہیں گلوبلائزیشن کس طرح اس کا خاتمہ کرے گی۔ ہوسکتا ہے کہ غریب ملکوں میں ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنی موجودگی سے انھیں عبرت دلائیں اور انھیں دولت مند بننے کے لیے اکسائیں)

گلوبلائشین کو فروغ دینے والے ادارے آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور نمومل ممالک ہمیں قرض دیں گے اور ہم قرض کے دلدل میں دھنستے چلے جائیں گے۔ امیر امیر تر اور غریب، غریب تر ہوں گے۔اسی لیے بعض ماہرین کو گلوبلائزیش، انفلکشن، ہائپر ٹینشن قسم کی بیماری لگتی ہے۔ یہ مرض غریب ملکوں کو لاحق ہوتا ہے اس کی اہم وجہ جدید ٹیکنالوجی ہے۔ یہ بیماری ترقی یافتہ ممالک پھیلا رہے ہیں جس کا تدارک ضروری ہے۔[1]

عابد معز کا خیال ہے کہ عالمی مارکٹ میں روپیہ کی قدر و قیمت میں کمی کی وجہ سے ہمارے ملک میں مہنگائی ہر دم بڑھتی جارہی ہے۔لہٰذا اس صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں

---

[1] گلوبلائزیشن کی صدی، اردومیگزین، اشاعت 20 جولائی 2001ء

> ہر ماہ ایک روپیہ زیادہ کی رفتار سے مہنگائی بڑھ رہی ہے یہ تو کچھ بھی نہیں ہے،
> ایک صاحب کہنے لگے پچھلی چھٹی پر میں دوکان سے چاول کا نمونہ لے گیا۔خرید
> نے واپس آیا تو قیمت میں دس روپوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ [1]

یہ حقیقت ہے کہ مہنگائی کے دور میں زندگی کے سفر کو منزل مقصد تک پہنچانے کے لیے ڈھیر ساری دولت چاہیے۔غربت اور نادار لوگ اپنا خون پسینہ یکجا کرنے کے باوجود ان کی زندگی میں آسودگی نہیں ہے بلکہ ایک کے بعد دیگر مصیبت غریبوں کے آشیانوں پر بڑی مسرتوں اور ارمانوں سے ڈیرے جمائے بیٹھی رہتی ہیں۔بعض لوگ مہنگائی کی مار سے بچنے اور چند دن خوشیوں کے لمحے دیکھنے کے لیے مجبوراً اپنے جسموں کے اعضاء بیچنے پر مجبور ہو رہے ہیں چنانچہ مہنگائی سے متاثر صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے عابد معز نے مہنگائی پر طنز کے تیر چلائے ہیں:

> ''غریب اور نادار لوگ عرصہ دراز سے اپنا پسینہ فروخت کرتے آرہے تھے وہ
> خون بیچنے کے لیے مجبور ہوئے اور اب گردہ فروخت کرنے پر آمادہ ہیں۔ وہ تو
> مالک کا کرم ہے کہ اس نے دو گردے دیئے ہیں۔ایک اپنے لیے رکھ کر دوسرا
> فروخت کیا جا سکتا ہے۔اگر دل کی طرح ایک ہی گردہ ہوتا تو غریبی دور کرنے کا
> یہ ایک موقع نہیں مل سکتا تھا''۔ [2]

بڑھتی ہوئی آبادی

بڑھتی ہوئی آبادی پوری دنیا کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی سے بے شمار مصائب وآلام پیدا ہوتے ہیں جس سے آنے والی نسل کو دانا پانی مہیا کرنا مشکل ہو جائے گا اور رہنے کے لیے جگہ نہیں مل پائے گی۔ایسے خیالات کا اظہار ماہرین برسوں سے کر رہے ہیں جب کہ عابد معز اس کے برخلاف رائے رکھتے ہیں ان کے مطابق خالق کائنات نے انسان کو حیرت انگیز دماغ سے نوازا ہے۔اسکے

---

[1] بڑھتی کا نام مہنگائی، اردو نیوز، 9 ستمبر 1996ء

[2] ۔گردہ کاروبار،اعتماد۔25رفروری۔2008ء

استعمال سے ہر آنے والے مصائب والآم وقت بہ وقت حل ہوتے گئے اور ہوتے جا رہے ہیں۔ انسانی عقل نے سبز انقلاب وسفید انقلاب کے ذریعہ بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ بھرا تو مواصلاتی انقلاب سائنسی ترقی نے انسانی زندگی کو اور زیادہ آسان بنا دیا۔ چنانچہ ایسے ماہرین کے خیالات پر ضرب کاری کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ماہرین کہتے ہیں کہ آبادی میں بے تحاشہ اضافہ بھی کسی دھماکے سے کم نہیں ہے۔ آبادی میں اضافہ سے ہمیں بے شمار مصائب اور آلام کا سامنا ہے۔ نئے لوگوں کو دانہ پانی مہیا کرنا بہت مشکل ہے۔ رہنے کے لیے جگہ نہیں ملتی یہ باتیں اس وقت سے دہرائی جا رہی ہیں جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ ہوش سنبھالا تو مستقبل کے تعلق سے میں ڈرا اور سہا ہوا تھا۔ ماہرین اعداد وشمار پیش کرکے اور مختلف سروے کرکے الگ پریشان کرتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ جب میں بڑا ہوں گا تو اس وقت مجھے بھوکا رہنا پڑے گا۔ زمین پر ہم ہی ہم ہوں گے۔ لوگوں کو پرے ہٹا کر خاک وطن کا دیدار کرنا پڑے گا۔ نوکری نہیں ملے گی۔ زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں مزے میں ہوں۔ اپنے لیے جگہ خود بنائی ہے اپنی روزی خود کماتا ہوں۔ زندگی سے پریشان نہیں ہوں بلکہ زندگی سے لطف اٹھاتا ہوں۔ دراصل ایسی باتیں کرنے والے نادان لوگ بھول جاتے ہیں کہ ہر انسان اپنے ساتھ ایک حیرت انگیز دماغ لے آتا ہے جو کسی بھی قسم کا انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انسانی دماغوں نے سبز انقلاب اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے ذریعہ زندگی کو آسان بنا دیا اور کائنات کو مسخر کر لیا۔ رہنے کے لیے دنیا اگر تنگ ہوگی تو ہم چاند پر جائیں گے۔ [1]

تحدید آبادی کے نظریات ''تھامس مالتھس'' پہلا ماہر تھا جو عقلی دلائل کی بنیاد پر شماریات اور ریاضی

---

[1] تو ہم ایک ارب ہو گئے۔ اردو نیوز، 2 جون 2000۔

کے فارملوں کے تحت آبادی کے بڑھنے کو انسانیت کے لیے زبردست خطرہ قرار دیا۔اس نے دنیا کے سامنے ایک سوالیہ نشان کھینچا کہ آبادی بڑھ رہی ہے اور قدرتی وسائل کم ہو رہے ہیں۔

تھامس مالتھس کے نظریہ نے عالم انسانیت پر ایک زبردست اخلاقی بحران کو جنم دیا، آبادی کو کم کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے اس سے اخلاقی ضابطے ٹوٹے اور معاشرے میں انتشار پیدا ہوا۔ دراصل ناکافی غذا کا اصلی سبب بے تحاشہ آبادی نہیں بلکہ خالق کائنات نے انسان کو جو حیرت انگیز عقل و دماغ دیا ہے اس کے استعمال کی کمی اصل سبب ہے۔آج انسان اپنے دماغ استعمال کرتے ہوئے سائنس وٹکنالوجی میں اتنی ترقی کر چکا ہے کہ سوچتے ہوئے احساس کے پر جلنے لگتے ہیں، کائنات نسل آدم کے سامنے مسخر ہوتی جا رہی ہے۔ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے سیاست دان اور ان کے ماہرین تغذیہ ہمیشہ بے تحاشہ آبادی کے مصائب بیان کرتے تھکتے نہیں۔مثلاً آنے والے نئے لوگوں کو دانہ پانی مہیا کرنا دشوار ہوگا رہنے کے لیے زمین تنگ ہوگی تعلیم دینا تعلیم کے بعد نوکری فراہم کرنا مزید مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔اس کے برخلاف معروف مصنفہ الزبتھ لیاگس، نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ گزشتہ دوصدیوں میں یورپ اور امریکہ کی ترقی اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کی مرہون منت ہے۔یہی تجزیہ فرانس اور جاپان کے ماہرین نے بھی پیش کیے ہیں۔

آبادی میں اضافے کے کئی فائدے ہیں جس کی جیتی جاگتی مثال خود ہمارا ملک ہندوستان ہے۔ یہاں دنیا کی دوسری بڑی آبادی ہے اس کے باوجود آج ہمارا ملک دنیا والوں کو مین پاور یعنی سائنس داں، انجینئرس ڈاکٹر اور دیگر ماہرین سپلائی کرنے والوں میں سرفہرست ہے۔ڈاکٹر عابد معز اپنے مضمون تو ہم ایک ارب ہو گئے، میں طنز و مزاحیہ انداز سے ان ماہرین کا بھرپور جواب دیا ہے۔

> ’’آبادی میں اضافے کے کئی فائدے ہیں۔سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ انسانوں کی کبھی قلت نہیں ہوتی۔ بھلے ہی انا سنوں کی افراط کے سبب دوسری اشیاء کی قلت ہو جائے دنیا میں خاصی تعداد ایسے ملکوں کی ہے جہاں انسانوں کی

قلت ہے۔ ہندوستان ان کی مدد کرتے ہوئے چند مسائل بھی حل کر لیتا ہے۔ دنیا کے تقریباً مما لک میں ہندوستانی نژاد باشندے پائے جاتے ہیں۔ خطہ زمین پر کہیں بھی جایئے وہاں آپ کی ملاقات ہم سے ضرور ہوتی ہے اس لیے کہ دنیا کا ہر چھٹا فرد ہندوستانی ہے۔ غیر مصدقہ اطلاع کے مطابق جب نیل آرمسٹرانگ نے چاند پر قدم رکھا تو ان کا استقبال ہندی چینی نے کیا تھا۔ وہ لوگ ایک دوسرے کے اوپر کھڑے ہو کر چاند میں پہنچے تھے۔

مین پاور سپلائی کرنے والوں میں ہندوستان سرفہرست ہے۔ خلیج کی مثال لیجئے یہاں کے سبھی مما لک میں ہندوستانی سرفہرست ہیں ہمیں خلیج کی صرف اور صرف آبادی میں اضافہ کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ ہم دوسروں کو ان کی تشفی اور ضرورت کے مطابق تیار انسان مہیا کرتے ہیں۔ کسی ملک کو سائنسدانوں کی ضرورت ہے تو ہمارے سائنسداں حاضر ہیں۔ انھیں لیجئے اور اپنے ملک کو دنیا کی ترقی یافتہ ملک بنایئے۔ کسی کے پاس علاج معالجہ کے لیے ڈاکٹر کم ہیں تو ہمارے ڈاکٹر پیش خدمت ہیں۔ کسی ملک کی تعمیر کے لیے انجینئر درکار ہیں تو ہمارے انجینئر لائن میں کھڑے ہیں۔ دورِ حاضر کمپیوٹر اور آئی ٹی کا دور ہے جناب والا ان ماہرین کی وافر سپلائی کرنے کے لیے بھی ہم تیار ہیں۔ اگر کسی کو صرف انسان چاہئے تو وہ بھی ہمارے یہاں مل جاتے ہیں۔ ہم دیگر مما لک کو اتنی تعداد میں ماہرین اور انسان فراہم کرنے لگتے ہیں کہ بعض مرتبہ اپنے ہی ملک میں ان کی قلت ہو جاتی ہے۔ ایسی صورتحال سے ہم دل برداشتہ نہیں ہوتے۔ ان کی جگہ پر کرنے کے لیے ہر دن ہمارے ملک میں ۴۳ ہزار سے زائد انسانوں کا اضافہ ہوتا ہے''۔ [1]

عابد معز نے نسل آدم کے خلاف لکھنے والے اور تیسری دنیا کے مما لک خصوصاً ہندوستان، پاکستان،

---

[1] ۔ تو ہم ایک ارب ہوئے، اردو میگزین، 2 جون 2000

بنگلہ دیش وسری لنکا وغیرہ کے رہنماؤں پر بھی گہرا طنز کیا ہے۔ جو اپنے تعلیم یافتہ ماہر اور قابل انسانوں کو ترقی یافتہ ممالک کو دیوداسیوں کی طرح بھیج کر غربت کا رونا روتے ہیں، ترقی یافتہ ممالک ان قابل ماہرین انسانوں کو اپنی حکمت عملی اور ریاکاری سے ان کو اپنی جھولی میں سمیٹ لیتے اور ہجوم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ افسوس کے اس تعلق سے ہمارے رہنماؤں کے پاس کوئی خاص حکمت عملی و دور اندیش پالیسی نہیں لیکن پھر بھی ہمارے رہنماء ترقی یافتہ ممالک کے ماہرین اور سیاست دانوں کے نعروں میں شامل ہو کر یوں شیخی بگھارتے ہیں جیسے اب دنیا کو اٹم بم سے خطرہ ہے نہ ہی ہائیڈروجن بم سے ہم کو صرف اور صرف آبادی کے بم سے خطرہ لاحق ہے۔ ڈاکٹر عابد معز ملک کے پالیسی ساز ورہنماؤں پر گہرا طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ترقی یافتہ ممالک کثیر آبادی والے ان ملکوں سے ماہر اور قابل انسان تو چن لیتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ زید لا ولادوں کا پیدا ہونا بہت مشکل ہے ہر انسان لائق اور قابل نہیں پیدا ہوتا۔ کئی عام لوگ آتے ہیں تب کہیں کوئی لائق اور فائق شخص پیدا ہوتا ہے۔ بہترین اشخاص کو تو ترقی یافتہ ممالک اپنے ملک کی ترقی کے لیے اکٹھا کر لیتے ہیں اور ہجوم کو چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ان کی اس ضرورت کو پورا کرتے رہیں۔

طرفہ تماشا ہے کہتے ہیں کہ تیسری دنیا کے ملکوں کے لیے بڑھتی آبادی ایک سنگین مسئلہ ہے زیادہ آبادی سے غربت میں اضافہ ہوتا ہے۔ غربت کے اپنے کئی مسائل ہیں لوگ زیادہ ہوں تو تعلیم کے مواقع کم ملتے ہیں۔ بے روزگاری کی شرح زیادہ ہوتی ہے؟''۔ [1]

آج سائنس وٹیکنالوجی کی مدد سے غذائی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت کرۂ ارض پر انسانوں کے لیے ضرورت سے زیادہ غذا موجود ہے۔ ماضی میں بھی لوگ بھوکے تھے۔ جب کہ آبادی کم تھی اور آج بھی زیادہ غذا کی موجودگی میں بھی لوگ بھوکے ہیں بلکہ اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ایسی صورت

---

[1] ۔ آبادی کا بم، اردو میگزین، 11 اگست 2000ء

حال کا محاسبہ کرتے ہوئے عابد معز فرماتے ہیں:

''ناکافی غذا کو بھوک کی وجہ بتایا جاتا ہے۔ دنیا میں بڑھتی ہوئی آبادی پر ماہرین سینہ کوبی کرتے تھے کہ کھانے والے زیادہ ہو رہے ہیں اور کھانا کم ہو رہا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب ہمیں ایک دوسرے کو کھانا پڑے گا۔ ماہرین کے خدشے اور وسوسے دھرے رہ گئے۔ تیس برس پہلے دنیا کی آبادی اور درکار غذا کے درمیان توازن حاصل ہوا۔ سب کا پیٹ بھرنے کے لیے غذا میسر آئی۔ یہی نہیں تب سے غذائی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور اب کرہ ارض پر ہمارے لیے زیادہ غذا موجود ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ دنیا میں ضرورت سے سترہ فیصد زیادہ غذا موجود ہے۔ ہمارے درمیان دکھائی دینے والے موٹے لوگ اس بات کا ثبوت ہیں حیرت ہوتی ہے کہ زیادہ غذا کی موجودگی میں بھوک نہ صرف برقرار ہے بلکہ اس میں اضافہ بھی ہو رہا ہے''۔

دواخانوں کی صورت حال

دور حاضر کے دواخانوں کی صورت حال بھی نہایت پرشکوہ ہوتی جارہی ہے۔ ان دواخانوں میں امراض بڑے قیمتی ہو چکے ہیں۔ معمولی پیٹ کی گڑبڑ کئی معائنے اور ایکسروں کی ضروت پڑتی ہے۔ حکومت کی لاپروائی سے سرکاری دواخانے گویا ہاسپتال نہیں صرف مفت مسافر خانے معلوم ہوتے ہیں ہاں لوگ زندہ جاتے ہیں اور مردہ واپس آتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز دواخانوں کی اس بدلتی ہوئی صورتحال پر گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ جیسے حیدرآباد کا سرکاری دواخانہ نیلوفر جہاں غریب والدین بھی اپنے بچوں کو اس دواخانہ میں علاج کروانا پسند نہیں کرتے ایک جگہ عابد مز نے شاعر اور پولیس کے حوالے سے نیولر فر ہسپتال کی تصویر کشی اس طرح کی ہے لکھتے ہیں:

خدا کے واسطے آہستہ بولو۔ شاعر مجھے ڈانٹا۔ ابھی اس قسم کا خیال ہماری پولیس

۱؎ ۔ بھوک مار گولی، اعتماد۔ 27 / اگسٹ ۔ 2007ء

کے ذہن میں نہیں آیا۔ اگر وہ سن لے گی تو بچوں کو مخصوص پنگوڑہ پر بھی بٹھانے کی
پاداش میں جرمانہ وصول کیا جاسکتا ہے۔ بچوں کی زندگی کو خطرہ میں ڈالنے کا حق
والدین کو نہیں ہے۔ یہ کام شہر کے نامور بچوں کا دواخانہ نیلوفر ہسپتال کے ذمہ
ہے"۔ [1]

سرکاری دواخانوں کی خراب کارکردگی سے خانگی دواخانے زور وشور سے پنپ رہے ہیں۔ ڈھیر ساری دولت سمیٹنے کی کوشش میں آئے دن نئے اور الگ انداز میں اشتہارات دیکر مریضوں کو اپنی جانب راغب کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ مریض بھی ڈاکٹروں سے ڈسکاؤنٹ مانگنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز نے رشوت خور مریضوں اور اشتہاری دواخانوں کے طریقہ کار کو گہرے دکھ درد کے ساتھ یوں بے نقاب کیا ہے۔

"طبی اخراجات زیادہ بلکہ بے تحاشہ زیادہ ہونے کے سبب اب لوگ باضابطہ علاج کے لیے بھاؤ تاؤ کرنے لگے ہیں۔ اگر میں آپ کے پاس بائی پاس آپریشن کرواؤں تو آپ کتنا ڈسکاؤنٹ دیں گے۔ اگر میں ڈاکٹر کے تجویز کردہ مختلف معائنے آپ کی لیبارٹری میں کراؤں تو کیا آپ میری بیگم کے خون میں شکر مفت معلوم کریں۔ ایک صاحب کے تین بچے چشمہ پہنتے ہیں۔ وہ دو چشموں کی قیمت میں ایک چشمہ مفت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لوگوں کے مطالبات دیکھ کر اب دواخانے بھی مختلف آفرز دیتے اور اسکیم پیش کررہے ہیں۔ ہمارے پاس انجیوگراف کروائیے اور مفت دانت صاف کروانے کا کوپن پائیے۔ بائی پاس آپریشن کے ساتھ آنکھوں کا معائنہ مفت! ذیابیطس کے مریضوں کے لیے سال بھر خون کی جانچ کا پیکیج۔ دادا کے پراسٹیٹ غدود کے آپریشن کے ساتھ پوتے کی ختنہ فری۔ ڈلیوری کے ساتھ خاندانی منصوبہ بندی آپریشن مفت۔ موتیا نکوالیئے اور چشمہ مفت پائیے۔ اس قسم کے آفرز میں نے اشتہارات میں پڑھا ہے۔ آپ کی نظر

---

[1] ۔ گھر سے نکلنا محال ہے، اعتماد۔ 25/ڈسمبر۔ 2006ء

سے بھی گزرے ہوں گے''۔ ۱؎

محکمہ برقی

برقی ہماری زندگی کی اہم ضرورت ہے۔اس کا استعمال مختلف طریقوں سے ہر گھر میں ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں محکمہ برقی ایک ایسا ادارہ ہے جو اپنے صارفین سے کبھی ہمدردی نہیں دکھاتا۔اس کے سامنے امیر،غریب اور شریف بدمعاش سب بے بس نظر آتے ہیں اس محکمہ کی پالیسی دیگر محکومات سے الگ ہے۔ ایک شخص کسی کمپنی سے زیادہ مقدار مین اشیاء خریدیتا ہے تو کمپنی کی جانب سے طے شدہ شرح سے کم دام میں ملتا ہے لیکن برقی محکمہ میں جتنی زیادہ برقی استعمال کریں گے یونیٹ کی شرح میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ بقایاجات اصول کرنے میں جس مستعدی اور تندہی کا رویہ اختیار کرتا ہے برقی سر براہی کرنے میں اور کیفیت نظر آتی نہیں ہے۔ڈاکٹر عابد معز محکمہ بجلی کی ان پالیسیوں کی خامیوں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بل اور بقایا جات وصول کرنے میں محکمہ برقی کا کوئی ثانی نہیں ہے خطرناک سے خطرناک قسم کا مہاجن بھی اس محکمہ کے سامنے ٹیوب لائیٹ کی طرح پھڑ پھڑاتا نظر آتا ہے۔اس محکمہ کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے صارفین کو سارقین سمجھتا ہے اور برقی چوروں کو پکڑنے کے لیے علیحدہ صیغہ و یجلنس بنا رکھا ہے۔ایسی مستعدی اور تندہی برقی سر براہی کرنے میں نظر نہیں آتی۔بجلی گھنٹوں غائب رہتی ہے۔وولٹیج میں اتنی اونچ نیچ ہوتی ہے کہ بعض مرتبہ ٹیلی ویژن یا فریج جل جاتا ہے۔بلب کا اڑنا تو معمول ہے''۔ ۲؎

عابد معز کا خیال ہے کہ محکمہ برقی کی شرحوں میں دن بہ دن اضافہ سے اس کے صارفین کی آنسو بہہ نکلتے ہیں، نینداڑ جاتی ہے۔انھیں ذلیل کرنے کے لیے صیغہ و یجلنس ہر دم تیار رہتا ہے۔چنانچہ محکمہ برقی کی اس صورتحال پر گہرا طنز کرتے ہوئے یوں روشنی ڈالی ہے۔لکھتے ہیں:

۱؎ ۔صحت مہنگی ہے،اعتماد۔6/اگست۔2007ء

۲؎ ۔گھر میں بھی چین کہاں،اعتماد۔15/جنوری۔2007ء

برقی نہ ہوتو گرمی اور اندھیرے میں آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ برقی ہوتو اس کے استعمال پر آنے والے بل کے خیال سے نیند اُڑ جاتی ہے۔ بل کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ برقی کوبجلی کیوں کہا جاتا ہے۔ برقی کا بل بجلی بن کر ہر مہینہ جو ہمارے اوپر گرتا ہے آج میرے گھر بجلی کا بل بیس برس پہلے گزیٹیڈ آفیسر کی تنخواہ سے دوگنا زیادہ آتا ہے۔ برقی کا صرف بل ہی ہمارے آنسونہیں نکالتا بلکہ بل وصول کرنے کا طریقہ اور ٹرانسکو کے دھاوے ہمیں ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے''۔ [1]

ایرانڈیا

عوام کی آمدورفت کا ایک اہم ذریعہ ہوائی جہاز ہے۔ہوائی جہاز کے ذریعہ دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے کیا جاتا ہے۔ایرانڈیا ہمارے ملک کا سرکاری ادارہ ہے۔اس ادارے کی بے شمار خوبیوں کے علاوہ کئی خامیاں بھی ہیں۔ عام طور پر ایرانڈیا کے جہاز ہمیشہ لیٹ اڑان بھرتے ہیں۔اگر مسافرین وجوہات معلوم کرنے جائیں تو ذمہ دار لوگ دفتر سے غائب ہوجاتے ہیں۔ یہ لوگ ایک یا دودن پہلے مسافرین سے سفر کے تعلق سے دریافت کر لیتے ہیں کہ آیا وہ سفر کریں گے لیکن فلائٹ لیٹ ہونے کی کوئی اطلاع نہیں دیتے۔عابد معزایرانڈیا کی اس خامی پر کاری ضرب لگاتے ہیں ہوئے لکھتے ہیں:

شام ساڑھے چھ بجے کی اڑان کے لیے مسافرین سامان سے لدے پھندے چار گھنٹے پہلے رپورٹ کرنے کے لیے ایرپورٹ پہنچے تو وہاں ایرانڈیا کے کرمچاریوں کو غائب پایا۔

آنے والے مشکلات کی یہ پہلی نشانی ہوتی ہے۔جس طرح طوفان کا اندازہ کرکے چوہے بلوں میں چھپ جاتے ہین۔اسی طرح ایرانڈیا کے کرمچاری ادھر ادھر غائب ہوجاتے ہیں......سیٹ بک کرتے وقت مسافر کے متعلق تفصیلات

---

[1] ۔میں ہر آنسو پونچھوں گا،اعتماد۔29/مئی۔2006ء

مکمل نام قومیت عمر اور رابطے کے لیے فون نمبر اکٹھا کیا جاتا ہے۔ دو ایک دن
پہلے فون کر کے سفر کرنے کے ارادے کے بارے میں دریافت بھی کیا جاتا ہے
لیکن جب فلائٹ دیر سے اڑنے والی ہوتی ہے تو کوئی اطلاع نہیں دی جاتی
ہے۔ انھیں شرم آتی ہوگی لیکن کرمچاریوں کے عمل سے ایسے محسوس نہیں ہوتا
ہے''۔ ؎۱

عابد معز کا خیال ہے کہ ایرانڈیا کی لیٹ اڑان سے کئی مسافروں کے ستارے گردش میں آجاتے ہیں۔ ایرانڈیا کی لاپروائی سے ہوائی مسافرین کی صورتحال کو یوں پیش کیا ہے:

''ایرانڈیا کی اڑانوں سے مسافروں کے ستارے گردش میں آتے ہیں۔ کالم
میں تم نے پڑھا ہی ہوگا کہ ایرانڈیا کے لیٹ اڑنے سے مسافروں کا نقصان ہوتا
ہے۔ ویزا ختم ہو جاتا ہے۔ کئی گھنٹے بلکہ دو ایک دن ضائع ہوتے ہیں۔ ڈیوٹی پر
دیر سے حاضر ہوتے ہیں۔ ایک دولھا میاں کو ایرانڈیا کی فلائٹ نے عقد کے
بجائے ولیمہ کے دن پہنچایا تو دونوں تقریبات کو ایک ساتھ انجام دینا پڑا تھا''۔ ؎۲

ایرانڈیا ہوائی سفر کا سرکاری ادارہ ہونے کے باوجود اتنا بدنام ہے کہ خود ہمارے ملک کے شہری ایر انڈیا میں سفر کرنے کے لیے کتراتے ہیں اس کی کئی وجوہات ہیں، فلائٹ لیٹ ہونے پر ایرانڈیا کے دفتری لوگ کچھ ڈرامے بھی رچاتے ہیں۔ اس خامی کو طنز و مزاح کا ہدف بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس دوران ایک اعلان نشر ہوا۔ کرپیا دھیان دیں۔ حیدرآباد جانے والی
امینہ بی نامی یاتری ہوائی اڈہ کے کسی کرمچاری سے سمپرک کریں۔
اعلان سن کر ایک صاحب نے خیال ظاہر کیا۔ جہاز مزید لیٹ کرنے کے
لیے ڈرامہ شروع ہو رہا ہے۔ دوسرے صاحب نے بتایا۔ حیدرآباد جانے والی ایر
انڈیا کی ہر فلائٹ میں ایک امینہ بی ہوتی ہے جو عین وقت پر گم ہو جاتی ہے۔

؎۱ ۔ آشا ہے کہ پھر آپ کو ستانے کا موقع ملے گا، اعتماد۔ 24 سپٹمبر 2007ء
؎۲ ۔ ''چک دے ایرانڈیا'' اعتماد۔ 12/ نومبر۔ 2007ء

تیسرے صاحب نے تجویز رکھی۔حیدرآبادی ایمنہ بی مشہور ہے۔ہم انہیں تلاش کرتے ہیں۔اگر وہ انہیں ملیں تو ہم حیدرآباد نہیں جاسکیں گے''۔ ا؎

معاشرے کی اخلاقی گراوٹ

دور حاضر کا معاشرہ دولت وثروت و مادی مفادات کی بنیاد پر قائم ہے۔اس لیے انسانیت مائل بہ زوال ہے۔انسانیت کا یہ زوال وانحطاط اسلحہ کی دوڑ سے بھی زیادہ خطرناک سمجھا جاسکتا ہے۔کیونکہ اسلحہ سے ساری انسانیت کو چند لمحوں میں نیست ونابود کر دیا جاسکتا ہے۔لیکن انسانیت کا انحطاط وزوال غیر محسوس طور پر دنیا کو بتدریج تباہی کے دہانے پر پہنچاتا ہے۔عابد معز نے اخلاقی گراوٹ کے چند نمونے جیسے رشتوں کی اہمیت میں کمی۔جنسی خواہشات کا بول بالا۔غنڈا گردی،رشوت کو تحفے کی شکل میں دینا لینا۔تہذیب کی پامالی،قانون پر سیاست کا اثر۔لڑکی کی پیدائش پر ناراضگی۔تہمت پرستی وغیرہ پیش کئے ہیں۔آج کا انسان ترقی کے ساتھ ساتھ اپنی قدر و منزلت کھوتا جارہا ہے۔چند سکوں کے عوض زندگی ختم کی جارہی ہے۔معمولی بات پر ایک دوسرے کی جان لی جارہی ہے۔آئے دن جرائم میں اضافہ کے سبب انسانیت امن وچین اور سکون واطیمنان کے لیے سرگرداں ہے۔چنانچہ معاشرے میں اس غیر اخلاقی فعل پر روشنی ڈالتے ہوئے عابد معز فرماتے ہیں:

> ''ترقی کے ساتھ انسان اپنی وقعت کھونے لگا ہے۔جرائم میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔چند سکوں کے عوض زندگی ختم کی جارہی ہے۔معمولی بات پر ایک دوسرے کی جان لی جارہی ہے۔نام پوچھا۔نام پسند نہ آیا اور کام تمام کیا۔جلد کا رنگ اور بالوں کا انداز دل کو نہ بھایا تو مار کر ہی سکون پایا۔جہیز نہ لانے پر زندہ جلا دیا جاتا ہے۔نسل در نسل دشمنی چلی آتی ہے۔بعض لوگ موت کا کاروبار کرتے ہیں چند روپیوں کی سپاری لے کر اپنے ہی بھائی کو ٹپکا دیتے ہیں۔نشیلی دوائیں الگ انسانی زندگی کی درپے ہوتی جارہی ہیں۔نشہ میں چور لوگ اپنا اور دوسروں کا

ا؎ ۔آشا ہے کہ پھر آپ کو ستانے کا موقع ملے گا۔اعتماد 24 ستمبر 2007ء

جینا محال کرتے ہیں‘‘۔ ۱؎

عابد معز کے خیال کے مطابق آج کا انسان مختلف طریقوں سے دولت بٹور رہا ہے جیسے رشوت سے۔ نام کی سپاری سے، لیڈر بن کے اور کچھ ابن الوقت افراد فینانس کمپنیاں کھول کر محفوظ طریقے سے دولت بٹور رہے ہیں۔جس سے انسانیت کا بڑا اسیکٹر حصہ مائل بہ زوال ہورہا ہے۔معاشرے کی اس صورت پر یوں روشنی ڈالی ہے:

’’طاقت کے ذریعہ آسانی کے ساتھ دولت بٹوری جاسکتی ہے۔ بھتہ وصول کر کے لوگ پیسہ کماتے ہیں۔ پیسہ ڈر کر خود بخود چلا آتا ہے۔کسی کے نام کی سپاری لے کر بھی دولت کمائی جاسکتی ہے۔الیکشن جیت کر پیسہ حاصل کیا جاتا ہے۔ڈاکہ ڈال کر دولت لوٹنا پرانا طریقہ ہے۔ نئے زمانے میں فینانس کمپنیاں کھول کر محفوظ طریقے سے دوسروں کی دولت ہتھائی جاسکتی ہے‘‘۔ ۲؎

طب ہمارے نزدیک قدرومنزلت کا پیشہ ہے۔آج یہاں بھی مادہ پرستی کے اثرات ظاہر ہورہے ہیں چنانچہ ڈاکٹر عابد معز نے ڈاکٹروں کی اخلاقی گراوٹ کو اس طرح طنز کا نشانہ بنایا ہے:

’’ڈاکٹر صحت کے نگہبان بلکہ ٹھیکہ دار ہیں۔ وہ ہمیں ہشاش بشاش رکھنے کے لئے شب وروز بے تھکان بیماریوں سے لڑتے جارہے ہیں۔نئی دوائیں دریافت کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ گردے، آنکھ، دل، جگر اور دیگر اعضاء یوں بدل رہے ہیں جیسے ہندوستانی فلموں میں گانوں کے دوران ہیرو اور ہیروئین کپڑے تبدیل کرتے ہیں۔ بے ہوش مریض کو عرصہ دراز تک زندہ رکھتے ہیں۔ تنگ آکر رشتہ دار مریض کی زندگی کو ختم کرنے کی گزارش کرتے ہیں‘‘۔ ۳؎

سماج میں شعبہ تعلیم ایک مقدس پیشہ سمجھا جاتا ہے۔اُستاد اور شاگرد کے رشتہ کی اہمیت کون جھٹلاسکتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ایک مقدس رشتہ ہوتا ہے، لیکن مادہ پرست سماج نے اس مقدس رشتہ کو تاجر اور گاہک

۱؎ ۔’’اتفاق ہے کہ زندہ ہیں ہم‘‘ فارغ البال۔ص:۱۴۴

۲؎۔’’پیسہ کمانا آسان ہے‘‘اعتماد۔30/ اکتوبر۔2006ء

۳؎ ۔’’اتفاق ہے کہ زندہ ہیں ہم‘‘ فارغ البال۔ص:۱۴۲

میں تبدیل کر دیا ہے۔ غرض سماج کی اس مادہ پرستی پر عابد معز نے یوں طنز کیا ہے:

''ایک وہ دور بھی تھا، بات زیادہ پرانی نہیں ہے۔ جب علم حاصل کرنے کے لئے استاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا جاتا تھا۔ استاد کی خدمت کرنا شاگرد اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کی جوتیاں سیدھی کرتے تھے۔ مدرسہ برخاست ہونے کے بعد بچے استادوں کے گھر کا کام کیا کرتے تھے۔ کنویں سے پانی بھرتے درخت اور پودوں کو پانی دیتے اور سودا سلف لاتے تھے۔ استاد بھی بچوں سے ایسے ہی محبت سے پیش آتے تھے۔ شاگرد کو اپنے گھر کا فرد سمجھتے تھے اور اس کی مدد کے لئے ہر دم تیار رہتے تھے۔ لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ استاد اور شاگرد کے درمیان ایسا کوئی جذباتی رشتہ باقی نہیں رہا۔ شاید اگلے وقتوں کے لوگ عجیب تھے۔ دور حاضر میں اُستاد اور شاگرد میں تاجر اور گاہک کا رشتہ ہے استاد علم بیچتے ہیں طالب علم خریدتے ہیں۔ گھنٹوں کے حساب سے کاروبار ہوتا ہے۔ اسی لیے علم کا حساب (Credit hours) کریڈٹ اورس میں رکھا جانے لگا ہے''۔ [1]

بچوں کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے میں والدین کا پیش پیش رہنا اشداُ ضروری ہوتا ہے لیکن بعض والدین ایسے سخت گیر مزاج کے ہوتے ہیں کہ بچے اپنے والد کو دیکھتے ہی خاموش اور دور دور ہو جاتے ہیں۔ وہ والد سے بات کرنے کے لئے ماں کا سہارا لیتے ہیں۔ اور بعض والدین اپنے بچوں کے ساتھ دوستانا مزاج رکھتے ہیں۔ یہاں بچے اپنے والد کو باپ کم ہم عمر اور دوست سمجھ کر ان سے بے تکلف ہو جاتے ہیں جس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ عابد معز نے معاشرے کے بگڑنے کے اس سبب کی طرف یوں توجہ دلائی ہے۔ لکھتے ہیں:

''دوست قسم کے والد ہمارے یہاں عام ہیں روایتی قسم کے والد اپنی اولاد کے تعلق سے ''کھاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ'' والی بات پر یقین رکھتے

---

[1] ''علم کا بازار دیکھو'' اعتماد۔ جولائی۔ 2006ء

ہیں۔ایسے والد سخت گیر ہوتے ہیں ۔انہیں غصہ جلد اور پیار بہت دیر سے آتا ہے۔بچوں کی ماں سے توسط سے رہتا ہے۔بہت کم بچوں اور والد کا آمنا سامنا ہوتا ہے۔ایسے والد کو دیکھ کر ذہن میں ''مغل اعظم'' کی شبیہ ابھرتی ہے۔

دوست قسم کے والد دور حاضر کی پیداوار ہے۔ایسے لگتا ہے جیسے روایت سے انحراف کرتے ہوئے بعض لوگ دوست قسم کے والد بنتے ہیں۔ایسے والد اپنے بچوں کے ساتھ دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ان کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ دوست قسم کے والد کو ٹی وی اور فلموں کے ذریعہ پرموٹ کیا جاتا ہے۔ بچے دوست قسم کے والد کو بہت پسند کرتے ہیں۔بعض اوقات بچے والد کے کچھ زیادہ ہی بے تکلف دوست بن جاتے ہیں اور بے تکلفی میں یہ تک پوچھ بیٹھتے ہیں ڈیڈ جب آپ نے ممی کو پہلی بار دیکھا تو آپ کے دل نے کیا کہا تھا؟''۔ [1]

ترقی اور فیشن کے نام پر آج کا انسان اخلاقی قدروں سے دور اور بے حیائی سے قریب ہوتا جارہا ہے۔ بے حیائی نے لاکھوں خواتین کا نقاب اُتار دیا ہے تو مردوں کی نیتوں میں فتور آچکا ہے۔ عابد معز معاشرے کی اس بے حیائی کو اس طرح طنز کا نشانہ بنایا ہے:

''وقت کے ساتھ سر سے ٹوپی اور پگڑی اتر گئی۔ پلو ڈھل گیا۔اور اسکارف غائب ہوا۔ کھلے سر کا فیشن عام ہوا۔ برہنگی نے رواج پایا۔آج مرد و خواتین برہنہ سر رہتے ہیں خاص خاص موقعوں پر ہی مجبوراً سر کو ڈھانپا جاتا ہے۔بغیر ڈھانکے سر کو جب برہنہ کہا جاتا ہے تو پھر گنجا سر برہنگی کی انتہا ہے۔گنجے سر کو پردہ کرنے کے لیے بال تک نہیں ہوتے۔میرے ایک دوست اپنے سر کی عریانیت کو ہر دم ٹوپی سے چھپائے رکھتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ جھڑتے بالوں نے انہیں ٹوپی پہنائی تھی جواب تک ان کے سر پر جمی ہوئی ہے۔کسی نے بھی ان کے ننگے

---

[1] ۔''ایک دن ابو کا'' اردو میگزین ۔۱۴؍ جولائی ۲۰۰۰ء۔

سر کا دیدار نہیں کیا۔ حتیٰ کہ ان کی بیگم نے بھی موصوف کو بغیر ٹوپی نہیں دیکھا''۔

اخلاقی گراوٹ کی ایک وجہ فلموں کے ذریعہ جنسی خواہشات اور جرائم کی غیر معمولی تشہیر بھی ہے۔ جس کی وجہ سے ننھے طلباء وطالبات میں جنسی بے راہ روی اور تشدد کا رجحان تیزی سے بڑھتا جارہا ہے۔ یہ تمام باتیں ایک مہذب معاشرے کے لیے غیر معمولی اور باعث تشویش بھی ہے۔ اس صورت حال پر ڈاکٹر عابد معز فلمی گانوں کی تحریف کرتے ہوئے یوں روشنی ڈالی ہے:

''فلموں کی بدولت لو LOVE عام ہوئی ہے۔ وہ بھی محبت کرنے لگے ہیں جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔ ننھا اور ننھی دودھ کی شیشیاں ہاتھوں میں لے کر عہد و پیاں کر رہے ہیں۔ ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھائی جارہی ہیں۔ آ غوں......! آ غوں............!! ہم نہ کبھی ہوں گے جدا...... عمر کچھ بڑھتی ہے تو چاکلیٹ کھاتے ہوئے کمرے میں بند ہوجاتے ہیں اور چابی کھو جاتی ہے یا گانا گاتے ہوئے۔ چلو دلدار چلو، چاند کے پار چلو...... نو دو گیارہ ہوجاتے ہیں۔ پیار کرنے والے کبھی ڈرتے نہیں، بے باکی کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے''۔ ۲

معاشرے میں سچائی امن وشانتی کو عام کرنے کی ہر کوئی دعوت دیتا ہے اور اسے پسند بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن برائی کو روکنے اور برائی کے خلاف حق کی گواہی دینے کی باری آجائے تو وہی امن وشانتی کو عام کرنے اور اس کو پسند کرنے والے خاموش ہوجاتے ہیں۔ بعض حساس لوگ برائی کے خلاف حق کی گواہی دینے تیار بھی ہوجاتے ہیں چنانچہ عابد معز معاشرے کی خامی اور خوبی کو افسانوی انداز میں لکھتے ہیں:

''ہمیں یقین تھا کہ ہاتھا پائی ہوگی تو لڑاکو خان پہلوان اُن کا سرمہ بنا دے گا۔ ہم انہیں سمجھانے لگے۔ آپ لڑائی کیا جانیں۔ وہ غنڈہ ہے۔ موالی ہے۔ صبر کیجئے اور اپنے آپ کو سنبھالئے۔ شرافت شریف صاحب ڈھیلے پڑتے ہوئے

۱۔ ''مسائل گنج''، اردو میگزین۔ ۲۲ر ستمبر ۲۰۰۰ء

۲۔ فلمی پلاننگ۔ فارغ البال۔ ص: ۴۶

بڑی آواز میں کہا۔آپ نے سنا نہیں وہ کیسی نازیبا باتیں کررہا ہے۔اس بے عزتی سے بہتر ہے کہ لڑکر ختم ہوجائیں۔ہم نے معاملہ کی سنجیدگی کو سمجھتے ہوئے کہا۔مریں آپ کے دشمن۔قانون آپ کی حفاظت کے لئے موجود ہے۔

آپ ازالہ حیثیت عُرفی کا دعویٰ کیجئے۔

شرافت شریف صاحب نے نارمل ہوتے ہوئے پوچھا ''گواہی کون دے گا''

ہم نے جواب دیا ''ہم سبھی دیں گے''۔

اس جملہ کے بعد ہم نے دیکھا،محلّہ کے شرفاء نے جو شرافت شریف صاحب کو تھامے ہوئے تھے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔شرافت شریف صاحب کے ساتھ ہم تنہا رہ گئے۔ہم نے انہیں یقین دلایا کوئی اور گواہی دے یا نہ دے۔ہم ضرور آپ کا ساتھ دیں گے۔آخر طوفان بدتمیزی کو روکنا ضروری ہے''۔ [1]

یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارا معاشرہ ہمہ جہتی اخلاقی زوال کا شکار ہو چکا ہے۔عدالتوں میں بھی کرپشن کے ذریعے حقدار کے حق کو مار کر ظالم کی مدد کی جارہی ہے۔صحیح گواہوں کو ڈرا دھمکا کر نہ صرف دور رکھا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات تو ان کا کام بھی تمام کردیا جاتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رشوت خوری کی گرفت اتنی وسیع اور ہمہ گیر ہوگئی ہے کہ اس سے نہ سیاست دان اپنا دامن بچاتا ہے نہ ہی عدالتیں۔ان بدعنوانیوں اور بے قاعدگیوں کا نقصان ہندوستانی سماج پر پڑ رہا ہے جو ناقابل تلافی ہے۔ڈاکٹر عابد معز نے وکیل کے حوالے سے عدالتی بدعنوانی اور رشوت خوری پر کاری ضرب لگائی ہے:

''عدالت میں ہمارا نام پکارا گیا۔کسی نے ہمیں اٹھایا اور کٹہرے کی جانب چلنے کے لئے ڈھکیلا۔کٹہرے میں پہنچنے سے پہلے ہماری حالت غیر ہوئی اور ہم میز پر رکھی قانون کی کتابوں پر گر پڑے۔حواس بجا ہوئے تو پتہ چلا کہ پیشی ملتوی

---

[1] ۔ہم نے گواہی دی۔سگ گزیدہ۔ص:۶۰،سن اشاعت جنوری ۱۹۹۵ء

کر دی گئی ہے۔ اگلی پیشی تک کے لئے ہمیں خاصا وقت ملا۔ عدالت کا خوف دور کرنے کے لئے ہم کئی مرتبہ عدالت گئے۔ دوسرے مقدموں کی کاروائیوں کو سنا۔ پیشہ ور گواہوں کو دیکھا اور سُنا۔ ان سے بہت کچھ سیکھا۔ شرافت شریف صاحب ہماری وجہ سے پریشان تھے۔ ہمیں ان کے وکیل کے پاس لے گئے۔ وکیل نے ہمیں دیکھ کر کہا' گواہی دینا ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ آپ کچھ روپے خرچ کریں۔ میں گواہوں کا انتظام کرلوں گا''۔[۱]

عام طور پر دولت مند حضرات شہر کے شور شرابے و ہنگاموں سے بچنے کے لیے اپنی ایک الگ دنیا آباد کر لیتے ہیں۔ جہاں عام لوگوں کا گذر ممنوع رہتا ہے۔ دولت مند حضرات اپنوں سے خصوصاً بوڑھے ماں باپ غریب رشتہ دار اور پڑوسیوں سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ اس کے برعکس عام لوگ گھر میں کم اور ہوٹلس اور گلیوں کے نکڑ پر زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ یہاں بات کا بتنگڑ بنایا جاتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے واقعہ پر ہنگامہ برپا ہوتا ہے بلکہ ان ہنگاموں کی افواہیں کئی دنوں تک جاری رہتی ہیں۔ غرض یہاں شور شرابے ہنگامے افواہیں اور وہاں سکون ہی سکون۔ عابد معز معاشرے کے دونوں پہلوؤں کا تقابل کرتے ہوئے یوں طنز کیا ہے:

مجھے امید تھی کہ اس ہنگامے پر آس پاس کے مکین باہر نکل کر آئیں گے۔ شاید کسی کوٹھی سے دولت خانہ رئیس برآمد ہوں گے لیکن مایوسی ہوئی۔ کتوں کا بھونکنا بند ہوا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اس قسم کا ہنگامہ اگر شہر کے دوسرے محلے میں ہوتا تو دن بھر واقعہ کا اثر رہتا۔ مختلف افوائیں اڑائی جاتیں اور امن وامان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ میں شانتی نگر کی بے حسی پر شانے اچکائے ایک طرف چل پڑا۔ میں واپس لوٹنے کا قصد کر رہا تھا کہ ایک بزرگ نزدیک آئے اور پوچھا'' کیا بات ہے میاں'' مجھے خوشی ہوئی کہ اس محلّہ میں کوئی تو ملا جس نے ڈھنگ سے بات

۱۔ ہم نے گواہی دی۔ سگ گزیدہ۔ ص: ۶۰، سن اشاعت جنوری ۱۹۹۵ء ص: ۶۱۔۶۲

کی ۔میں نے جواب دیا ’’ایک دوست کا مکان تلاش کر رہا ہوں ۔

جواب سن کر بزرگوار سوالات کرنے لگے کہ دولت خان رئیس صاحب کیا کرتے ہیں ان کا حلیہ کیسا ہے۔فون نمبر کیا ہے۔ بچے کتنے ہیں اور کتنے کتے پال رکھے ہیں میں نے جواب دیا ’’تفصیلات کا مجھے علم نہیں ہے۔بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ میرے مضامین سننا چاہتے ہیں۔ بزرگوار نے میرے ہاتھ میں موجود کتابیں مانگیں اور ورق گردانی کرتے ہوئے کہنے لگے ’’عرصہ بعد اردو کتابیں دیکھ رہا ہوں۔ بچے ہر دم ٹی وی گھورتے رہے ہیں۔آواز اتنی تیز ہوتی ہے کہ کان کے پردے پھٹ جائیں۔ دو گھڑی اطمینان سے تنہائی میں بیٹھ کر کتابیں پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ عجیب زمانہ آیا ہے‘‘۔ میں دولت خان رئیس کا پتہ پوچھنا چھوڑ کر ان کا اتا پتہ پوچھنے لگا ’’آپ کہاں رہتے ہیں‘‘ایک جانب اشارہ کرکے بزگوار نے کہا کہ ’’اسی محلّہ میں، اس کوٹھی میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہوں بیٹے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہا ہوں‘‘ گفتگو کا رخ بدلنے کے لیے میں سوال کیا ’’آپ کے پڑوس میں کون رہتا ہے‘‘ بزرگوار نے فرمایا ’’کبھی کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پتہ نہیں کون رہتا بھی ہے یا نہیں، بزرگوار سے مزید گفتگو بے کار تھی اپنی کتابیں ان کی نذر کی اور آگے بڑھ گیا‘‘۔ ؎۱

حالات پر رونے سے حالات نہیں بدل سکتے اس کے لیے عملی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ بض لوگ اپنے معاش و دیگر مسائل کو عملی اقدامات سے حل کرنے کے بجائے وہم پرستی کا شکار ہو کر عملیات و تعویذوں میں ڈھونڈتے ہیں۔عملیات اور تکیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ہم نے سنا ہے کہ تکیہ کے سہارے کرتوت اور عملیات ہوتے ہیں۔شوہر کو قابو میں کرنا ہو تو تعویذ تکیہ کے نیچے رکھئے۔نو جوانوں سے اس کی محبت چھیننی ہو تو تکیہ پر عملیات کروایئے۔نظر لگی ہو تو تکیہ پر پھونک ماریئے۔ دشمن کا خاتمہ کرنا مقصود

؎۱ ۔کوٹھیوں کا شہر،سگ گزیدہ۔ص99-97،سنہ 1995

ہوتو اس کے تکیہ میں پلیتے چھپائیے۔ گردن میں درد ہوتو تکیہ کو دھوپ میں
سکھائیے۔ اولاد کی خواہش ہوتو چھوٹے بچوں کے تکیہ پر سات راتیں گزاریئے
دعویٰ کیا جاتا ہے کہ منجملہ شکایتوں میں تکیہ کی مدد سے افاقہ ہوگا۔ تکیہ خواب دکھاتا
ہے۔ سوتے اور جاگتے ہر دو وقت نیند کے خواب تکیہ کی مرضی کے ہوتے ہیں''۔ ۱

عابد معز کے مطابق توہم پرستی کا رجحان ہمارے ملک میں مردوں سے زیادہ خواتین میں پایا جاتا ہے۔ جس کو وہ اپنے ایک مضمون ''نظر'' میں یوں طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ فرماتے ہیں:

''بیوی نے واپسی کے لیے میری پیکنگ کی اور مجھے ہوا سے بچاتے ہوئے
گھر لائیں راستے میں معدے میں ہلدی، دودھ اور شوربے کے درمیان فساد
شروع ہوا۔ مجھے سواری سے سیدھے باتھ روم جانا پڑا آدھے گھنٹے کے دوران
تین اجابتیں اور ایک قئے ہوئی بیوی پریشان ہوئیں۔ پڑوسن سے مشورہ کیا۔
دونوں نے سر جوڑ کر میری نئی شکایت کی تشخیص کی کہ مجھے نظر لگی ہے راستے اور دفتر
میں معلوم نہیں کیسی کیسی نظروں سے پالا پڑتا ہے۔ مجھے لگی نظر کو اتارنے کا فیصلہ
کیا گیا۔ میں انھیں سمجھاتا رہ گیا کہ مجھے کیا نظر لگے گی۔ میری نظر تو خود ہر دم ادھر
ادھر لگی رہتی ہے۔ بیوی ایک نہ مانیں۔ کالی مرغی بھلانویں اور کالی مرچ سے
میری نظر ایسے اتاری گئی جیسے فلموں میں ہیرو کی آرتی اتاری جاتی ہے''۔ ۲

عابد معز کا خیال ہے کہ معاشرے میں ان ہی لوگوں کی عزت وآؤ بھگت کی جاتی ہے جو شادی بیان یا خوشی کے موقع پر سونے چاندی، روپیوں کی شکل میں تحفہ دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف کوئی شخص تحفہ میں کتابیں دے تو اسے حقیر یا غریب انسان سمجھا جاتا ہے۔ معاشرے کی اس صورت حال پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میری نظر میں تحفہ دینے اور لینے کے لیے کتابوں سے بڑھ کر کوئی دوسری
شئے نہیں۔ میں کتابوں کا تحفہ بے پناہ خوشی کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔ دبے الفاظ

۱۔ تکیہ پر ہمارا تکیہ، فارغ البال، ص نمبر 152-151

۲۔ قصہ تیمارداری کا، سگ گزیدہ، ص نمبر 134

میں احباب سے میں کتابیں تحفہ میں دینے کے لیے کہتا ہوں۔ دوست احباب خوشی سے میری یہ خواہش پوری کرتے ہیں۔ میں کتابوں کے علاوہ کوئی اور تحفہ دینا نہیں چاہتا۔ میں جتنی خوشی سے کتابوں کا تحفہ دیتا ہوں۔ احباب اتنی ہی ناراضی سے اسے قبول کرتے ہیں لیکن میں اس کی پرواہ نہیں کرتا اور کتابیں ہی تحفہ میں دیتا ہوں۔ بعض عزیز واقارب اسی ڈر سے مجھے مدعو نہیں کرتے لیکن میں برا نہیں مانتا۔ الٹا تحفے میں دی جانے والی کتابوں کو اپنے پاس رکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے''۔ [1]

مذہب اسلام میں رمضان المبارک ایک مقدس مہینہ ہے۔ اس مہینہ میں روزے کے علاوہ دیگر عبادات میں مشغول رہنا بھی ماہ رمضان کا ایک حصہ ہے لیکن موجودہ معاشرے میں اس کی صورت کچھ الگ نظر آتی ہے۔ لوگ رمضان کا چاند دیکھتے ہی عبادات میں مشغول ہونے کے بجائے صرف حلیم کھانے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے غیر مسلم نے اس مہینہ کو حلیم کھانے کا مہینہ سمجھ لیا ہے۔ کاش کہ امت مسلمہ اپنے فعل وعمل سے حلیم منت کے بجائے خالص عبادات کا مہینے کی حقیقی تصویر پیش کر سکتے۔ ماہ رمضان میں حلیم کھانے والوں کے نظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں فرماتے ہیں ملاحظہ کیجئے:

''متبرک ماہ رمضان کی آمد پر لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد اور نیک تمنائیں پیش کر رہے ہیں آپ نے بھی مبارک باد وصول اور پیش کی ہوگی میں نے بھی کی ہے۔ میرے ایک دوست جن پر عقیدے کی رو سے روزے واجب نہیں ہیں نے مجھے مبارکباد دی (Congrats) تمہارا حلیم کھانے کا مہینہ آرہا ہے۔ ہمیں بھول نہ جانا کبھی حلیم کھانے بلا لینا۔ حلیم کھانے کا مہینہ میں نے حیرت اور تعجب سے استفسار کیا۔

ہاں۔ سال تمام تم لوگ جس Haleem month کا انتظار کرتے ہو وہ

---

[1] ۔ کتابی کیڑا، اردو میگزین، 24 مئی 2000

شروع ہونے والا ہے۔اس مہینے میں حلیم کھانے کی غرض سے صبح سے لے کر شام تک تم لوگ کچھ کھاتے اور نہ پیتے ہو اور سورج غریب ہوتے ہی بڑے شوق سے حلیم کھاتے ہو۔کیا بچے۔کیا بڑے اور کیا بوڑھے۔ہر کوئی خوب ڈٹ کر حلیم کھاتا ہے۔کم سے کم تین کٹورے حلیم نوش جان کرنا لازمی ہے۔کوئی حلیم کی نصف سنچری تو کوئی مکمل سنچری بناتا ہے کچھ تو ایسے بھی ہیں جو روزوں کا اکاونٹ ہی نہیں کھولتے لیکن کئی پلیٹ حلیم چٹ کر جاتے ہین۔عید کے دن ڈکار لیتے ہیں تو ڈکار میں حلیم کی خوشبو آتی ہے۔......بعض لوگ تو ایسے بھی ہیں جو دوسرے دنوں میں حلیم کھانے کو حلیم کی توہین سمجھتے ہیں اور جب انھیں کوئی حلیم کھاتا ہوا دکھائی دیتا تو سوال کرتے ہیں کیا آج آپ رمضان کا قضا روزہ تھے''۔ [۱]

موجودہ دور میں ہماری عبادت گاہوں کے حالات بھی ابتر ہوئے جارہے ہیں۔ یہاں لوگ عبادت کرنے آتے ہیں لیکن یہاں سے جاتے ہوئے اپنے نئے جوتے چپل سے محروم ہوجاتے ہیں۔ معاشرے کے اس غیر اخلاقی عمل پر یوں طنز و مزاح کی ضرب لگائی ہے لکھتے ہیں:

بالخصوص اچھے اور قیمتی جوتوں کو عبادت گاہیں راس نہیں آتیں کچھ لوگ جوتوں کو سامنے رکھ کر عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ان کی ایک آنکھ جوتوں کی حفاظت کرتی ہے تو دوسری عبادت میں مگن رہتی ہے۔احتیاط کے باوجود چوری ہوجاتی ہے۔مسجدوں میں ایسے متقی اور پرہیز گار لوگ بھی آتے ہیں جنھیں دوسروں کے جوتے پسند آجاتے ہیں اور وہ نہایت ''خضوع وخشوع'' سے انھیں اٹھا کر لے جاتے ہیں''۔ [۲]

اسلام نسل آدم کے لیے خیر و برکت لے کر آیا ہے عورتوں کو ظلم وزیادتی سے نکال کران کے لیے عزت و وقار کا نظام دیا۔قرآن میں جو خصوصیات مردوں کی ہے وہی خصوصیات ٹھیک ان ہی الفاظ میں

۱۔خوش آمدید، یاشہر الحلیم، اعتماد۔24 ستمبر 2007ء

۲۔ساڑھے بارہ ہزار روپے کا جوتا، اردو میگزین۔2003ء

عورتوں کی بیان کی گئی ہے۔ان میں کسی قسم کی تفریق نہیں ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ
''بعض خصوصیات میں مرد افضل ہیں تو بعض میں عورتیں ان میں افضل ہیں'' (سورۃ النساء 34)

عورت نصف انسانیت ہے مرد انسانیت کے ایک حصہ کی ترجمانی کرتا ہے۔عورت کو نظر انداز کر کے انسانی برادری کے لیے جو کام کیا جائے گا وہ ناقص اور ادھورا رہے گا۔ہم ایسے سماج کا تصور نہیں کر سکتے جو تنہا مردوں پر مشتمل ہو جس میں عورت کو اہمیت نہ دی جائے کیوں کہ مرد ہو یا عورت دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہے۔اس کے باوجود ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی پیدائش پر ناراضگی کا اظہار کیا جاتا ہے جو کہ معاشرے کا غلط رویہ ہے۔اس معاملہ میں مرد اور خواتین دونوں شریک ہیں۔لہٰذا عابد معز معاشرے کے اس تفریق شدہ عمل پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہمارے یہاں لوگ لڑکوں کے آس پر لڑکیاں پیدا کرتے ہیں لڑکی بہت کم فرسٹ چوائس ہوتی ہے بلکہ پہلا دوسرا تیسرا چوتھا چوائس لڑکے ہی ہوتا ہے اور جب ماں باپ کی خواہش کے برخلاف اوپر والے کی مرضی سے لڑکیاں پیدا ہوجاتی ہیں تو انھیں پالا پوسا جاتا ہے کہ کائنات یک رنگی نہ ہو۔ہم بعض ایسے خاندانوں سے واقف ہیں جہاں لڑکے کی آس پر کائنات میں رنگ بھرنے کے لیے لڑکیوں کی رنگارنگ فوج تیار ہوئی ہے۔جب لڑکا تولد ہو تو گویا دونوں جہاں کی نعمت اور دولت مل گئی اور فوری فیملی پلاننگ پر عمل شروع ہوگیا۔فیملی پلاننگ کا مطلب بھی یہی ہے کہ ایک یا دو لڑکے بس۔اگلا بچہ ابھی نہیں لڑکا کے بعد کبھی نہیں بعض اوقات مرد مجاہد کا دور دور تک پتا نہیں رہتا معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کتنی لڑکیوں کے پیچھے چھپا ہے''۔ [1]

اگر کسی کے ہاں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوں تو خاندان اور معاشرے کے بیشتر افراد (مردو

1۔تصویر کائنات میں رنگ، فارغ البال۔ص نمبر 15

اورخواتین)عورت کوقصوروارگردانتے ہیں۔لیکن سائنسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جنس مقرر کرنے کی اہلیت عورت میں نہیں بلکہ مرد میں ہوتی ہے۔ڈاکٹر صاحب معاشرے کے اس بھیانک رستے ہوئے ناسور پر طبی نقطہ نظر سے یوں نشتر چلائے ہیں:

''تمام کوششوں کے بعد جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو گھر اور خاندان میں ایک طوفان برپا ہوتا ہے۔شوہر بیوی کو قصور وار گردانتا ہے کہ اسے لڑکے بنانا نہیں آتا۔اس کی قسمت خراب ہے کہ ایسی پھوہڑ بیوی ملی ہے۔اسے ڈراتا دھمکاتا اوراس پر ظلم ڈھاتا ہے۔ بیوی اور بیٹی کی صورت دیکھنا گوارانہیں کرتا۔اس کا ساتھ چھوڑنے یا اس کے سر پر لڑکا پیدا کرنے والی سوت لانے کی دھمکی دیتا ہے چند شوہر بیوی اور بچوں کو میکے بھیج دیتے ہیں تو دو ایک شوہر فرار بھی ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ایک دوست اپنی بیوی کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور شکایت کی ''ڈاکٹر صاحب میری بیوی صرف لڑکیاں پیدا کر رہی ہے۔اب تک چھ بچیاں ہو چکی ہیں اس کا علاج کیجئے مجھے اولا دنرینہ کی خواہش ہے۔ڈاکٹر صاحب نے انھیں بتایا کہ عورت جنس مقرر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور یہ مبارک کام مرد ہی انجام دیتا ہے''۔ [ا]

معاشرے میں لڑکیوں کے تعلق سے یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ صرف پرایا دھن ہوتی ہیں۔اس کے برعکس لڑکوں کو والدین کا سہارا اور خاندان کا چشم و چراغ سمجھا جاتا ہے۔اسی لیے لڑکے کی پیدائش پر خوشی اورلڑکی کے پیدائش پر خوشی کے بجائے اداسی چھا جاتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر عابد معز نے اس اخلاقی گراوٹ وسماجی بیماری کو بیان کرتے ہوئے سماج و معاشرے کی سوچ وفکر اور تلخ حقائق پر اس طرح ضرب کاری کی ہے:

ا ۔تصویر کائنات میں رنگ، فارغ البال، ص نمبر 16

''لڑکے کی پیدائش پر دوست احباب پر اور مبارکباد دیتے جیسے والدین نے بہت بڑا کام کیا ہے اور تاریخ میں انھیں کے یہاں پہلی مرتبہ لڑکا ہوا ہے۔ اچھی شروعات پر مٹھائی کھلانے اور پارٹی کا مطالعہ کرتے ہیں اس کے برخلاف لڑکی پیدا ہونے پر صاحب اولاد ہونے کی مبارکباد دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ اللہ کی مرضی قدرت کے کام میں کون دخل دے سکتا ہے۔ اس مرتبہ لڑکی ہوئی ہے۔ انشاءاللہ دوسرا لڑکا ہوگا''۔ [1]

کسی کے ہاں ایک کے بعد دیگر لڑکیاں پیدا ہو رہی ہوں تو بعض دوست احباب (مرد و خواتین) کچھ اس طرح کے مشورے دیتے ہیں:

''ایک احباب دبے دبے الفاظ میں مشورہ بھی دیتے ہیں کہ اب بس بھی کیجیے لڑکے کی آس پر کب تک نادانی کرتے رہیں گے۔ چار نادانیاں کر ہی چکے ہیں۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں۔ اولاد صرف دو یا تین ہی ہونی چاہیے۔ اب جو ہیں انھیں پڑھا لکھا کر قابل بنایئے اور لڑکوں کے مقابل کھڑا کیجئے۔ اس لیڈی ڈاکٹر جس نے ڈیلیوری انجام دی ہے، کی مثال دے کر کہتے ہیں دیکھئے کتنی بڑی اور لائق ڈاکٹر ہے ماں باپ کا نام روشن کر رہی ہے''۔ [2]

لڑکیوں کے بعد لڑکے کی پیدائش پر ماں اور باپ کی فطری سوچ کو ڈاکٹر عابد نے اس طرح ظاہر کیا ہے۔ کہتے ہیں:

''لڑکے کی پیدائش کے بعد ماں باپ کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور پھر اس خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا جب مرد مجاہد حسب مقدار ایک دو، تین چار، یا لامقدار لڑکیوں کے بعد وارد ہوتا ہے۔ خوشی لڑکیوں کی تعداد سے ضرب ہو جاتی ہے۔ ماں کا سر اونچا اٹھا جاتا ہے۔ باپ لڑکے کی تعلیم و تربیت کے بارے میں

---

[1] ۔ تصویر کائنات میں رنگ، فارغ البال، ص17

[2] ۔ تصویر کائنات میں رنگ، فارغ البال، ص18

سوچنے لگتا ہے کہ پڑھا لکھا کر اسے کم سے کم ڈاکٹر یا انجینئر بناؤں گا۔ ماں اس
کے لیے چاند سی بہولانے اور اس چاند کو مسخر کرنے کے سپنے دیکھنے لگتی ہے"۔ ۱

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق (Unisef) یونیسف کی جاری رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواتین کی تعداد ہر سال کم ہو رہی ہے۔ اصلی سبب انہیں پیدا ہونے سے پہلے جدید سائنس و ٹکنالوجی کی مدد سے یا دیگر طریقوں سے لڑکیوں کو ختم کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر معز علامہ اقبالؒ کے مشہور مصرعے کو استعمال کرتے ہوئے اس صورت حال پر گہرا طنز کیا ہے لکھتے ہیں:

"یونیسف (UNICEF) کی جاری کردہ ایک اہم خبر چھپی تھی۔
2007ء میں دنیا کے بچوں کی حالت عنوان کے تحت رپورٹ میں بتایا گیا ہے
کہ ہندوستان میں ہر دن سات ہزار لڑکیاں کم پیدا ہوتی یا کی جاتی ہیں۔ رپورٹ
میں مختلف اعداد و شمار پیش کئے گئے تھے۔ مردوں اور عورتوں کے تناسب کے
حوالے سے لکھا تھا کہ ایک ہزار مرد بچوں کے لئے 927 لڑکیاں ہیں یعنی ایک
ہزار مردوں کی آبادی کے لئے 73 عورتیں کم ہیں۔ خبر پڑھنے کے بعد مجھے پتہ
چلا کہ میرے دوست کیلکو لیٹر کی مدد سے ہندوستان میں قلت زن کا حساب کر
رہے تھے کہتے ہیں وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔ عورتیں کم ہونے
سے ہندوستان کی تصویر دھندلی ہے اور اس کے رنگ بھی پھیکے ہیں۔ شاید اسی
لئے یہاں رنگوں کا تہوار منایا جاتا ہے۔ یہ ایک جملہ مفروضہ تھا۔ لیکن یہ ایک
حقیقت ہے کہ یہاں لڑکیوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ کوئی نہیں چاہتا کہ ان کے گھر
دختر نیک اختر پیدا ہو، انہیں اپنا اور لڑکی کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے"۔ ۲

جنس کے معاملے میں عورت خود عورت کی دشمن ہوتی ہے۔ وہ خود نہیں چاہتی کہ ایک لڑکی کے بعد دوسری لڑکی ہو بلکہ لڑکے کے بعد لڑکا ہو۔ حقیقی بات تو یہ ہے کہ عورت تک نہیں چاہتی کہ اُس کے بطن سے اُس

۱۔ تصویر کائنات میں رنگ، فارغ البال، ص 19

۲۔ "جنس کم یاب"۔ اعتماد۔ 21 مئی۔ 2007ء

کی ہم جنس پیدا ہو۔ چنانچہ عورت کے اس نفسیاتی عمل کو طنز کا نشانا بنایا ہے لکھتے ہیں:

> ''مرد تو خیر مرد ہے، وہ اپنے جیسی ہی اولاد چاہے گا۔ عورت تک نہیں چاہتی کہ اس کے بطن سے اس کی ہم جنس پیدا ہو۔ سائنس کی مدد سے جنس معلوم کر کے لڑکی کی پیدائش سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اتنا عام ہو چلا تھا کہ حکومت کو پیدائش سے قبل جنس معلوم کرنے پر پابندی لگانی پڑی''۔

نوجوان نسل

گزشتہ قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ملک و ملت کا قیمتی سرمایہ نوجوان ہیں جو ملک و ملت کی ترقی کے ضامن ہوتے ہیں۔ اگر کسی معاشرے کو تندرست و توانا نوجوان میسر آ جائیں تو معاشرہ بھی صحت مند و توانا ہوگا، بصورت دیگر وہ معاشرہ بیمار ثابت ہوگا۔ نوجوان اپنی قوم کے درخشاں ستارے اور قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ قوم کی ساری اُمیدیں ان سے وابستہ ہوتی ہیں۔ نوجوان قوم کے لیے عظیم قربانیاں اور نا قابل فراموش کارنامے انجام دیتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ نوجوانوں نے ہی دنیا کی ہر تحریک کے لیے ہراول دستہ کا کردار ادا کیا ہے۔ چاہیے انقلاب فرانس ہو یا روس کی احتجاجی مظاہرہ ہر میدان میں نوجوانوں نے لوہا منوایا ہے۔ نوجوانوں کی توانائی ایٹمی توانائی سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہے، لیکن افسوس کہ آج کل کے بیشتر نوجوان چرس، گانجہ، افیون، بھنگ، گٹھکا اور کوکین سے لے کر براؤن شوگر اور کئی دیگر منشیاتی کیمیائی مادوں کے استعمال کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ نوجوان اپنے اس عمل سے جہاں والدین کے سر کو خم کر رہے ہیں وہیں قالق کائنات کی عطا کردہ بیش بہا قیمتی جوانی کو اس خرافات میں برپا کر رہے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ معاشرے کو آلودہ کر رہے ہیں۔ مذہب سے دوری فحش لٹریچر غلط فلمیں اور نشہ کی عادتیں اور جوانی کے بے جا تقاضے بھی انہیں کچھ سے

ا۔ ''تصویر کائنات میں رنگ'' فارغ البال۔ ص:۲۰

کچھ کرنے پر مجبور کردیتی ہیں۔اسی حالت میں عشق و محبت کی داستانیں پڑھ یا دیکھ کر ایسا کچھ کرنے کا خیال آتا رہتا ہے کہ دنیا اس کو دیر تک یاد رکھے۔ڈاکٹر عابد معز نے کچھ ایسے ہی نوجوانوں کی تصویر کھینچی ہے جو عشق محبت کو کھیل تماشہ سمجھتے ہیں اپنی عاشقی کو دنیا والوں کے سامنے لانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔لکھتے ہیں:

''نوجوان محبت کو کھیل اور تماشے کی طرح کھیلتے ہیں۔یوں بھی نوجوان اگر جوانی کے دور کو سنہری الفاظ میں نہ لکھیں تو بڑھاپے میں جوانی دیوانی کو کیسے یاد کریں گے جوانی کی یادیں بڑھاپے کے لئے فکسڈ ڈپازٹ ہوتی ہیں۔منظّم پلان کے تحت محبت کی جاتی ہے۔عمر کی قید نہیں ہوتی لیکن نوجوان ہر لحاظ سے محبت کے لئے سازگار عمر ہے۔کہتے ہیں اس عمر میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔نوجوان کرتے بھی یہی ہیں۔بزرگوں کی نصیحتوں کو پھونک پھونک کر راستے سے ہٹاتے اور قدم بڑھاتے ہیں''۔

عابد معز نے عاشقی میں مبتلا نوجوانوں کا خوب نقشہ کھینچا ہے جب نوجوان اپنے بڑے بزرگوں کی نصیحتوں کو پھونک پھونک کر راستے سے ہٹاتے ہیں تو کسی حسین لڑکی کے دامن عشق میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔قید عشق بھی بڑی خطرناک بیماری ہوتی ہے۔جس میں آنکھ اور دل کی تباہی و بربادی ہوتی ہے عقل ماتم کرتی رہتی ہے۔کسی پل قرار نہیں ملتا بھری محفل میں تنہا ہوتے ہیں، جاگتے ہوئے خواب دیکھنے لگتے ہیں بلکہ پورا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

''آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔آنکھوں میں راتیں کٹتی ہیں۔دل جلنے لگتا ہے۔کسی پل قرار نہیں ملتا۔دل کے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔بعض مرتبہ ایسا وقت بھی آتا ہے جب آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور دل دھڑکنا بند کردیتا ہے۔محبت میں آنکھ اور دل ہی کی حالت غیر نہیں ہوتی۔پورا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔اہل دل سرتاپا مجسم محبت اور پیکر عشق بن جاتے ہیں۔کمی بیشی دوست احباب پوری کردیتے ہیں ؎

ا۔''سوز محبت''، سگ گزیدہ۔ص:۷۰۔اشاعت ۱۹۹۵ء

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنون کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنادیتے ہیں

محبت کا مارا تنہائی چاہتا ہے۔ بیٹھے رہے تصور جاناں کئے ہوئے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ عشاق عقل میں تنہا ہوتے ہیں۔ آس پاس سے بیگانے اور بے خبر، اٹھتے بیٹھتے محبت کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ بھوک مٹ جاتی ہے۔ نیند اڑ جاتی ہے۔ اختر شماری ہوتی ہے۔ جاگتے ہوئے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔

فنون لطیفہ سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ موسیقی پر سر دھنتے ہیں۔ شاعری سمجھ میں آتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ مسکرانا اور خوش ہونا بھول جاتے ہیں۔ کہتے ہیں آنسو محبت کی پہلی نشانی ہے۔ زبان کو چپ لگ جاتی ہے۔ زندگی حقیر اور بے معنی لگتی ہے، جینے کے بجائے مرنے کی باتیں کرنے لگتے ہیں'' ۱؎

نوجوان سماج کا ایک منفرد و مستقل رکن ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ انقلاب پسند واقع ہوا ہے۔ اگر انہیں صحیح سمت نہ دکھادی جائے تو غلط سمت میں آگے بڑھنے لگتے ہیں۔ والدین و سرپرستوں کی صحیح وقت پر صحیح تربیت ہو تو ان کے آئیڈیل بدل جاتے ہیں۔ اگر ان کی صحیح تربیت ہو تو ان کے آئیڈیل سائنس داں، انجینئر، ڈاکٹر، وکیل ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو کثرت فلم بینی انہیں عشق کے میدان کا مرد مجاہد بنا دیتا ہے۔ ایسے نازک موڑ پر والدین ان کی صحیح تربیت کرنا چاہیں بھی تو مشکل ہوتی ہے۔ چنانچہ عابد معز عصر حاضر کے نوجوانوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نوجوانوں کے آئیڈیل بدل گئے ہیں۔ نونہال پڑھ کر سائنس دان، انجینئر، ڈاکٹر یا وکیل بننے کے برخلاف بن سنور اور سج دھج کر فلمی اداکار بننا چاہتے ہیں۔ بچپن ہی سے بالوں کو سنوار کر اور پاؤڈر کریم تھوپ کر آرزو کرتے ہیں کہ پردہ سیمیں کے ابھرتے ستارے بنیں گے۔ کسی اداکار کو آئیڈیل مان کر اس کا

۱؎۔ سگ گزیدہ۔ جنوری 1995ء، ص: 72.71

> ڈپلیکیٹ بنے پھرتے ہیں۔ باتیں یوں کرتے ہیں جیسے ڈائلاگ ادا کر رہے ہوں۔ میں نے دولڑکوں کو کہتے سنا، یار ڈیڈی مغل اعظم کے ظل الٰہی ہیں۔ محبت کے دشمن......! دوسرے نے جواب دیا۔ تیری رکھشا کے لئے مہارانی جودھا بائی موجود ہیں۔ میرا کیا ہوگا۔ میرا واسطہ ڈاکٹر ڈاسن سے ہے جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا''۔ ۱

لاپرواہ بگڑے ہوئے نوجوان کو راہ راست پر لانے کے لئے شادی سے بہتر کوئی دوسرا نسخہ کارآمد نہیں ہوسکتا۔ اس حقیقت کو عیاں کرتے ہوئے عابد معز فرماتے ہیں:

> ''بگڑے ہوئے نوجوان کو راہ راست پر لانے کے لئے جہاندیدہ بزرگ شادی کا مشورہ دیتے ہیں، بیوی گلے بندھ جائے گی تو آوارہ گردی اور مستی خود بخود ختم ہوجائے گی۔ اونچی آواز میں گفتگو کرنا بھی بند ہوجائے گا۔ صاحبزادے بہت جلد راہ راست پر آجائیں گے۔ ہم نے اس قدیم نسخہ کے ایسے شاندار نتائج دیکھے ہیں کہ ہمارا بس چلے تو نوجووان نسل کی فلاح و بہبود کے لئے جلد شادی کا مشورہ دیں۔ شادی کے بعد بیوی کے آنچل میں شوہر کی تعلیم تربیت شروع ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ شادی سے قبل تعلیم وتربیت کی ابتداء ہوجاتی ہے۔ تعلیم کم اورتر بیت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اکثر شوہر شادی تک تعلیم مکمل کر چکے ہوتے ہیں''۔ ۲

عابد معز کے بیشتر مضامین حقیقی واقعات سے مرکوز ہیں۔ ان کے تحریروں میں ہمیں حقیقت کی عکاسی نظر آتی ہے۔ انہوں نے بہت ہی متاثر کن انداز میں معاشرے کے ہر رستے ہوئے ناسور پر نشتر چلائے ہیں۔ آج کی نوجوان نسل کا سب سے بڑا المیہ اخلاقی گرواٹ ہے۔ خصوصاً نصیحت کرنے والوں کو اُلٹا جواب دینا نوجوانوں کے اس طرز عمل پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ فلمی پلاننگ۔ فارغ البال۔ ۴۷۔۴۶

۲۔ ''آنچل کی تربیت'' فارغ البال۔ ص: ۱۱۲۔۱۱۳

''میں نے ایک نوجوان کو موٹر سائکل چلانے کے دوران فون نہ کرنے کی صلاح دی تو اس نے کہا آپ ڈریئے نہیں انکل' کچھ نہیں ہوتا۔ آپ نے پائلٹ کو دیکھا ہے۔ ہیڈ فون لگا کر وہ جہاز اڑاتا ہے۔ کوئی حادثہ نہیں ہوتا۔ میں تو صرف بائیک چلا رہا ہوں''۔ [1]

بم سازی

بلاشبہ تنازعات سے ہی تحفظ کا احساس جنم لیتا ہے اور اپنی بقاء واستحکام کے لئے نئی نئی راہیں سوجھتی ہیں۔ عدم تحفظ کے احساس نے انسان کے اندر اپنی بقاء واستحکام کے جذبے کو ابھارا۔ اپنے بچاؤ کے لئے ہتھیار سازی کا سلسلہ شروع کیا، جو نہ صرف ایسے دوسری اقوام کے حملوں سے بچانے کے لئے ڈھال بنا بلکہ ہتھیاروں کے بل بوتے پر خود کو دوسری اقوام سے بالاتر ثابت کرنے میں بھی کامیاب ہوا۔ آج دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جو اپنی قومی آمدنی کا بڑا حصہ دفاع پر خرچ نہ کرتا ہو۔ موجودہ حالات میں ہر ملک ہتھیاروں کی صف میں آگے نکل جانے میں لگا ہوا ہے۔ سوپر پاور ممالک ایک دوسرے کو نیچے دکھانے یا اپنے زیر نگیں رکھنے کے لئے خطرناک سے خطرناک نیوکلیئر بم تیار کر رہے ہیں۔ عابد معز امریکہ اور روس کی اسلحہ سازی کا محاسبہ کرتے ہوئے ان کی بم سازی کو اس طرح طنز ومزاح کا ہدف بنایا ہے:

''رپورٹ میں کہا گیا کہ نیا بم امریکہ کے Massive Ordinance Air Blast مخفف MOAB سے زیادہ طاقتور ہے۔ امریکہ اس بم کو پیار سے Mother of all Bombs یعنی بموں کی ماں کہتا ہے اس بم کو تاریخ کا سب سے خطرناک بم مانا جاتا ہے۔ لیکن روس کا تیار کردہ بم بموں کی ماں سے چار گنا زیادہ طاقتور ہے اسی لئے روسی اسلحہ سازوں نے اسے Father of All Bombs یا Dad of All Bombs کا خطاب دیا ہے۔ ظاہر

---

[1] ۔ ''اُف یہ ٹرافک'' اعتماد۔ 19 / مارچ 2006ء

بات ہے کہ بموں کی اماں سے زیادہ طاقتور اور خطرناک بم کو بموں کا باپ ہی کہا جاسکتا ہے۔ اگر برابر قوت کا بم ہوتا تو شاید اسے بموں کی خالہ یا بموں کا ماموں جیسا نام دیا جاتا۔ روس نے بموں کے باپ کو دریافت کر کے جیسے بموں کے خاندان کو مکمل کیا ہے وگرنہ صرف بموں کی ماں ہی کا چرچہ تھا جسے افغانستان کے پہاڑوں میں استعمال کیا گیا تھا۔ روس کا کہنا ہے کہ بموں کے باپ کی دریافت ہتھیاروں کی دوڑ کا حصہ نہیں ہے اور نہ ہی اس نے اس دوڑ کو دوبارہ شروع کیا ہے۔ روس یہ بھی کہتا ہے کہ اس نے ہتھیار کم کرنے کے معاہدوں کی خلاف ورزی بھی نہیں کی ہے۔ روس سچ ہی کہتا ہے کہ اس نے ہتھیار کہاں تیار کیا ہے۔ اس نے تو صرف بموں کی ماں کی تنہائی دور کی ہے۔ اماں کا ساتھ دینے کے لئے ابا کو ڈھونڈ لایا ہے''۔

مزید آگے لکھتے ہیں:

''بموں کے باپ کے دریافت پر بعض ماہرین شک کرتے ہیں، کرنے دیجئے لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ دنیا میں بموں کا خاندان پھیلتا جارہا ہے۔ موجودہ سوپر پاور کے پاس بموں کی ماں ہے اور سابقہ سوپر پاور نے بموں کے باپ کا سراغ پالیا ہے۔ دوسرے ملکوں کے پاس بموں کے بے شمار بھائی، بہن، انکل اور آنٹی ہیں اور اب ایسے ویسے لوگوں کے پاس بموں کے بچے بھی پلنے لگے ہیں۔ آئے دن کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی پھٹتا اور تباہی مچتی ہے''۔ [۲]

سائنس اور ٹکنالوجی نے جہاں ترقی کی نئی نئی راہیں نکالی ہیں وہیں انسانی زندگی کو بہت بڑے خطروں سے دوچار کردیا ہے۔ آج کرہ ارض پر ہتھیاروں کا اتنا ذخیرہ ہے جو دنیا کو دو چار مرتبہ تباہ برباد کیا جا سکتا ہے۔ ان ہی ہتھیاروں کے سہارے امیر ممالک غریب ممالک پر اپنا کنٹرول رکھنا چاہتا ہے تو کوئی ان ہی

---

[۱] - بموں کے ماں باپ۔ اعتماد۔ 22/ اکٹوبر۔ 2007ء

[۲] - بموں کے ماں باپ۔ اعتماد۔ 22/ اکٹوبر۔ 2007ء

کے سہارے آزاد ہونا چاہتا ہے۔آج بھی کرہ ارض کے بعض مقامات پر پیٹ بھرنے کے لئے روٹی نہیں ملتی اورتن ڈھانکنے کے لیے کپڑے نہیں ملتے،لیکن مرنے اور مارنے کے لیے بندوق، گرینیڈ بم اور ایٹمی ہتھیار ضرور دستیاب ہوتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ انسان زمین پر نہیں بلکہ بارود کے ڈھیر پر زندگی بسر کر رہا ہے۔

انگریزی زبان کا غلبہ

دور حاضر میں جدید ٹکنالوجی کے تمام شعبوں کے علاوہ معاشرتی زندگی پر انگریزی کا غلبہ ہو رہا ہے۔ انگریزی سے متاثر ہونے والی زبانوں میں اُردو زبان بھی شامل ہے۔آج انگریزی زبان کا غلبہ اتنا عام ہو چکا ہے کہ کوئی کسی کو سوال کرتا ہے تو سوال میں دو چار جملے انگریزی کے خود بہ خود آجاتے ہیں،اور جواب دینے والا شخص بھی جواب میں دو چار جملے انگریزی کے کہہ دیتا ہے۔غرض انگریزی زبان نا صرف آفس، بازار بلکہ گھر کی عام گفتگو میں بھی شامل ہوگئی ہے۔چنانچہ عابد معز لکھتے ہیں:

> ''گھروں میں بھی اس زبان کی حکومت قائم ہوتی جارہی ہے۔صبح شوہر گھر چھوڑتے وقت بیگم سے کہتے ہیں......'بائی بائی ڈارلنگ......آج آفس میں بہت بزی رہوں گا اس لیے لنچ پر نہیں آؤں گا۔جواب میں بیگم نے کہا نو پرابلم لیکن Evening جلد آیئے ٹیک کیئر......بائی بائی''۔ [1]

ہندوستانی زبانیں یعنی اردو، ہندی، مراٹھی، گجراتی ، وغیرہ انگریزی زبان کے امتزاج و ملاوٹ سے ایک نئی زبان وجود میں آرہی ہے۔اس کو پروان چڑھانے میں بالخصوص ٹی وی چینلز،مشتہرین اور کچھ انگلش میڈیم اسکول ہیں۔ جہاں بڑے دھڑلے کے ساتھ غلط سلط اُردو اور ہندی بولی جارہی ہے۔جس کی وجہ سے بچے نہ انگریزی زبان میں بات کرتے ہیں۔اور نہ ہی مادری زبان میں۔ چنانچہ عابد معز زبان کو دوغلی زبان قرار دیا ہے لکھتے ہیں:

---

[1] ۔ایک نئی زبان وجود میں آرہی ہے۔اعتماد۔6/نومبر 2006ء

’’بچے نہ انگریزی زبان میں بات کرتے ہیں۔اور نہ ہی مادری زبان میں،
بلکہ ان دو زبانوں کی آمیزش سے ایک نئی دوغلی زبان کو جنم دیتے ہیں۔ہم نے
ایک لڑکی کو کہتے ہوئے سنا۔ الارے پکنک میں بہت Enjoyment ہوا
Slice Bread کچھی املی کی چٹنی کے Sandwiches were so
testy کہ پوچھ مت......!اب تک منہ Watering کرتا ہے‘‘۔[1]

مشتہرین اور ٹی وی چینلز نے اپنے مفاد کی خاطر اشتہاراتی زبان کو اتنا عام کیا کہ جسے اردو زبان کے بے شمار الفاظ غلط تلفظ ادا کرنے سے زبان تو عام ہو رہی ہے لیکن اس کا صحیح تقدس پامال ہو رہا ہے، چنانچہ اردو زبان کی اس صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’مشتہرین جنتا جنار دھن کی Language کو پروان چڑھا رہے ہیں۔
کئی اہم پہلو اور کامیاب اشتہارات اسی زبان میں ہیں۔مشتہرین کہتے ہیں کہ
عوام کی سمجھ میں خالص اردو ہندی یا انگریزی کے بجائے یہ دوغلی زبان بہت
آسانی سے آتی ہے۔چند مثالیں دی جاتی ہیں؛
Life ہو تو ایسی، Hungry کیا؟، Just Munch کرو، What
is your بہانہ، The جوش Machine، انداز سب سے Cool‘‘۔[2]

اسلام مخالف

عہد حاضر کے بے شمار مسائل میں ایک اہم مسئلہ اسلام مخالف بھی ہے۔عابد معز نے سماج کی دیگر ناہمواریوں کی طرح اسلام مخالف مسئلے کو بھی اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔

گزشتہ دو عشروں سے مذہب اسلام پر الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا کا یلغار جاری ہے۔جنہوں

---

[1] ۔ایک نئی زبان وجود میں آرہی ہے۔اعتماد۔6/نومبر۔2006ء

[2] ۔اک نئی زبان وجود میں آرہی ہے۔اعتماد۔6/نومبر۔2006ء

نے اسلامی نظریات وثقافت پر گہری ضرب لگانے میں کلیدی کردارادا کررہے ہیں۔ وہ ہرانسانی سوز واقعہ کو اسلام سے جوڑ دیتے ہیں۔ داڑھی اور مخصوص ٹوپی پہنے والوں کو دہشت گرد بتا کر اسلام اوراس کے ماننے والوں کو بدنام کیا جارہا ہے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے سلسلہ وار پروپگینڈہ سے سیدھے سادے لوگ داڑھی اور مخصوص ٹوپی سے خوف کھاتے ہیں۔ چنانچہ عابد معز اسلامی نظریات اور ثقافت پر ہونے والے پروپیگنڈے کواس طرح طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مسافرین کا حلیہ بھی ہوائی خوف کا باعث بن سکتا ہے۔ داڑھی اور مخصوص ٹوپی اگر ساتھ ہوتو ہوائی خوف کا ڈرآنا لازمی ہے۔ میڈیا نے داڑھی اورٹوپی کی اتنی تشہیر کی ہے کہ یوروپ اورامریکہ میں لوگ اس حلیہ کو ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ان بے چاروں کواس کہاوت کا علم ہی نہیں ہے کہ کرتا مونچھ بلکہ بغیر مونچھ والا ہے اور پکڑا جاتا داڑھی والا ہے......!''۔

عابد معز کا خیال ہے کہ ہمارے ملک کا میڈیا بھی ہمیشہ نکاح اور طلاق جیسے موضوعات کو لے کر اسلام اورمسلمانوں پر وقتاً فوقتاً کیچڑ اُچھالتا ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ اسلام میں مذہبی ، معاشرتی ،سماجی ، سیاسی اور دیگر مسائل انسانی فطرت سے عیاں ہیں۔ طلاق کو ناپسندیدہ عمل مانا جاتا ہے۔ اگر فریقین میں نباہ نہ ہوتو علیٰحدگی ممکن ہے۔ جب کہ غیر مسلموں میں شادی دائمی ہوتی ہے۔ علیٰحدگی ممکن نہیں ہے۔ اسلام میں طلاق کی سہولت حاصل ہونے کے باوجود مسلمانوں میں علیٰحدگی کا تناسب دوسرے مذاہب سے کم ہے۔ اس کے باوجود میڈیا کی نظر صرف اسلام اوراس کے قوانین پر ہی رہتی ہے۔ چنانچہ عابد معز ان تمام عناصر پر روشنی ڈالتے ہوئے میڈیا کو اسلام مخالف قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کے میڈیا میں طلاق اکثر و بیشتر موضوع بحث رہتا ہے۔ غیر مسلموں میں شادی دائمی ہوتی ہے۔ علاحدگی ممکن نہیں ہے۔ اسلام ایک عملی

ا۔ ہوائی ڈر۔ اعتماد۔ 13/نومبر 2006ء

مذہب ہے۔ اگر ازدواجی زندگی کامیاب نہ ہوسکے تو اسلام میں فریقین علاحدہ ہوسکتے ہیں۔لیکن طلاق کو ناپسندیدہ عمل مانا جاتا ہے۔ طلاق کی سہولت حاصل ہونے کے باوجود مسلمانوں میں علاحدگی کا تناسب دوسروں سے کم ہے۔

یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ بعض ہندو فرقوں میں بیوہ دوسری شادی نہیں کرسکتی ۔ ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں تین کروڑ بیوائیں موجود ہیں''۔ [1]

آج سارا عالم دہشت گردی کا شکار ہوگیا ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں دہشت گردی کو اسلام سے جوڑتے ہیں۔ ان کے پروپیگنڈے سے ہر ملک کا مسلمان سیاسی، ذہنی اور مالی طور پر پریشان ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان ساری دنیا میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ایک نظیر ہے۔ پھر بھی اس بدلتے ہوئے ماحول سے بچ نہ سکا۔ آج یہاں کے حکمراں، ایڈمنسٹریٹ لوگ اور پرنٹ یا الکٹرانک میڈیا وغیرہ نے کبھی سیدھے یا غیر محسوس طریقے سے ہر فساد کی ذمہ داری مسلمانوں پر لگاتے ہیں، جب کہ ان فسادات میں جانی مالی نقصانات بھی مسلمانوں کا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ عابد معز مسلمانوں پر ہونے والی ان زیادتیوں کو دیکھتے ہوئے فسادات کو مسلمانوں کا مقدر کہتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''محسوس ہوتا ہے کہ فسادات ہندوستانی مسلمانوں کا مقدر بن گئے ہیں۔ وزارت داخلہ کے اعداد شمار کے مطابق پچھلے چند برسوں میں ہر سال تین سو کے لگ بھگ فسادات ہوئے ہیں۔ یعنی ہر دن کہیں نہ کہیں فساد ہوتا ہے۔ اقلیت میں ہونے کے سبب جانی مالی نقصان مسلمانوں کا ہوتا ہے اور پھر فسادات کی ذمہ داری بھی انہی پر ڈالی جاتی ہے۔ نوجوانوں کو گرفتار کر کے ان پر مختلف مقدمات چلائے جاتے ہیں۔ مسلم آبادی کو مستقل کرفیو کی مصیبت میں جھونکا جاتا ہے۔ پولس کی زیادتیاں بھی مسلمانوں کے حصے میں آتی ہیں۔ فسادات سے پیدا

---

[1]۔ ہندوستانی مسلمانوں کے معاشرتی مسائل۔ اردو ہے جس کا نام۔ زیر طبع

ہونے والے معاشرتی مسائل کا بوجھ بھی مسلمانوں کو اٹھانا پڑتا ہے۔یتیم بچوں۔
لٹی ہوئی نوجوان لڑکیوں، بیوہ عورتوں اور ٹوٹے بکھرے خاندانوں کے معاشرتی
مسائل کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جن پر ایسی قیامت ٹوٹ پڑتی ہے''۔

مغربی تہذیب کی تقلید

عابد معز کے طنز و مزاح کا ایک اہم موضوع مغربی تہذیب اوراس کی تقلید بھی ہے،مشرقی تہذیب و معاشرہ بھی اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے اس کی اپنی مخصوص بنیادیں ونظریات ہیں۔لیکن افسوس کہ آج کی ہماری نئی نسل مغرب کی اندھی تقلید کے رنگ میں رنگی جارہی ہے۔جس کی وجہ سے اپنے آباء واجداد کے طور طریقے اوران کے کارناموں سے بے بہرہ ہوتے ہوئے آج اپنے باپ دادا کے ناموں سے بھی غافل ہوگئے ہیں۔ چنانچہ عابد معز مغربی تہذیب کی تقلید میں ڈوبی ہوئی مشرق کی نئی نسل پر ضرب کاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک ٹی بوائے سے نام دریافت کیا گیا تو اس نے قاسم بتلایا۔ باپ کا نام پوچھا تو اس نے کہا ''بڑے میاں''باپ کے بعد دادا کا نام کا سوال ہوا۔اس بے چارے کو اپنے دادا کا نام یاد نہ تھا۔ذہن پر زور دے کر سوچتا رہا اور ادھر حیرت سے سری......سری............! کا اصرار ہونے لگا۔ باوجود کوشش کے نام یاد نہ آیا تو اس نے بتلایا'اینڈ فادر'اس طرح اس کا نام قاسم بڑے میاں اینڈ فادر رہوا۔ یہ واقعہ ہم نے ایک محفل میں سنا تھا''۔ [۲]

آج یوروپی تہذیب کو آرام و آسائش کی تمام تر سہولتیں مہیا ہیں۔اس کے باوجود وہاں کا ہر فرد مضطرب، بے چین اور مایوس نظر آتا ہے۔اپنی بے چینی، گھٹن، مایوسی دور کرنے کے لیے انھوں نے کبھی ماں، باپ، بچوں، بوڑھوں، کسانوں، مریضوں، عاشقوں وغیرہ کا دن منانا شروع کیا۔لہٰذا مشرق والوں نے بھی

---

[۱] ۔ ہندوستانی مسلمانوں کے معاشرتی مسائل، اردو ہے جس کا نام۔زیر طبع

[۲] ۔نام میں کیا رکھا ہے۔اردو نیوز۔جدہ۔8/جون 1994ء

مغربی تہذیب کی تقلید کرتے ہوئے مختلف دن منانے کا رواج شروع کیا ہے۔ عابد معز اپنی بیٹی کے حوالے سے مغربی تہذیب کی تقلید کرنے والوں پر گہرے طنز کے تیر چلائے ہیں؛ کہتے ہیں:

''وطن سے بیٹی نے فون کر کے مبارک بادی دی تو میں نے دریافت کیا کہ کس چیز کی مبارک باد دے رہی ہو؟

ابو بتائے آج کونسا دن ہے؟ بیٹی نے سوال کیا۔

بیٹا آج اتوار ہے، میں نے بیٹی کو آسان سوال کا جواب دیا۔

جون کا مہینہ ہے اور یہ تیسرا اتوار ہے۔ بتایئے آج کیا ہے؟ بیٹی نے اشارہ دیتے ہوئے پہیلی پوچھی۔ ''میری تاریخ پیدائش جون میں نہیں ہے'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ یاد نہیں آرہا ہے کہ آج کیا ہے۔

اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔

بڑھاپے میں یادداشت سے زیادہ تجربہ ساتھ دیتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ۔

''ابو آج آپ کا دن ہے'' بیٹی نے بتایا۔

پتہ نہیں بیٹا کہ میرا بھی دن ہے کوئی دن ہے۔ میں لاعلم ضرور تھا لیکن تعجب نہیں ہوا۔ ہر کسی کا کوئی نہ کوئی دن ہوتا ہے۔

''ابو امریکہ میں اس دن کو فادر ڈے'' کے طور پر منایا جاتا ہے۔ بیٹی مجھے میرے دن کے بارے میں بتانے لگی میں نے اسی کو مبارکباد پیش کی ہے۔ اس دن لوگ اپنے والد کے خلوص اور ان کی خدمات کو خراج و تحسین پیش کرتے ہیں والدین کے ساتھ دن گزارتے ہیں اور انہیں تحفہ دیتے ہیں۔ مبارکباد کا شکریہ۔ میں بیٹی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہنسنے لگا۔ ہاں بیٹا ہمارے یہاں والد صرف ایک دن کے لئے نہیں ہوتے وہ ہر دن ہر وقت کے والد ہوتے ہیں۔ ہم ابو کے خلوص اور محبت کی قدر ہر دن کرتے ہیں لیکن جب امریکہ میں فادر ڈے یعنی یوم پدر، یوم والد یا ابو کا دن منانے کا رواج ہے تو ہمیں بھی منانا پڑے گا ورنہ والد

کے حقوق انسانی یعنی ہیومن رائٹس کا سنگین مسئلہ کھڑا ہوگا۔

اچھا کیا تم نے مجھے یاد کرلیا۔آج کے دن والد کے لئے دعا بھی کی جاتی
ہوگی۔کارڈ بھی بھیجا جاتا ہوگا''۔ [ا]

آج یوروپی عوام مادہ پرستی کے دلدل میں اس حد تک پھنس چکی ہے کہ خاندانی اور معاشرتی حقوق بھول گئی ہے۔ وہاں والدین صرف ایک دن کے ہوتے ہیں اُسی دن وہ اپنے والدین کے ساتھ پیار ومحبت اور خلوص اوران کی خدمات کوخراج تحسین پیش کرتے ہیں، اور سال کے تین سو چونسٹھ دن انہیں بھول جاتے ہیں۔ہم مشرقی ممالک کے لوگ مغرب کی اندھی تقلید کرتے ہوئے مشرقی تہذیب کی بے پناہ پیار محبت کے ٹھاٹیں مارنے والے انقلاب کوانگریزی کے صرف تین لفظوں (انکل، انٹی، کزن) میں محدود کردیا ہے۔اسی تہذیب کے زیراثر آج ہماری نئی نسل اپنے بڑوں کے ناموں سے مخاطب ہورہی ہے۔اس کے برعکس آج سے چالیس پچاس برس پہلے کے بچوں کو اپنے بزرگوں کے القاب اور رشتہ معلوم ہوتا تھا لیکن وہ ان کے ناموں سے واقفیت نہیں رکھتے تھے، چنانچہ ڈاکٹر عابد معز مغربی تہذیب سے متاثر ہوکر پیدا ہونے والی اس اخلاقی گراوٹ پر روشنی ڈالتے ہوئے اس طرح طنز کیا ہے:

''مغرب کی اندھی تقلید نے ماں، باپ، بھائی اور بہن کے بعد سارے رشتہ داروں کوانکل آنٹی اور کزن میں سمیٹ لیا ہے۔تایا، چچا، پھوپھا، ماموں، خالو، اڑوس پڑوس اور دوست احباب کو بلا تفریق و امتیاز انکل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے چاچی، پھوپی، خالہ، ممانی کے ساتھ ملنے جلنے والی خواتین پرآنٹی کا لیبل چسپاں ہوگیا ہے۔ انکل اور آنٹی کی بہ نسبت کزن میں بلا کی وسعت ہے۔ تایازاد، چچازاد، پھوپی زاد، ماموں زاد، خالہ زاد، بھائی بہن اور ہم عمر رشتہ دار سے لے کر محبوب اور محبوبہ تک سب کزن، کی چھایا تلے جمع ہوگئے ہیں۔ بات زیادہ پرانی نہیں ہے۔چالیس پچاس برس پہلے رشتہ داروں کو مخاطب کرنے کے

[ا]۔ایک دن ابو کا۔اردو میگزین 14 جولائی 2000ء

لئے ڈھیر سارے القاب ہوا کرتے تھے۔ خاندان وسیع ہوا کرتا تھا۔ اور اسی حساب سے مخاطب کرنے کے کئی انداز تھے۔ آج خاندان چھوٹا ہونے کے باوجود تنگ دامنی کا یہ حال ہے کہ والدین جیسے چار چھ بزرگوار بھی ''انکل'' اور'' آنٹی'' پکارے جاتے ہیں۔ پہلے والد کے بڑے بھائی تایا ہوتے تھے۔ تایا حضرت ابا یا تایا حضور کہہ کر ان کی عزت میں اضافہ کیا جاتا تھا۔ چچا سے بھتیجے گھل مل گئے ہوتے ہیں۔ چچا میاں، چچا پاشاہ، چچی جان، چاچا اور چاچو جیسے القاب سے والد محترم کے چھوٹے بھائی نوازے جاتے تھے۔ ماں کی بہن خالہ آنٹی کے علاوہ خالہ ماں، خالہ امی، خالہ جان، خالہ بی، بی خالہ اور خالہ پاشاہ ہوا کرتی تھیں۔ اس طرح تائی چچی، پھوپی، ممانی، خالو اور پھوپھا بھی مختلف القاب سے مختلف القاب سے یاد کئے جاتے تھے۔ زمانے کی ترقی کا بھلا ہو جس نے پیار اور محبت کے سب رشتے مٹا دیے اور سب کو ''انکل'' اور ''آنٹی'' بنا دیا''۔[۱]

مغربی تہذیب کا ہی اثر ہے کہ آج کی نئی نسل صرف دو ہی رشتے جانتی ہیں یعنی انکل اور آنٹی دوسری جانب لوگ بھی انکل اور انٹی ہی کہلانا پسند کر رہے ہیں۔ چنانچہ عابد معز مغرب زدہ معاشرے کی اس صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''انٹی کہلانے کا ایک فائدہ ہوا کہ حقیقی رشتہ ظاہر نہ ہونے سے عمر چھپی رہتی ہے۔ آنٹی کم ہوتی ہے۔ اور اینی یا آنی تو آنٹی سے بھی کم عمر ہوتی ہے۔ جب کہ خالہ عمر رسیدہ اور بھاری بھر کم شخصیت کی مالک ہوتی ہے۔ آنٹی کے دور میں کسی خاتون کو خالہ اماں یا خالہ جان کہنا کسی مرد کو چچا کہنے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ایک خاتون کو بی خالہ کہہ کر مخاطب کیا گیا تو آپے سے باہر ہوگئیں۔ کچھ دیر بعد جب وہ نارمل ہوئیں تو ان سے غصہ کا سبب دریافت کیا گیا۔ انہوں نے عجیب بات بتائی خالہ کی عمر ۶۰ برس سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور میری عمر تو خالہ کی

۱۔ ''انکل اور انٹی''، اردو نیوز۔ ۱۹۹۴ء اگست ۱۴۔

آدھی عمر سے بھی کم ہے۔اس لئے مجھے خالہ کہنے سے غصہ آیا تھا‘‘۔ ۱؎

غرض مغرب کی اندھی تقلید نے ماں باپ بھائی بہن کے بعد ساری رشتہ داری برادری کو انکل، انٹی اور تایازاد، چچازاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد، خالہ زاد، بھائی، بہن ہم عمر رشتہ دار سے لے کر محبوب اور محبوبہ تک کزن میں سمٹ گئے ہیں۔

یوروپ وامریکہ

تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے پاس تہذیبی ورثہ بہت کم ملتا ہے امریکہ دریافت ہوئے صرف چار سو سال ہوئے ہیں۔ایک آزاد ملک کی حیثیت سے امریکہ کا تہذیبی ورثہ صرف دو سو سال کا ہے۔اکثر یوروپی قومیں امریکہ کو نابالغ (بچہ) قوم مانتے ہیں۔انہیں اجڑا اور جاہل کہہ کر چڑاتے ہیں۔عابد معز اپنے مضمون ’’جنت کا امیگریشن‘‘ میں امریکہ اور یوروپ کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’یوروپ کے مقابلہ میں امریکہ بچہ ہے۔ برطانوی شہریت رکھنے والے ایک ساتھی یوروپ کے گن گانے لگے۔ یوروپ کی تاریخ اور تہذیب صدیوں پرانی ہے۔امریکہ تو اب بام عروج پر آیا ہے۔میں تقریباً دنیا دیکھ چکا ہوں۔لیکن جو بات یوروپ میں ہے کہیں بھی نہیں ہے۔ یوروپ کے کئی شہر رہن سہن کی سہولتوں کے اعتبار سے بہترین شہر میں شمار ہوتا ہے‘‘۔ ۲؎

ڈاکٹر عابد معز کا خیال ہے کہ کوئی شخص بہت زیادہ رائٹ رائٹ الا پنے لگتا ہے تو یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ امریکن امیگرنٹ ہے یا وہاں جانے کے شدید خواہش رکھتا ہے۔امریکن گرین کارڈ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ’’سبھی کا خیال ہے کہ West is the best اور کوشش بھی اسی طرف

۱؎ ۔’’انکل اور انٹی‘‘ سگ گزیدہ۔ص:۵۴

۲؎ ۔جنت کا امیگریشن۔اعتماد۔۷رجنوری ۲۰۰۸ء

کوچ کرنے کی ہوتی ہے۔گرین کارڈ مل جائے تو کیا کہنا۔محسوس ہوتا ہے کہ زمین پر جنت کا اقامہ بن گیا۔دنیا کے نمبرون ملک کے شہری بنتے ہی رکھ رکھاؤ اور رہن سہن میں بلکہ چال چلن میں تک بدلاؤ آجاتا ہے۔ بہت زیادہ رائٹ رائٹ الاپنے لگتے ہیں۔گفتگو میں جو رائٹ رائٹ کرتا ہے تو یقین کیجئے کہ وہ امیرکن امیگرنٹ ہے یا وہاں جانے کی شدید خواہش رکھتا ہے''۔ [۱]

یوروپ والوں نے پیسہ کے لیے فیشن کو اپنایا۔فیشن سے ان کے معاشرے میں اخلاقی گراوٹ آئی۔فیشن اور اخلاقی گراوٹ کی کمی سے وہ سرد ممالک میں رہتے ہوئے اپنے جسم پر کپڑے کا استعمال کم کرتے ہیں۔انہوں نے اپنے جسم کی نمائش کرنے کو فیشن سمجھ لیا ہے۔ڈاکٹر عابد معز کا خیال ہے کہ مشرقی لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے مہذب کہلوانے کے لیے مغربی طرز زندگی اپنانا چاہتے ہیں،لیکن قدرتی طور پر ان کی کچھ مجبوریاں ہیں۔چنانچہ یوروپ کی تہذیب اور مشرقی عوام کی مجبوریوں کے حوالے سے مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

''ہم مچھروں کے ڈر سے اپنے آپ کو کپڑوں میں بھی چھپاتے ہیں۔اپنے قد سے دو تین گنا زیادہ لانبی ساڑی،دھوتی،لنگی،دوپٹہ،پگڑی پہنتے ہیں یا لانبا کرتا پاجامہ اور شلوار قمیض زیب تن کرتے ہیں،یوروپ اور امریکہ کے پاس ہمارے فیشن پر حیرت کرتے ہوں گے کہ گرم ملک میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو ڈھانک کر کیوں رکھتے ہیں۔وہ ہماری مجبوری کیا جانیں۔ان کپڑوں کو پہننے میں مشرقی روایات کی پاسداری سے زیادہ مچھروں سے ڈسے جانے کا خوف حاوی رہتا ہے۔خواتین شرم وحیا کی مورت ہیں،مرد حضرات تک اپنی ٹانگیں مچھروں کو دکھانے سے اعتراض کرتے ہیں۔یوروپ اور امریکہ میں موسم تھوڑا سا بھی گرم ہوتا ہے تو کپڑے اتر جاتے ہیں۔پچھلے برس جب درجہ حرارت تین

۱۔ جنت کا امیگریشن۔اعتماد۔۷/جنوری ۲۰۰۸ء

درجہ سنٹی گریٹ ہوا تب وہاں لوگوں کے جسم پر چند انچ طویل ایک یا دو کپڑے ہی
باقی رہ گئے تھے۔ اگر یوروپ اور امریکہ کی دیکھا دیکھی ہم ویسا ہی فیشن کرنے
لگیں تو معلوم نہیں پھر ہمارا کیا حشر کریں گے''۔ ا

ڈاکٹر عابد معز کا کہنا ہے کہ دنیا میں نہ صرف بھوکے لوگ کم ہوئے ہیں بلکہ موٹے لوگوں کی تعداد میں تشویش ناک حد تک اضافہ بھی ہوا ہے۔ موٹاپا اب وبائی شکل اختیار کر رہا ہے۔ ماہرین نے انتباہ دیا ہے کہ اگر موٹاپے کی وبا کو روکا نہ گیا تو انسانی صحت کو بہت بڑے خطرات سے دو چار ہونا پڑے گا۔ موٹاپے کا ایک سبب یوروپ و امریکی غذائی (فاسٹ فوڈز) اور مشروبات ہیں۔ امریکی مشروبات اور فاسٹ فوڈز وہاں بھی ملتے ہیں، جہاں پینے کے صاف پانی اور تازہ غذا ملنا دشوار ہے۔ چنانچہ امریکی غذاؤں اور مشروبات کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''لوگ خود سے موٹے ہو رہے ہیں یا وہ امریکیوں کی نقل کرتے ہوئے اپنا
وزن بڑھا رہے ہیں لیکن دنیا کو موٹا کرنے میں اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ امریکی
مشروبات وہاں بھی ملتے ہیں جہاں پینے کے لئے صاف پانی دستیاب نہیں ہے
اور فاسٹ فوڈز وہاں بھی ملتے ہیں جہاں تازہ غذا ملنا محال ہے''۔ ۲

ڈالر امریکہ کا سکہ ہے لیکن دنیا کے مختلف ممالک کاروبار امریکہ کے سکے میں کرتے ہیں۔ پٹرول کی طرح سونے کا دام بھی بین الاقوامی مارکٹ میں طئے ہوتا ہے اور ڈالر میں خرید و فروخت کیا جاتا ہے۔ ڈالر مضبوط ہوتا ہے تو مہنگائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھار وقتی طور پر کمزور بھی ہوتا ہے اتنا بھی کمزور نہیں ہوتا کہ روپیہ، درہم، ریال، وغیرہ کے مساوی ہو جائے مہنگائی کا ایک سبب امریکی ڈالر ہے۔ عابد معز امریکی ڈالر کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''اندازہ ہوا کہ ڈالر بھی ہم غریبوں کو پریشان کرنے میں پٹرول سے پیچھے

ا۔ پھر ہم سے بازی مار گئے۔ اعتماد۔ ص:95۔ 7 / اگست 2006ء

۲۔ بھوکی دنیا سے موٹی دنیا تک۔ اعتماد۔ ۱۱ / ستمبر ۲۰۰۶ء

نہیں ہے۔ پٹرول کی قیمت خود ڈالر میں ہوتی ہے۔ ڈالر مضبوط ہوتا ہے تو مہنگائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ڈالر کب مضبوط اور کب کمزور ہوتا ہے اس بات کا فیصلہ امریکہ کرتا ہے۔ ڈالر امریکہ کا سکہ ہے لیکن دنیا کے مختلف ممالک کاروبار امریکہ کے سکہ میں کرتے ہیں۔ یوں ''ہینگ لگے نہ پھٹکڑی رنگ چوکھا آئے'' میرے ایک دوست کہتے ہیں کہ اقوام متحدہ یا کسی معاہدے کی نہیں چلتی دنیا میں ڈالر کا راج چلتا ہے۔ امریکہ میں بڑے بڑے ساہوکار چین اور آرام سے بیٹھے ڈالر کو اپنے فائدے کی خاطر کمزور اور مضبوط بناتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر مضبوط ہی کرتے ہیں، ہوش سنبھالنے کے بعد سے میں نے ڈالر کو مضبوط ہوتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔ کبھی کبھار وقتی طور پر ڈالر کمزور بھی ہوتا ہے لیکن اسے اتنا بھی کمزور نہیں ہونے دیتے کہ روپیہ، ٹکہ، انگٹ، دینار، ریال اسے آنکھیں دکھا سکیں''۔[1]

یوروپ اور امریکیوں نے ہوشیاری و چالبازی سے ڈالر اور دوسری کرنسیوں میں ایک عجیب سا تعلق پیدا کر دیا ہے۔ ڈالر مضبوط ہوتا ہے تو دنیا کی بیشتر کرنسی کمزور ہوتی ہیں اور جب ڈالر کمزور ہو جائے تو دنیا میں مہنگائی بڑھ جاتی ہے۔ اسی لیے ساری دنیا کے ماہرین معاشیات اور سیاست داں مل کر ڈالر کو کمزور ہونے نہیں دیتے۔ اس کی وجوہات عابد معز نے اس طرح بیان کی ہے کہتے ہیں:

''ڈالر اُٹھتا ہے تو روپیہ کم ہوتا ہے۔ روپیہ ہی کی بات نہیں ہے، دنیا کی دیگر کرنسی سوائے دو چار کو چھوڑ کر ڈالر سے متاثر ہوتی ہے۔ اسی لیے ہوشیار لوگ اپنی جمع پونجی مضبوط کرنسی میں محفوظ رکھتے ہیں۔ ماہرین معاشیات کا خیال ہے کہ سونے کی بڑھتی ہوئی قیمت نے ڈالر کو سنبھال رکھا ہے سونا اوپر ہوتا ہے تو ڈالر نیچے آتا ہے۔ ڈالر کمزور ہونے سے سونا مہنگا ہوتا ہے''۔ [2]

سونا ہمیشہ ہی سے قیمتی رہا ہے۔ وجوہات کئی ہیں دنیا کی کم از کم آدھی آبادی اسے بہت عزیز رکھتی

---

[1]۔ پٹرول، ڈالر اور گولڈ۔ اعتماد۔ 4/ڈسمبر۔ 2006ء

[2]۔ پڑول۔ ڈالر اور گولڈ۔ اعتماد۔ 4/ڈسمبر 2006ء

ہے۔اور اسے سینے سے لگائے اور چہرے پر سجائے اتراتی پھرتی ہے۔ایک عام تصور ہے کہ ساری دنیا میں سونے کی سب سے زیادہ کھپت ہندوستان میں ہوتی ہے۔لیکن عابد معز کا کہنا ہے کہ ہندوستان پر محض یہ ایک الزام ہے۔اُن کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ سونا امریکہ کے پاس جمع ہے۔چنانچہ امریکہ کی اس الزام تراشی کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کہتے ہیں کہ سُنار تھوڑا تھوڑا کر کے بہت زیادہ سونا اکٹھا کر لیتا ہے۔یہی بات امریکہ پر صادق آتی ہے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ سونا امریکہ کے پاس جمع ہے۔خواہ مخواہ ہی ہندوستان بدنام ہے کہ یہاں سونے کی کھپت سب سے زیادہ ہے۔زیورات کی شکل میں سونا نظر آتا ہے جب کہ بنکوں میں جمع سونا دکھائی نہیں دیتا''۔

امریکہ کی خفیہ ایجنسی (سی آئی اے) کے خفیہ ذخائر دنیا کے ہر ممالک میں ہیں۔سی آئی اے درندگی،سفاکی اور بربریت کا عالمی ریکارڈ رکھتی ہے۔خانہ جنگیں،توڑ پھوڑ،تشدد میں انتشار،قتل وغارت گری وغیرہ سی آئی اے کی موجودگی میں ہوتے ہیں یا اس کی پیداوار ہیں۔وہ اپنے حصول مقصد کے لیے کبھی کبھار اپنا نقصان بھی اٹھالیتے ہیں۔جس طرح 9/11 کے واقعہ کے بعد عراق اور افغانستان کی تباہی و بربادی کی کہانیاں ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔چنانچہ عابد معز امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کی حکمت عملی پر طنز کرتے ہوئے یوں اظہار خیال کیا ہے:

''بے اور بے نے عراق میں ڈبلیو ایم ڈی کا شوشہ چھوڑا اور ان خطرناک کیمیائی جراثیمی اور ایٹمی ہتھیاروں کے خزانے کی تلاش میں نکل پڑے۔تمام نے یک آواز ہو کر عراق پر چڑھائی کی مخالفت کی لیکن بے اور بے کسی کی پرواہ کئے بغیر عراق میں داخل ہو گئے اور پڑاؤ ڈال دیا بے اور بے کے ہاتھ کوئی ہتھیار نہ آیا لیکن افغانستان کے برخلاف یہاں صدام حسین اینڈ پارٹی زندہ اور مردہ

۱۔سونے کی بھی ریکارڈ قیمت۔اعتماد۔17/دسمبر 2007ء

پکڑی گئی۔ پھر عراق میں تباہی اور قتل و غارت گیری کا بازار گرم ہوا جس کے ہم
سب خاموش تماشائی ہیں۔ میڈیا تک عراق کی بربادی کی کہانی بتاتے اور سناتے
تھک سا گیا تھا۔ تھک کر میڈیا اب صرف مرنے والوں کی گنتی کرتا ہے۔ زخمیوں
کا حساب رکھنا ممکن نہیں رہا''۔

عراق پر چڑھائی کا اصل مقصد صرف عراق کا پٹرول حاصل کرنا تھا۔ اس نے ساری دنیا میں اس طرح بے وقوف بنایا کہ عراق میں جمہوریت کے نہ ہونے سے ساری دنیا میں پٹرول مہنگا ہو رہا ہے۔ دنیا کو امن کے لیے افغانستان پر چڑھائی ناگزیر ہے۔ غرض امریکہ کے پالیسی و پروگرام کے تحت عراق اور افغانستان تباہی سے کھنڈر ہوگئے بعد میں پٹرول کے دام کم ہونے کے بجائے چار گنا کا اضافہ ہی ہوا اور نہ ہی دنیا کو امن وچین ملا۔ امریکہ کی غلط حکمت عملی کی وجہ سے ساری دنیا مہنگائی سے پریشان ہے۔ لکھتے ہیں:

''ستمبر 2003ء میں خام تیل پچیس ڈالر کے آس پاس تھا اور ان چار برسوں میں چار گُنا اضافہ ہوا ہے۔ اس سال حد ہوگئی، خام تیل کے دام میں چالیس فیصد ''ترقی'' ہوئی ہے۔ کسی دوسری شئے کی قیمت میں شاید اس تیزی سے اضافہ نہیں ہوا ہوگا۔ ایسا کیوں ہوا ہے۔ سارا کریڈٹ ایک شخص کو جاتا ہے۔ جس نے چار سال پہلے ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود عراق پر چڑھائی کی اور اب تک برسر پیکار ہے۔ اس نے پٹرول کے دام کم ہونے اور امن قائم کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن دنیا کو نہ امن اور چین ملا اور نہ ہی تیل کے دام کم ہوئے۔ ہزاروں لوگوں نے جان گنوائی عمارتیں کھنڈر اور شہر ویران ہوئے اس کے باوجود اس کا کہنا ہے کہ وہ کامیاب ہے اب ایسے شخص کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ اس کے دو ایک اہم منصب اشخاص اسے کھلے عام بے وقوف کے خطاب سے نواز رہے ہیں۔ اسے بیوقوف کہیے یا

نو دو گیارہ کے پانچ سال، اعتماد، 8 ستمبر 2006

نادان تیل بہرحال سنچری کے قریب پہنچ گیا ہے‘‘۔ ۱؎

امریکہ واحد سوپر پاور کی حیثیت بھی رکھتا ہے وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر دنیا میں اپنی مرضی کی جمہوریت چاہتا ہے۔ اگر کسی ملک میں جمہوری نظام ہے، لیکن اس کی مرضی کے خلاف ہو تو اسی جمہوریت بھی اس کو پسند نہیں آتی۔ عابد معز امریکہ کی خارجہ وسیاسی پالیسی پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’بے اور بے جمہوریت اور جمہوری نظام کے مدح ہیں۔ اور ساری دنیا میں جمہوری حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جمہوری حکومت لادنے کے لیے وہ دونوں عوام کی پسند اور رائے تک پرواہ نہیں کرتے۔ بے اور بے کی باتوں اور حرکات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی جمہوریت دنیا والوں کی جمہوریت سے مختلف ہے۔ اگر تم ہمارے ساتھ نہیں ہو تو ہمارے مخالف ہو۔ قسم کی جمہوریت وہ چاہتے ہیں۔ اگر جمہوری نظام کا نتیجہ ان کی مرضی اور منشا کے خلاف آئے تو انہیں ایسی جمہوریت بھی پسند نہیں آتی۔ اسے وہ رد کردیتے ہیں‘‘۔ ۲؎

امریکہ اپنی مصنوعات، ادویات اور دیگر اشیاء بھی ایک پالیسی و پروگرام کے تحت فروخت کرتا ہے۔ جیسے برڈ فلو کی بیماری یہاں کے میڈیا سے نشر ہوئی۔ دنیا کے بیشتر مما لک کے افراد قدرتی اور مصنوعی طور پر بیمار ہوں گے۔ اس نئی بیماری کی دوا اور اس کی تمام وجوہات امریکہ کے پاس موجود ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز امریکہ کی اس پالیسی کو یوں طنز کا ہدف بنایا ہے:

’’امریکہ میں برڈ فلو نہیں ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ وہاں وائرس کے خلاف دوا پہلے سے تیار ہے۔ برڈ فلو کے خلاف کام آنے والی دوا کا منبع امریکہ ہے اور یہیں سے یہ دوا دوسرے ملکوں کو مہیا کی جارہی ہے۔ امریکی امور کے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ برڈ فلو کا ہوّا اسی لیے کھڑا کیا گیا ہے کہ ان کا کاروبار

۱؎ ۔تیل کی سنچری۔اعتماد۔19/نومبر۔2007ء

۲؎ ۔نودو گیارہ کے پانچ سال۔اعتماد۔ 18/ستمبر۔2006ء

خوب چلے پیچھے چند برسوں میں امریکہ کے کارناموں کو دیکھتے ہوئے یہ بات
غلط بھی نہیں معلوم ہوتی ہے''۔

ڈاکٹر عابد معز برڈ فلو کے تعلق سے لکھتے ہیں پرندوں کا فلوایوین یا برڈ فلو کہلاتا ہے۔آج تک کوئی پندرہ اقسام کے فلوز دریافت ہوئے ہیں۔ان میں H5NI سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ایوین یا برڈ فلو عموماً پرندوں کو متاثر کرتا ہے اور پرندوں سے پرندوں میں پھیلتا ہے۔لیکن انسانوں سے انسانوں تک اس مرض کے پھیلنے کے شواہد نہیں ملے۔

آج امریکہ اپنے آپ کو انسانیت کا خیر خواہ اور غریبوں کا مسیحا کہتا ہے۔ان ممالک کے لئے ، جہاں سے اس کو کچھ حاصل ہو، مثلاً پٹرول، ڈیزل اور یورینیم وغیرہ اس کے برعکس ان ممالک جہاں سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تو اس کی خارجہ پالیسی تبدیل ہوجاتی ہے۔ چنانچہ عابد معز نے سونامی کے حوالے سے امریکی پالیسی کو اس طرح بے نقاب کیا ہے لکھتے ہیں:

''سونامی بین الاقوامی سیاست بھی بن گئی۔ دنیا کا بلا شرکت غیر سوپر پاور ملک کے صدر چھٹی منا رہے تھے۔ تین دن تک وہ چپ رہے۔لوگ ان کی ہمدردی کے دو بول کے لیے ترس گئے۔لیکن انہیں کیا پڑی تھی کہ وہ لب کشائی کرتے ! معاملہ ان کے دوست ملکوں کا تھا اور نہ ہی متاثر ملکوں میں تیل نکلتا ہے۔سونامی مسئلہ پانی کا ہے اور وہ بھی کھارے پانی کا۔ جب تک روپیہ خرچ کر کے سمندر کے پانی کو صاف نہیں کیا جاتا وہ کسی کام کا نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ خاموشی سے چھٹیاں مناتے رہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صدر محترم ان تین دنوں میں جغرافیہ کا مطالعہ کررہے ہوں گے کہ بحر ہند کہاں ہے؟ تین دن بعد مشیروں کے یاد دلانے پر اور وہ بھی ہفتہ واری خطاب میں انہوں نے ہمدردی کا اظہار کیا اور مدد کا بھی اعلان کیا، چند مونگ پھلی کے دانوں وانگریزی طریقہ اظہار کے

۱۔ مرغی جان سے گئی۔اعتماد۔27/مارچ2006ء

مساوی مدد اتنی بھی نہ تھی جتنی کہ موصوف کے افتتاح جلسوں پر خرچ کی گئی تھی‘‘ ۔[1]

عابد معز نے جہاں کہیں بھی امریکی مفاد پرستی، غلط حکمت عملی، چالبازی، اخلاقی گراوٹ، بے اعتدالی اور ناہمواری کو محسوس کیا اپنے قلم کے جادو سے طنز پر طنز کیا، وہیں انہوں نے یوروپ و امریکہ کی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں کوتاہی نہیں برتی، بلکہ کھلے اور دل صاف گوئی سے خراج تحسین بھی پیش کیا ہے جیسے ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’چلنا ترقی بھی ہے۔ جو چلتے ہیں وترقی کے زینے طے کرتے جاتے ہیں ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں کو دیکھئے انہوں نے چلنے کو اپنی زندگی کا شعار بنالیا ہے۔ وہاں کے لوگ چلتے، جاگنگ کرتے اور دوڑتے ہیں۔ مراتھین دوڑ، منعقد کرتے ہیں ان ملکوں کے قائدین تک دوڑتے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ ٹی وی پر امریکہ کے صدر کو جاگنگ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ترقی کے لیے سارا ملک دوڑ رہا ہے۔ اس کے برخلاف تیسری دنیا کے ملکوں کا جائزہ لیئے، یہاں عوام چلتے ہیں اور نہ رہنما، عوام تو پھر بھی کچھ دور چل لیتے ہیں۔ کبھی کبھار دوڑ بھی لیتے ہیں۔ پولیس اور فوج کے آگے یا پیچھے، لیکن ان کے قائدین ہل نہیں سکتے، انہیں سہارا دے کر چلایا جاتا ہے، پکڑ کر اٹھایا جاتا ہے اور بٹھایا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ان کی حکومتیں تک کسی سہارے کے بغیر نہیں چلتیں یہ سہارا کبھی فوج دیتی ہے تو کبھی ملک کے باہر سے ملتا ہے۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں جب کوئی چلتا ہی نہیں تو پھر ترقی کیوں کر ہو‘‘۔ [2]

جنگ ودہشت گردی

دوسری عالمی جنگ کے بعد سابق عالمی ادارہ لیگ آف نیشنز کو ختم کر کے 1945ء میں اقوام متحدہ

---

[1] ۔ میں ہوں۔ اخبار منصف، حیدرآباد۔ 5/مارچ۔ 2013۔

[2]۔ جیون چلنے کا نام۔ اردو میگزین۔ 15/ستمبر 2000ء

کے نام سے موجودہ عالمی ادارہ قائم کیا گیا۔اس ادارے کے منشور کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''یہ ادارہ آئیندہ نسلوں کو جنگ کی لعنت سے بچانے کے مقصد سے قائم کیا گیا ہے۔تمام اقوام کو مساویانہ حقوق دئے جائیں گے۔ چنانچہ بین الاقوامی عدالت کا قیام بھی اسی سلسلے میں لایا گیا۔آفات سماوی کے متاثرہ ممالک کو انسانی بنیادوں پر مدد دینا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ جنگ کی لعنت سے محفوظ رکھنے میں یہ ادارہ ناکام دکھائی دیتا ہے۔اس ادارے کے قیام کے بعد سے اب تک تقریباً 45 جنگیں ہوئیں۔آج بے وقت اور بے سبب موت زندگی کے تعاقب میں لگی ہوئی ہے۔ وقت سے پہلے زندگی ختم ہورہی ہے۔کرہ ارض پر جدھر دیکھئے اُدھر زندگی موت سے پناہ مانگتی نظر آتی ہے۔اس دہشت گرد ماحول میں زندگی اور موت کا جائزہ لیتے ہوئے عابد معز لکھتے ہیں:

> ''کرہ ارض پر بعض مقامات ایسے ہیں جہاں برسوں سے لڑائی جاری ہے۔ کوئی آزاد ہونا چاہتا ہے تو کوئی انہیں محکوم بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ مرنے اور مارنے والے کو کوئی مجاہد مانتا ہے تو کوئی دہشت گرد قرار دیتا ہے۔ بارود کے ڈھیر پر انسان پیدا ہوتے ہیں۔ بندوقوں سے کھیلتے ہوئے پلتے ہیں۔ مسیں بھی نہیں بھیگیں کہ مزائل اٹھائے لڑنے چلے۔ پیٹ بھرنے کے لیے روٹی نہیں ملتی ،تن ڈھانکنے کے لیے کپڑے نہیں ہوتے اور پیروں میں پہننے کے لیے جوتے دستیاب نہیں ہیں لیکن مرنے اور مارنے کے لیے بندوق گرینیڈ، بم اور نہ جانے کیا کچھ حاصل ہے''۔ ہر ملک کو پڑوسی ملک سے خطرہ ہے ۔ دنیا میں عجیب سیاست ہورہی ہے۔آج سیاست ہمیں زندہ رکھنے سے زیادہ مارنے کے درپے ہے۔ایک دوسرے سے ڈر کر ہر کوئی اپنا دفاع مستحکم کرنے کی جستجو میں ہے۔ ہتھیار بناتا اور خریدتا ہے۔مہلک سے مہلک ہتھیار وجود میں آرہے ہیں جو انسان کو آناً فاناً ختم کر دیتے ہیں یا تڑپا تڑپا کر مارتے ہیں ایک اندازہ کے مطابق کرۂ ارض پر ہتھیاروں کا اتنا ذخیرہ ہے جو دنیا کو دو چار مرتبہ تباہ و تاراج

کرسکتا ہے۔ [1]

آج ایسا کوئی ملک نہیں ہے جہاں پر انسانیت چین وسکون کی زندگی جی رہی ہو۔ ہر طرف بے چینی کی نہ ختم ہونے والی لہر چل رہی ہے۔ اس کی اصلی وجہ دنیا پر اجارہ داری قائم کرنے کی مذموم منصوبہ بندی ہے۔ دنیا کے کسی بھی ملک کا تجزیہ کرلیا جائے وہاں پر عدم استحکام کے پیچھے استعماری طاقتیں خصوصاً امریکہ، روس، فرانس، انگلینڈ، چین کا ہاتھ ضرور ہوگا۔ ان طاقتوں کا سب سے کارآمد ہتھیار ان کی خفیہ ایجنسیاں ہیں۔ اپنے مفادات کی تلاش نے کرہ ارض پر نہ ختم ہونیوالی بے چینی اور تذبذب کو برقرار رکھا ہے۔ غرض عابد معز دنیا کی اس بدلتی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''فرقہ وارانہ جھگڑے موت کا سامان ہیں۔ اہنساواد، دیش میں مذہب اور ذات پات کے نام پر زندگی کی ہتیا کی جاتی ہے کشمیر پر نظر ڈالئے۔ یقین نہیں آتا جو کبھی زمین پر جنت ہوا کرتی تھی۔ اب دوزخ سے بدتر ہے۔۔ معصوم زندگی کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ سری لنکا میں زندگی کو روٹی کے بجائے گولی ملتی ہے۔ بچوں اور نوجوان لڑکیوں کی فوج کی شکل میں موت زندگی کو شروع ہونے کے روپ ہے۔ پاکستان میں گروہی جھگڑے زندگی کے پیچھے پڑے ہیں۔ موت سستی اور زندگی ارزاں ہے۔ افغانستان میں عرصہ ہوا زندگی موت سے پیہم نبرد آزما ہے۔ بستیاں اجڑ گئیں۔ حسن فطرت غارت ہوا۔ موت سے بھاگ کر زندگی مختلف کیمپوں میں پناہ گزیں ہے فلپائین کا حال دیکھئے۔ اقتدار کا جھگڑا موت کا سبب ہے زندگی کی خوبصورتی کا نشہ ہرن ہوا۔ دوسرے مقامات پر بھی اقتدار کے لیے موت کا کاروبار خوب زوروں پر ہے بنگلہ دیش، نیپال، برما، تھائی لینڈ، کہیں بھی زندگی کو امان نہیں ہے۔ لوگ آپس میں لڑ پڑتے اور چٹکی بجاتے

---

[1] ۔ اتفاق سے زندہ ہیں ہم۔ فارغ البال۔ ص:145-146

مرجاتے ہیں۔اتنی سستی موت شاید پہلے کبھی نہیں تھی‘‘۔

دنیا میں عجیب سیاست ہورہی ہے۔کرہ ارض کے بعض مقامات پر پیٹ بھرنے کے لئے روٹی نہیں ملتی اور تن ڈھانکنے کے لیے کپڑے نہیں ملتے،لیکن مارنے اور مرنے کے لیے بندوق،گرینڈ اور بم دستیاب ہوجاتے ہیں۔موت سے بچنے بھوکی پیاسی زندگی صحرا صحرا بھٹکتی ہے۔عابد معز براعظم افریقہ کی نسل کشی پر ماتم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’نظر التفات،بھوکے اور ننگے افریقہ پر بھی ڈالتے ہیں۔زندگی کو غذا اور پانی مہیا کرنے کے بجائے موت فراہم کی جاتی ہے۔لوگوں کو پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا لیکن معلوم نہیں کہاں سے انہیں زندگی ختم کرنے کے لیے ہر قسم کا ہتھیار مل جاتا ہے۔موت سے خائف بھوکی پیاسی زندگی جنگل جنگل اور صحرا صحرا بھٹکتی ہے قاتلوں نے کہاں زندگی کو بخشا ہے۔کس ملک اور کس شہر کی بات کریں! سومالیہ کا قصہ سنائیں کہ الجیریا کا مقدمہ پیش کریں۔ایتھوپیا کا رونا روئیں کہ سوڈان کا نقشہ کھینچیں۔انگولہ کی کہانی بیان کریں یا جنوبی افریقہ کی نسل کشی پر ماتم کریں۔افریقہ کے چپہ چپہ پر زندگی زندہ رہنے کو ترستی ہے‘‘۔ ۲

وہ لوگ خود کو تہذیب یافتہ اور سوپر پاور جان کر ساری دنیا میں نفرت کی آگ لگانے اور دہشت کے شعلے بھڑکانے کی قیادت کے فرائض انجام دے رہیں۔آج وہی نفرت و دہشت کی آگ خود کے دامن تک پہنچنے لگی ہے یہاں بھی زندگی محفوظ نہیں۔چنانچہ عابد معز کہتے ہیں:

’’چلئے ان مقامات سے فرار ہوکر جمہوریت کی دُہائی دینے اور انصاف کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کے پاس چلتے ہیں۔ یہاں بھی زندگی کو چین کہاں نسل پرستی،جرائم اور نشیلی دوائیں زندگی کے درپے ہیں۔معصوم بچے اسکول ڈرتے

---

۱ ۔مجھے زندہ رہنے دو‘‘۔فارغ البال،ص:40-41

۲ ۔’’مجھے زندہ رہنے دو‘‘۔فارغ البال۔ص:۴۱۔۴۲

ڈرتے جاتے ہیں۔ بندوق کی گولی زندگی کے تعاقب میں لگی ہے۔ زندگی اتنی ارزاں ہے کہ صرف ایک جیکٹ کے عوض لے لی جاتی ہے۔ دواؤں کے عادی لوگ شوقیہ موت کا کھیل کھیلتے ہیں۔

دوسروں کے گھروں میں فتنہ پیدا کر کے اور تباہی مچا کر ہتھیاروں کے زور پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کا جنون ہے۔ لیکن اپنی لگائی ہوئی آگ خود کے دامن تک پہنچنے لگی ہے۔ دنیا کے نمبرون ملکوں میں بھی زندگی محفوظ نہیں ہے۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ بے وقت اور بے سبب موت کو دہشت گردی یا کوئی دوسرا عنوان دیجئے''۔ ۱

یوروپ امریکہ، فرانس، انگلینڈ ترقی یافتہ اور غریب ممالک سے جنگ و دہشت کی سیاست کرتے ہیں۔ قدرت نے بھی سونامی کے ذریعہ ان ملکوں کے شہریوں کے ساتھ اس طرح کا کھیل کھیلا۔ لہٰذا ڈاکٹر معز کا کہنا ہے کہ:

''خود سونامی نے بھی سیاست کی۔ سونامی موجوں نے غریب اور ترقی پذیر ملکوں پر حملہ آور ہوئی۔ اس نے ترقی یافتہ ملکوں کو چھوڑ دیا ترقی یافتہ ملکوں کے باشندوں نے اترا کر کہا کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے قدرتی مصائب کا سامنا کرتے ہیں جس سے انہیں کم سے کم نقصان ہوتا۔ اگر اتنا بھیانک طوفان ان کے یہاں آتا تو صرف چند اموات ہوتیں! وہ بھول گئے کہ سونامی نے ایسے وقت کا انتخاب کیا جب ترقی یافتہ ممالک میں چھٹیاں منائی جارہی تھیں۔ سونامی کے سبب ان کے رنگ میں بھنگ پڑا اور یہ بھی ترقی یافتہ ممالک کے ہزارہا افراد چھٹیاں منانے ان غریب ملکوں کے ساحل پر آئے تھے۔ سونامی کی وجہ سے کئی متمول ملکوں کے لوگ بھی واپس نہ لوٹ سکے''۔ ۲

اردو زبان

دور حاضر میں ہندوستانی قوم کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی مادری زبان سے نا آشنا ہوتی جارہی

۱۔ ''مجھے زندہ رہنے دو'' فارغ البال۔ ص: ۴۲

۲۔ میں ہوں۔ منصف۔ 5/ مارچ۔ 2003ء

ہے۔ مادری زبان ہی دوسرے زبانوں کو جذب کرنے کی صلاحیت بڑھاتی ہے۔قوموں کی تاریخ وتہذیب و تمدن وغیرہ کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ مادری زبان ہوتی ہے۔قوموں کی تہذیب وتمدن ، پہچان و شناخت مادری زبان سے ہوتی ہے۔غرض مادری زبان معاشرے کی ترجمان تہذیب کی آئین اور روحانی سرمائے کی ایک بہترین نعمت ہوتی ہے۔ عابد معز مادری زبان کی اہمیت و افادیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مادری زبان دراصل دوسری زبانوں کو جذب کرنے کی صلاحیت بڑھادیتی ہے۔اس ضمن میں ماہرین ایک پیاری مثال دیتے ہیں کہ مادری زبان سیکھے بغیر دوسری زبان سیکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی تیراکی کی تربیت حاصل کئے بغیر دریا میں کود پڑے۔اگر کوئی تیراکی کا فن جانتا ہو تو وہ کسی بھی نئے پانی میں ہاتھ پاؤں مار سکتا ہے۔۔۔انسانوں کے سمندر میں اپنی شناخت اور پہچان کے لئے مادری زبان پر عبور ضروری ہے۔ مادری زبان ہی کے ذریعہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچایا جاسکتا ہے''۔ [1]

دنیا کی جتنی ترقی یافتہ قومیں ہیں، انہوں نے علوم وفنون کو اپنی مادری زبان کا جامعہ پہنایا ہے۔مثلاً فرانس اور جرمنی جغرافیائی اعتبار سے برطانیہ سے کتنے قریب ہیں۔لیکن ان کے یہاں ذریعہ تعلیم فرانسیسی اور جرمن زبانیں ہیں۔چین اور جاپان اس وقت دنیا کی معاشی اور صنعتی اعتبار سے طاقت ورترین مما لک میں شمار کئے جاتے ہیں، لیکن ان کے یہاں ذریعہ تعلیم چینی اور جاپانی ہی ہیں لیکن ہم ہندوستانیوں میں اپنی مادری زبان کی قدر و قیمت کا احساس نہیں ہے۔آج اردو پڑھنے لکھنے اور جاننے والے اپنی مادری زبان کے روحانی رشتہ سے دور ہوتے چلے جارہے ہیں۔ ہمارے درمیان ایسے کئی افراد ملیں گے جن کو اپنی مادری زبان سے کوئی نسبت نہیں ہے، اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ مجھے اردو نہیں آتی، چنانچہ ڈاکٹر عابد معز نے اردو والوں کی

---

[1] ۔''برصغیر میں زبانوں کا مسئلہ''۔ستمبر ۱۹۸۵ء

اس بے تعلقی کو اس طرح طنز کا نشانہ بنایا ہے لکھتے ہیں:

''نصف صدی سے اردو والے اپنی زبان سے مجرمانہ غفلت برتنے کے ساتھ اس کا خمیازہ بھی بھگت رہے ہیں۔ روزگار اور معاش کے وسائل سے محروم ہوتے ہی اردو والوں کو مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے اور لکھنے پڑھنے میں نقصان دکھائی دینے لگا۔ انہیں اردو بے وقعت نظر آنے لگی۔ اردو سے بے توجہی اور بے رخی کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہمارے درمیان ایسے لوگوں کی بہتات ہوگئی جو سینہ تان کر کہتے ہیں'' مجھے اردو نہیں آتی''۔ کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ مادری زبان کے بارے میں اس طرح کہنا کتنی معیوب اور بے حسی کی بات ہے۔ انہوں نے اس سوال پر کبھی غور کیا ہوگا کہ کیا زبان صرف حصول معاش کا ذریعہ ہے؟ زبان کیا صرف نوٹ چھاپنے کے لیے استعمال ہوتی ہے؟ دو گھڑی سنجیدگی سے غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ زبان معاشرے کی ترجمان، تہذیب کی آئین، افراد کی شناخت اور قوم کی تاریخ بھی ہوتی ہے، تاریخ گواہ ہے کہ کوئی قوم جنگ سے تباہ نہیں کی گئی لیکن زبان اور تہذیب کی دوری اور محرومی نے قوموں کو تباہ و برباد کیا ہے''۔

دور حاضر میں اردو زبان کا المیہ یہ ہے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے وہ اردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتی، جو اردو پڑھ سکتے ہیں انہیں مطالعہ کا شوق نہیں اور جنہیں مطالعے کا شوق ہے انہیں اردو کتابیں خرید کر پڑھنے کی عادت نہیں۔ عابد معز اردو قارئین پر طنز کرتے ہوئے اردو مصنف کی پریشانیوں کو اس طرح بیان کیا ہے:

''صبر و تحمل سے تمام معرکے سر کرنے کے بعد ہمارے ہاتھوں میں ہماری پہلی کتاب آئی ہم اسے خوشی خوشی گھر لے آئے اور کتاب کو کبھی الماری میں سجاتے

---

1 ۔''ہندوستان میں اردو کا حال''۔ اردو ہے جس کا نام۔ زیر طبع

کبھی ہاتھ میں تھامے پھرتے تو کبھی فخر سے دوستوں، احباب کو دکھاتے کہ ہماری کتاب چھپی ہے۔ احباب نے ہمیں مبارکباد دی اور مٹھائی کھلانے یا دعوت کرنے کے لئے کہا۔لیکن وائے حسرت کسی نے خریدنے کی بات نہیں کی''۔[1]

اگر کتابیں خریدی ہی نہیں جائیں گی تو اشاعت کا مسئلہ بھی دشوار کن ہوگا۔ یہاں تک کہ جلد ساز مصنفین کو مشورہ دیتے ہیں کہ اردو کی کتابوں کی جلد مضبوط ہونی چاہیے تاکہ عرصہ تک محفوظ رہے، چنانچہ عابد معز جلد ساز کے حوالے سے اردو قارئین پر اس طرح طنز کرتے ہیں:

''طباعت کے مرحلے سے گذرنے کے بعد ہم جلد ساز کے پاس پہنچے۔ہم اپنی کتاب کے لئے عام سی ہلکی پیپر بانڈ جلد چاہتے تھے لیکن جلد ساز نے پُرخلوص مشورہ دیا۔اردو کی کتاب ہے۔مضبوط جلد سازی ہونی چاہئے۔ چمڑے کی جلد نہ سہی گتھے کی جلد ضرور بنوائیے۔

جلد ساز نے وجہ بتائی۔ اردو کی کتاب ایک ہی مرتبہ چھپتی ہے۔ دوسری اشاعت کی نوبت نہیں آتی۔عرصہ تک محفوظ رکھنے کے لئے مضبوط جلد ضروری ہے''۔ [2]

اردو کتابوں کی یہ صورت ہے کہ ان کی اشاعت صرف نذر و نیاز کے لیے ہی ہو رہی ہیں۔ کیونکہ اردو قارئین کتابیں خرید کر نہیں پڑھتے۔عابد معز کا خیال ہے کہ جو کتابیں نذر و نیاز کے لیے چھپتی ہیں انہیں کوئی ناشر نہیں ملتا۔مصنف ہی ناشر، تقسیم کار ہوتا ہے۔ چنانچہ اردو والوں کی اس بے راہ روی کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دور حاضر میں اردو کی اکثر کتابیں نذر نیاز کے لیے چھپتی ہیں صرف چند کتابیں ہیں جو بازار میں بکنے کے لیے شائع ہوتی ہیں، اردو کی اکثر کتابوں کو

---

[1] ۔''ہم صاحب کتاب ہوئے'' سگ گزیدہ۔ص:۸۲

[2] ۔''ہم صاحب کتاب ہوئے'' سگ گزیدہ۔ص:82

پبلشر نہیں ملتے کہ ان کتابوں کو کوئی خریدتا نہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی گھاٹے کا سودا کیوں کرے گا۔ نذر و نیاز کی کتابوں کا کوئی مستند پبلشر نہیں ہوتا گو کہ رسمی طور پر کسی پبلشر کا نام ضرور دیا جاتا ہے۔ ان کتابوں کو خود مصنف اپنی نگرانی میں اور اپنے خرچے پر شائع کرواتا ہے۔ خود ہی ان کا پبلشر ہوتا ہے اور خود ہی تقسیم کار، حتیٰ کہ خود مصنف بہ نفس نفیس ان کتابوں کو بیچنے کی ناکام کوشش کرتا ہے''۔

عہد حاضر میں اردو زبان کی مقبولیت کی دلیل اردو مشاعرے کو سمجھا جا رہا ہے، لیکن عابد معز اس خیال سے اعتراض کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اردو مشاعرے سے اردو کی مقبولیت نہیں ہوسکتی، بلکہ ہماری نئی نسل اردو سیکھنے اور پڑھنے سے اردو زبان کی ترقی و ترویج ہوگی۔ یہی ہماری تہذیبی ورثے کی منتقلی کا بہترین ذریعہ ہے۔ آج ہم اپنی مادری زبان کے بارے میں غور فکر نہ کریں تو آنے والی نسلیں اپنی شناخت سے محروم ہوں گی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''خدارا مشاعروں کی کامیابی سے اردو زبان کے زندہ جاوید ہونے کا اندازہ مت لگائیے۔ میں چاہتا ہوں کہ مشاعروں میں اشعار سننے اور داد دینے کے ساتھ چند لمحوں کے لئے ہم اپنا محاسبہ کرلیں۔ اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کہ ہم اپنی زبان کے لیے کیا کر رہے ہیں۔

ہم اردو بول اور سن لیتے ہیں حتیٰ کہ اردو میں سوتے اور جاگتے خواب بھی دیکھتے ہیں۔ کیا ہم اردو پڑھتے اور لکھتے بھی ہیں؟ کیا ہماری نئی نسل اردو جانتی ہے۔ اردو کی ترقی اور ترویج میں ہمارا کتنا حصہ ہے؟ ہم نے اپنی زبان کے لئے ماہانہ کتنا بجٹ مختص کیا ہے؟ ہمیں جنگی بنیادوں پر اردو زبان کے لئے کام کرنا ہے۔ اردو کو پھر سے اپنے دلوں اور گھروں میں بسانا ہے۔ اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھنا اور سکھانا ہے۔ اردو رسائل اور جرائد خرید کر پڑھنا بھی ہے۔ اگر اب بھی ہم اپنی زبان کی بقاء میں ناکام رہے تو خدشہ لاحق ہے کہ تہذیبی ورثے کی منتقلی رک

ا۔ کتاب مفت۔ اردو میگزین۔ ۱۸/ اگست ۲۰۰۰ء

جائے گی اور آنے والی نسلیں اپنی شناخت سے محروم ہوں گی‘‘۔

آج اردو زبان کی مقبولیت میں کمی کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس زبان میں ادب کی بہ نسبت دوسرے علوم وفنون کی کمی ہے۔ جب کہ دیگر علوم وفنون پر مہارت رکھنے والے افراد اردو زبان جانتے ہیں، جیسے ڈاکٹر انجینئر، سائنس دان، وغیرہ یہ لوگ اردو میں کچھ لکھتے بھی ہیں تو صرف ادبی شاعری۔ تنقید وغیرہ جب کہ یہ لوگ بہ آسانی سے اپنے پیشے کے علوم کو اردو میں منتقل کر سکتے ہیں۔ جس سے اردو زبان کا دائرہ وسیع ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر عابد معزاردو زبان کی اس تنگ دامنی کا شکوہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’اردو ذرائع ابلاغ میں سائنسی اور طبی مضامین کی کمی کی سب سے اہم وجہ لکھنے والوں کی کمی ہے۔ اس کے لئے میں اردو زبان سے تعلق رکھنے والے سائنس داں، ڈاکٹر، انجینئر اور دیگر ماہرین کو ذمہ دار قرار دیتا ہوں۔ وہ اپنی زبان سے محبت کا حق اردو میں سائنسی موضوعات پر لکھنے کے بجائے ادب لکھ کر ادا کرتے رہیں۔ ایسے کئی ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس دان ہیں جو شاعری کرتے ہیں، افسانے لکھتے ہیں، حتٰی کہ تنقید میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ لیکن اپنے پیشے سے متعلق موضوعات پر قلم نہیں اٹھاتے ادب تخلیق کرنے کی بہ نسبت سائنسی موضوعات پر لکھنا بہت مشکل ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اردو زبان سائنسی علوم و فنون کا وسیلہ بننے کی اہل نہیں ہے۔ جامعہ عثمانیہ نے ثابت کر دکھایا تھا کہ اردو زبان میں کسی بھی علم کی تعلیم دی جا سکتی ہے چاہے وہ علم طب اور انجینئرنگ ہی کیوں نہ ہو‘‘۔ ۲

آج ہمارے معاشرے میں کئی افراد مل جائیں گے جو سیاسی وسماجی اسٹیج پر اردو کی بقاء کے لئے تقریریں کرتے ہیں، حکومت کو سخت سست سناتے ہیں۔ مگر اپنے بچوں کو اردو پڑھنے لکھنے کی جانب راغب

۱۔ ’’پیشکشی خطبۂ صدارت‘‘ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ نومبر 2008ء۔ 70

۲۔ اردو زبان میں سائنسی اور طبی علوم کی پیش کش۔ اکٹوبر 2001ء

نہیں کرواتے، وہ شاعری کے ذریعہ اردو کی ترقی کا خواب دیکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر طنز کرتے ہوئے عابد معز فرماتے ہیں:

''ہم نے بیگم کو سمجھایا۔ آپ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ ہم کسی سے عشق کرنے لگے ہیں۔ اتنی ہمت ہم میں کہاں۔ آج بھی ہم پہلے کی طرح آپ کے وفادار ہیں۔ ہمارا منشا شاعری کے ذریعہ اردو کی خدمات کرنا ہے جس سے اردو کی ترقی ہوگی اور اردو کا مستقبل درخشاں ہوگا۔ جواب ملا۔ اردو کی خدمات کرنے کا ارادہ ہے تو اپنی اولاد کو اردو سکھائیے۔ آپ کے بچے اردو یوں بولتے ہیں جیسے انگریزوں کی نقل اتار رہے ہیں''۔ ۱؎

عابد معز کا خیال ہے کہ اردو زبان کی ترقی و ترویج میں کمی کا ایک اہم سبب انگریزی تعلیم ہے۔ عہد حاضر میں امیر غریب سبھی اپنے بچوں کو انگریزی ذریعہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کوئی اردو داں چاہ کر بھی آج اپنی اولاد کو اردو ذریعہ تعلیم کی طرف نہیں لے جانا چاہتا۔ اس سلسلہ میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اب آپ سے کیا چھپائیں ہم اردو لکھنے پڑھنے اور اس کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ ہمارے بچے بھی انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم پاتے ہیں۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ کم از کم ہمارا لڑکا مادری زبان میں تعلیم حاصل کرے لیکن ہماری بیوی بضد رہیں۔ میں بچے کی زندگی خراب نہیں ہونے دوں گی۔ وہ پڑھے گا تو انگلش میڈیم اسکول میں ورنہ ان پڑھ، جاہل، اور گنوار سہی! ہم اپنا سا منہ لے کر چپ ہو رہے''۔ ۲؎

ہم ہندوستانیوں کی سب سے بڑی ستم ظریفی یہ رہی ہے کہ دشمن کو تو سمجھا لیکن دشمنی کے نظریات کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انگریزوں نے ہی سب سے پہلے اردو ہندی کا جھگڑا پیدا کیا۔

۱؎۔ عرض کیا ہے۔ سگ گزیدہ۔ ص:101

۲؎۔ انگلش میڈیم اسکول۔ فارغ البال۔ ص:83

فورٹ ولیم کالج میں اردو زبان وادب میں سنسکرت اور برج بھاشا کے الفاظ شامل کر کے اسے دیوناگری رسم الخط دے کر ہندی کا نام دیا۔آج خود ہمارے لسانیات کے ماہرین خصوصاً اردو، ہندی، انگلش بھی اردو رسم الخط کوتبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ماہرین لسانیات کے نظریات پر طنز کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

'' پچھلے پچاس ساٹھ برسوں کے دوران اردو والوں میں ''مجھے اردو نہیں آتی'' کہنے والے فرقہ کی طرح مزید چند فرقے بھی ابھر آئے ہیں۔ایک دوسرا مقبول اور خطرناک فرقہ اردو کا رسم الخط تبدیل کرنے والا ہے۔ یہ لوگ اردو کا رسم الخط تبدیل کر کے اردو کو رومن یا دیوناگری لبادہ اُڑھانا چاہتے ہیں۔اس ملک کے حامی لوگوں کا خیال ہے کہ تبدیل شدہ رسم الخط میں اردو نہ صرف باقی رہے گی بلکہ زیادہ مقبول ہوگی۔ فی الحال تو ایسا کرنے والوں کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ان دو فرقوں کے علاوہ اردو والوں میں کئی چھوٹے چھوٹے فرقے اور بھی ہیں ایک فرقہ ایسے شاعروں کا ہے جو کسی پابندی کو اپنے اوپر لاگو کرنا نہیں چاہتا۔ وہ نثر میں شاعری کرنا چاہتا ہے۔ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اردو کو صرف شاعری تک محدود کر دینا چاہتا ہے۔معلوم نہیں مختلف فرقے مل کر اردو کا کیا حشر کریں گے۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتلائے گا''۔

بے شک اردو زبان جب لکھنے پڑھنے کے قابل ہوئی تو اس کی ادبی پیاس فارسی نے بجھائی اس پر فارسی کے زبردست اثرات دکھائی دیتے ہیں لیکن اردو زبان ایک آزاد خود مختار اور ترقی یافتہ زبان ہے۔اس کا بھی اپنا ایک الگ رسم الخط ہے بلاشبہ یہ بات مسلمہ ہے کہ اردو زبان کھڑی بولی سے نکلی ہے جہاں سے ہندی بھی نکلی ہے کیا یہ ماہرین اسی طرح ہندوستان کی دیگر ڈراویڈین زبانوں کو یہی مشورہ دے سکتے ہیں مثلاً تلگو ،کنڑ،تمل، ملیالم، مراٹھی وغیرہ۔

ہندوستان میں اردو والے ایک لسانی اقلیت ہیں۔ یہ اقلیت ہندوؤں ۔مسلمانوں ،سکھوں ،

۱۔ مجھے اردو نہیں آتی۔اردو میگزین۔۳۱/ مارچ 2000 ء۔

عیسائیوں سبھی پر مشتمل ہے مگر اس میں بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے۔

اردو زبان کی ہر دل عزیزی کا ہر شخص معتقد ہے اس کے الفاظ کی چاشنی سب کو مرغوب ہے اور اس کے اشعار کے حسن و بلند پردازی کی سبھی داد دیتے ہیں اور اس سے زبانی ہمدردی جتانے والوں کی، اس کی حفاظت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کا وعدہ کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ اس زبان کی سب سے بڑی بدقسمتی رہی ہے کہ سیاسی وسماجی جلسوں کی تقاریروں میں اکثریت کی یا خواص کی بلا لحاظ مذہب وملت مشترکہ زبان بن جاتی ہے۔ بعد جلسوں کے یہ پھر اقلیت میں آجاتی ہے۔ یعنی مسلمانوں کی زبان قرار دے کر مخالفت بھی کی جاتی ہے۔ چنانچہ سیاسی سطح پر اردو زبان کی اس حیثیت کو اپنے طنز کا ہدف بنایا ہے لکھتے ہیں:

''تقاریر میں اکثر باتیں دہرائی جاتی ہیں اس تقریب میں بھی یہی ہوا۔ مقررین نے بتایا کہ 'اردو ایک میٹھی اور شیریں زبان ہے'۔ میں یہ جملہ اردو کے متعلق ہونے والی تقریباً ہر تقریر میں سنتا ہوا آیا ہوں۔ اس جملہ کا اثر مجھ پر اتنا ہوا کہ بعض اوقات میں اردو کو گلاب جامن اور رس گلہ جیسی مٹھائی سمجھنے لگتا ہوں۔ لوگ میٹھی چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں کہ کہیں انہیں ذیابطیس نہ ہو جائے اور شاید اردو زبان میٹھی اور شیریں ہونے کی وجہ ہی سے بہت سارے لوگ اس سے پرہیز کرنے لگے ہیں۔ اردو تقاریر میں اکثر مقررین نے بتایا کہ اردو ہم سب کی مشترکہ زبان ہے اور اردو کو مذہب سے نہیں جوڑنا چاہئے۔ میں فاضل مقررین کی معلومات کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو زبان اسلام کی رکن نہیں ہے۔ مرکزی وزیر نے دلچسپ باتیں کیں۔ انہوں نے مشاہدہ پیش کیا کہ جو لوگ اردو کی مخالفت کرتے ہیں وہ بھی اپنے مقصد کے لئے اردو ہی کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے تو کہتے ہیں کہ لوہا، لوہا کو ہی کاٹتا ہے'' ۔[1]

اس طرح اردو زبان ادب کے تعلق سے سیاسی لیڈروں کے نظریات دیکھئے اقتباس ملاحظہ ہو:

---

[1] ۔ میں بھی حاضر تھا وہاں ۔ اردو میگزین ۔ 23 / فروری 2001ء

''سیاسی قائدین اردو کے تعلق سے دلچسپ بیانات بھی جاری کرتے ہیں ایک قائد نے کہا۔ 'اردو شیروانی کی طرح ہے' شیروانی اور اردو کو آج کا مخصوص موقعوں پر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرے لیڈر کے خیال میں 'اردو کا بچپن یتیمی میں گذرا' جوانی بیوگی میں بیت گئی اور اس کا بڑھاپا بے سہارا ہے۔ کسی اور نے کہا 'اردو کو زبردستی پیٹرول ڈالر کے عوض مشروب اسلام نہ کیا جائے اسے سیکولر رہنے دیا جائے''۔[1]

جس طرح آزادی کے متوالوں نے اپنے مقصد و منشور کی اشاعت کے لئے اردو زبان کا سہارا لے کر ہندوستانی عوام میں انگریزوں سے نفرت کی چنگاری پیدا کی، ملک آزاد ہوا لیکن اردو کے احسانات و خدمت کو اکثر بھلا دیا گیا۔ ویسے آج ہمارے سیاست داں ووٹ کے خاطر اردو کا سہارا تو ضرور لیتے ہیں یہاں تک کہ اس کی تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دیتے ہیں۔ لیکن کام نکلتے ہی اسی طرح بھلا دیتے ہیں جیسے جنگ آزادی کے رہنماؤں نے اردو کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔

الغرض مذکورہ تمام اقتباسات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو کو بنیادی طور پر اردو والوں سے ہی نقصان ہوا چنانچہ عابد معز نے اردو کی ناگفتہ صورت حال پر اپنی تحریروں میں جابجا برہمی کا اظہار کیا ہے۔

---

[1] ۔شہر اردو۔ واہ حیدرآباد ص:24 ر فروری، 1994ء

شعراءاورشاعری

شاعری معنی خیز تجربات، گہری بصیرت بلند تخیل، سچے مشاہدے سے کام لے کر انسانیت اور اس کے ابدی حسن کا احساس دلاتی ہے۔ وقت کی تبدیلی کا عکس دکھاتی ہے۔ اس کی زبان تخلیقی ہوتی ہے مگر فرسودہ نہیں، اس کی تصویریں روشن ہوتی ہیں پر چھائیاں نہیں۔ اردو شاعری کا خاص موضوع عشق رہا ہے لیکن اس کے کئی روپ ہیں۔ اکثر و بیشتر شعراء صرف عشق مجازی وفرضی عشق کے دلدادہ ہیں۔ وہ فرضی عشق و عاشقی کے دائرے سے باہر نکلنا بھی نہیں چاہتے۔ عابد معز کا ماننا ہے کہ محبت کرنے والے ہر حال میں شاعری کرتے ہیں۔ ناکام محبت سے اچھے نتائج نکلتے ہیں۔ محبت اور شاعری کے رشتہ کو واضح کرتے ہوئے شعراء کی فطرت کو یوں طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے:

> ''محبت اور شاعری میں چولی اور دامن کا رشتہ ہے۔ کہتے ہیں عشق کے بغیر شاعری کرنا جھک مارنے کے مترادف ہے۔ محبت کرنے والے ہر حال میں شاعری کرتے ہیں۔ ناکام محبت سے اچھے نتائج نکلتے ہیں۔ بعض ماہرین کہتے ہیں کہ جس نے عشق نہیں کیا وہ پوری غزل تو کیا ایک شعر بھی سمجھ نہیں سکتا۔ ہم ایک استاد شاعر کو جانتے ہیں جو شاگرد بنانے سے قبل سوال کرتے ہیں ''کتنی مرتبہ محبت کی ہے؟'' وہ صرف اک ناکام محبت پر شاندار مستقبل کی پیش قیاسی کرتے ہیں۔ دوسری مرتبہ محبت میں مبتلا ہونے والے کو مزاحیہ شعر کہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ تین یا تین سے زائد مرتبہ محبت میں گرفتار شخص کو شاعری سے دور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے مغل اعظم دیکھ کر عشق شروع کیا تھا۔ موصوف کے والد انارکلی کو دیوار میں چنوا نہ سکے لیکن ہمارے دوست کو

کمرے میں بند کر کے بھوکا رکھا عشق کا بھوت اتر گیا شاعری کا چسکا پڑ گیا'' ۔[1]

عابد معز کا خیال ہے کہ شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خود سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔ خود سے محبت ہونے کے بعد دوسروں سے محبت ہو جاتی ہے۔شاعری محبت کے علاوہ ناچ گانے پر بھی آمادہ کرواتی ہے۔اس ضمن میں شاعری کی مختلف خصوصیات ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاعری کے سبب ہم گا سکتے ہیں اور گاتے ہوئے ہم ناچ بھی سکتے ہیں۔ پاپ البم شاعری کی اہمیت اور افادیت کا بین ثبوت ہیں۔اگر شاعری نہ ہوتی تو ہم ناچ نہیں سکتے تھے۔اس طرح ہم ورزش کرنے کے خوبصورت فن سے محروم رہتے۔میری یہ باتیں پڑھ کر کوئی شاعر مجھے ''بدذوق'' قرار دے سکتا ہے۔لیکن یقین جانئے میں شاعری کی مدافعت کر رہا ہوں۔شاعری محبت کرنے پر اکساتی ہے۔سب سے پہلے اپنے آپ سے محبت ہوتی ہے۔شاعر حضرات اسی محبت میں خود کو بہت بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔اپنے آپ سے محبت ہو جانے کے بعد شاعری دوسروں سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ کب اور کس سے افلاطونی محبت ہو جائے۔محبت کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ یہ محبت بڑی شدید اور خطرناک ہوتی ہے۔محبت میں مرنے مٹنے اور امر ہو جانے کی باتیں کی جاتی ہیں۔شاعری میں قدرت سے بھی محبت ہوتی ہے۔شاعری تو صرف پیار و محبت کی میٹھی میٹھی باتیں ہیں''۔ [2]

عابد معز کا ماننا ہے کہ بعض لوگ اردو شعراء کی مجموعی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے بچوں کو اردو سیکھنے سے منع کرتے ہیں۔شعراء کی اس خامی کو ظاہر کرتے ہوئے انہیں نشانۂ تمسخر بنایا ہے:

''شاعری کی بہتات کے سبب بعض لوگ اپنے بچوں کو اردو سیکھنے سے منع کرتے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر اردو ادیبوں اور شاعروں کے بچے انگریزی

---

[1] سوز محبت۔سگ گزیدہ۔ص:75-73 اشاعت جنوری 1995ء

[2] ۔شاعری پر پابندی لگائی جائے۔اردو میگزین۔۱۰ارنومبر ۲۰۰۰ء

میڈیم میں تعلیم پا رہے ہوتے ہیں۔انہیں خدشہ لگا رہتا ہے کہ عفوان شباب میں اردو کا طالب علم شاعری میں مبتلا ہو کر نکما اور نا کارہ بن جائے عاقل اور بالغ ہونے کے بعد اردو شاعری سے بالعموم خطرہ نہیں رہتا لیکن بڑھاپے میں پھر قدم لڑکھڑاتے ہیں چند بوڑھے شاعروں نے اپنی نو جوان شاگردوں سے بیاہ رچایا ہے۔یہ شاعری کا کمال ہے''۔ [1]

عابد معز نے شاعری کے علاوہ شعراء کے عادات واطوار اوران کے حلیہ کو بھی اپنے طنز کا ہدف بنایا ہے لکھتے ہیں:

''ان شرائط کے ساتھ اجازت عطا کی گئی کہ ہم شاعری کریں گے لیکن اپنا حلیہ نہیں بدلیں گے اور نہ ہی شاعری کے عادات واطوار اپنائیں گے۔سگریٹ اور شراب پینا نہیں شروع کریں گے۔خواتین کی جانب نظریں نہیں اٹھائیں گے۔شب بیداری نہیں ہوگی۔اپنے آپ کو مافوق البشر نہیں سمجھا کریں گے۔ شعر سناتے وقت اُچھل کود نہیں کریں گے اور نہ ہی گلا پھاڑ کر دیوانوں کی طرح چیخیں گے۔گانا بھی نہیں گائیں گے۔ادب اور شائستگی کے ساتھ اپنا کلام پیش کریں گے۔کسی صورت داد کی بھیک نہیں مانگی جائے گی۔شاعروں سے دوستی اور شاعرات سے بات نہیں ہوگی۔گھر پر مشاعرہ اور کام پر شاعری نہیں ہوگی۔کم از کم چار احباب کے اصرار پر ہم نے عرض کیا ہے، کریں گے۔داد ملنے پر جھک جھک کر یا دونوں ہاتھوں سے سلام نہیں کریں گے''۔ [2]

شعراء ہمیشہ اپنے اشعار کے وزن اور بحر کی الجھنوں میں الجھے ہوتے ہیں عابد معز ان کی اس عادت کو ان کی ایک خامی تصور کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

''شاعر کو اپنے وزن سے زیادہ اپنی شاعری کے وزن کی فکر ہوتی ہے۔وہ

---

[1] ۔شاعری سے پرہیز۔اردو میگزین، اشاعت 7رستمبر 2001ء

[2] ۔سگ گزیدہ،عرض کیا ہے۔ص:102-103

شعر کا وزن ٹھیک کرتے کرتے بہت حد تک اپنا وزن گرالیتا ہے۔خود کا وزن
خراب ہوتا ہے تو شعر کا وزن ٹھیک ہوتا ہے۔اسی لیے یہ مشاہدہ عام ہے کہ کم
وزن اور خراب صحت رکھنے والا شاعر ہوتا ہے''۔ [۱]

اسی طرح آگے عابد معز نے مشاعرے میں شعرا کے داد وصول کرنے کے عمل کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے ان کا ماننا ہے کہ داد وصول کرنا بھی ایک فن ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ہاتھ کتنی مرتبہ اٹھا ہے۔مشاعروں میں مشاہدے کے لیے ایک دلچسپ
موضوع ہے۔بعض شاعروں کا ہاتھ ہر شعر کے ساتھ اٹھتا ہے۔ایسے لگتا ہے جیسے
وہ شکریہ ہاتھ سے کہہ رہے ہیں۔ چند شاعر مستقل ہاتھ اٹھاتے جاتے ہیں۔
انہیں دیکھ کر ماضی کے دولھوں کی یاد آجاتی ہے کہتے ہیں کہ دولہے کو گھوڑے پر
چڑھا کر (اور بٹھا کر بھی شاید) بارات نکالی جاتی تھی تمام راستے دولہا ہر کسی کو
مستقل سلام کئے جاتا تھا۔شاعر بھی ایسے ہی ہر سامع کو سلام کرتے ہوئے داد
وصول کرتا ہے''۔ [۲]

عابد معز کا ماننا ہے کہ شعراء کو غلطی سے بھی شاعری ترک کرنے کا مشورہ نہیں دینا چاہیے اپنے اس خیال کو وہ ایک نقاد کے حوالے سے یوں بیان کیا ہے:

''شاعری اور مشاعروں کے موضوع میں بھٹکتے ہوئے میں نے اپنے ایک
نقاد دوست سے سوال کیا اگر میں شاعری سے اجتناب کا مشورہ اردو کے قلم
کاروں کو دوں تو کیسا رہے گا؟۔

کیا تم نے بین السطور یہ مشورہ دے دیا ہے تم نے سر منڈا لیا ہے اب اولے
پڑنے کا انتظار کرو۔میرے نقاد دوست نے جواب دیا۔

۱۔وزن سنبھال کے۔اردو میگزین۔17/مارچ،2000ء

۲۔داد وصول کرنا بھی ایک فن ہے۔اردو میگزین۔4/جنوری 2002ء

ماضی میں شعراء کی بہت عزت ہوا کرتی تھی کیونکہ بادشاہ اور راجہ مہاراجہ شاعری کے قدرداں تھے۔ وہ شعراء کو مال و دولت کے علاوہ خطابات سے بھی نوازتے تھے۔عوام بھی ان کی قدر دان ہوا کرتی تھی۔آج وہ دور ختم ہو چکا ہے، پھر بھی شعراء حضرات کے ناز و نخرے وہی ہیں جو کبھی ماضی میں ہوا کرتے تھے۔شعراء کے ناز و نخروں کو اس طرح طنز کا نشانہ بنایا ہے:

''ماضی میں شاعروں کی بہت عزت ہوا کرتی تھی عوام شاعروں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے ان کا کلام گلی کوچوں میں گونجتا تھا شاعر کو قوم اپنا سرمایہ گردانتی تھی شاعری کی قدر بادشاہ اور راجہ مہاراجہ تک کرتے تھے انہیں نوازتے تھے اس شہرت،عزت اور قدر سے متاثر ہو کر ہر کوئی شاعری کرنا چاہتا تھا اس لیے بھی شاعر زیادہ ہوتے تھے۔شاعروں کی ''زیادتی'' کی روایت آج بھی برقرار ہے گو کہ اب وہ راجہ مہاراجہ اور بادشاہ نہیں رہے وہ زمانہ بھی نہیں رہا۔شاعروں کی وہ عزت اور قدر بھی نہیں رہی اس کے باوجود بھی شاعروں کی زیادتیاں برقرار ہیں شاید شاعروں کو تاریخ دہرائی جانے کا انتظار ہے''۔ ۲؎

وزن کا خیال رکھتے ہوئے بہت کم شعراء شاعری کرتے ہیں۔جو شعراء اس عمل میں کمزور ہوتے ہیں وہ ترنم اور موسیقی کا سہارا لیتے ہیں۔عابد معز کا خیال ہے کہ ایسے شعراء کو نقاد ڈنڈی مار شاعر کہتے ہیں۔ شعراء کی اس کمزوری کو نقاد کے حوالے سے یوں ظاہر کیا ہے، لکھتے ہیں:

''جہاں باوزن شاعری موسیقی میں چار چاند لگا دیتی ہے اور ترنم کو جاندار بنا دیتی ہے وہیں ترنم اور موسیقی شاعر میں وزن کو سہارا دینے اور وزن کو گرنے سے روکتے ہیں۔وزن کا ٹھیک طرح سے ادراک نہ رکھنے یعنی ڈنڈی مارنے والے شاعر کے لیے ترنم بیحد ضروری ہے

۱؎۔شاعری سے پرہیز۔اردو میگزین۔اشاعت ۷ ستمبر ۲۰۰۱ء

۲؎۔شاعری سے پرہیز۔اردو میگزین۔اشاعت 7 ستمبر 2001ء

۔وزن کی بے شمار غلطیوں کو وہ ترنم میں ڈھال لیتا ہے۔وزن کو ہتھیار بنا کر شعراء ایک دوسرے کے کلام کو پرکھتے ہیں اور اپنا وزن بڑھانے کی کوشش بھی کرتے ہیں میرے خیال میں کسی شاعر کو بے وزن کہنا سب سے بڑی تنقید ہے بعض شاعروں کے نزدیک بے وزن گالی کے مترادف ہے۔بے وزن کا لفظ سن کر شاعر بہت چراغ پا ہوتا ہے اور اپنے آپ کو باوزن ثابت کرنے کے لیے سارا زور بعض مرتبہ بازوؤں کا بھی صرف کر دیتا ہے'' ۔ [1]

شعراء کو اپنی ذات سے زیادہ تقطیع کر کے اشعار کو ٹھیک کرنے کی فکر رہتی ہے۔بعض اوقات یہی فکر انہیں رات بھر سونے نہیں دیتی۔وہ نیند میں بھی بڑبڑاتے رہتے ہیں۔چنانچہ عابد معز مزاحیہ انداز میں شعراء کی شعور و لاشعور کی منجملہ کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

''رات دیر گئے تک بتی جلائے میرے شاعر دوست تازہ کلام موزوں کرتے رہے۔شعر کو کاغذ پر لکھتے اور اسے ترنم سے پڑھ کر شعر کے وزن کا اندازہ کرتے ۔پھر مطمئن نہ ہو کر کاغذ پھاڑ ڈالتے۔شاعر صاحب کا یہ عمل ایک ضخیم نوٹ بک کے تمام کاغذات ختم ہونے تک جاری رہا۔بستر پر کاغذ کے ٹکڑے پھولوں کی طرح بکھر گئے تھے۔انہوں نے دوسری نوٹ بک تلاش کی لیکن میری خوش بختی کہ وہ ناکام رہے۔تب انہوں نے سونے کا فیصلہ کیا۔بتی بجھائی اور اپنے مسترد اشعار والے کاغذات کے پرزوں پر لیٹ گئے۔چند ہی لمحوں میں خراٹے بلند ہونے لگے۔موصوف ایسے سوئے جیسے کوئی مزدور اوور ٹائم میں سخت محنت سے تھک کر سو جاتا ہے۔وہ تو آرام سے سو گئے لیکن ان کے مترنم اور باوزن خراٹوں سے میری نیند بحر متقارب میں غرق ہو گئی مجھے لگا جیسے میرا قافیہ تنگ ہو رہا ہے میں اٹھ بیٹھا اور بے بسی سے انہیں گھورنے لگا جی چاہتا تھا کہ سرہانے رکھے اساتذہ کے دواوین سے ان کا سر کچل دوں۔ابھی میں پلان کر ہی رہا تھا کہ

---

[1] ۔وزن سنبھال کے۔اردو میگزین۔17 مارچ 2001ء

موصوف بے چینی میں کروٹیں بدلتے ہوئے بڑبڑانے لگے۔ بہت مشکل سے سمجھ پایا کہ وہ کیا کررہے ہیں۔

شعروزن میں نہیں ہے......

ہمزہ ساقط ہے

واہ متحرک ہے

م مشدد ہے

پھروہ باقاعدہ چیخنے اوررونے لگے۔الف گررہا ہے شعرکو چوٹ لگے گی۔ الف کوسنبھالو،اسے سہارادوالف گررہا ہے۔اسے بچاؤ۔

میں بے احتیاطی میں گرتے ہوئے الف ادھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔ اندھیرے میں مجھے گرتا اورنہ ہی اٹھتا ہواالف دکھائی دیامیں گھبرا کرشاعردوست کودیکھنے لگا۔موصوف کی حالت بگڑرہی تھی وہ چیخنااور چلانا چھوڑکرکوئی جنترمنتر جیسی چیزالاپ رہے تھے ان کے منہ کےقریب کان لیجا کرسنا تو الفاظ واضح ہوئے۔

فعولن فعولن فعول

فعولن فعولن فعولن فعل

میں قیاس کیا کہ موصوف کے یہاں آمد ہورہی ہےاور مجھےایک ماہردایہ بن کرخاموشی سےاس تخلیقی عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچتے ہوئے دیکھنا ہے۔لیکن ان کی حالت مزید بگڑنے لگی۔ پسینہ آنے لگا۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ ہاتھ اور پیر تیزی سے حرکت کرنے لگے۔میں گھبرا گیااورانہیں جھنجھوڑنے لگا۔شاعردوست بڑبڑا کراٹھ بیٹھےاوردریافت کیا۔کہامشاعرےکاوقت ہوگیا؟ میں نے جل کرکہا ۔مشاعرہ کاوقت ابھی نہیں ہوا۔نیند میں آپ ایسی حرکات کررہے تھے مجھے لگا جیسےآپ کاوقت آگیاہے۔خیریت توہے......؟

میں خواب میں تقطیع کر کے اشعار کا وزن ٹھیک کر رہا تھا۔شاعر دوست نے

جواب دیا''۔ ۱؎

اردو اور فارسی کے اکثر شعراء آم کے رسیا رہے ہیں۔حضرت امیر خسرو۔مرزا غالبؔ،علامہ اقبالؔ اور نظیر اکبرآبادی وغیرہ نے آم کے متعلق رائے دی ہے۔امیر خسروؔ نے آم کو فخر گلستان کہا، آم غالبؔ کا پسندیدہ پھل رہا ہے۔اقبالؔ اور نظیرؔ نے آم کی شان میں قصیدے لکھے ہیں۔آج بھی اردو کے شعراء آم کو پسند کرتے ہیں۔عابد معز نے آم کے ساتھ شعراء کی اُنسیت کو مزاحیہ انداز میں یوں پیش کیا ہے:

'' آم کے متعلق غالب کی ایک رائے تھی کہ وہ میٹھے اور بہت ہوں۔آم صرف غالب کو ہی پسند نہیں تھے بلکہ حضرت امیر خسرو بھی آم کے رسیا تھے۔ انہوں نے فارسی میں آم کی تعریف کی اور اسے '' فخر گلستان'' کے خطاب سے نوازا تھا۔علامہ اقبال اور نظیر اکبرآبادی کو بھی آم پسند تھے اور انہوں نے بھی آم کی شان میں قصیدے لکھے تھے۔آم کے متعلق یہ شعری معلومات مجھے غالب کارنر ہی سے حاصل ہوئی ہیں۔آم اور شاعری کی نسبت کے متعلق شاید میرے ایک شاعر دوست نے پڑھا تھا تو اُنہوں نے شاعری کے ساتھ آم کھانا شروع کیا تھا۔وہ اپنے کلام میں شیرینی اور اثر پیدا کرنے کے لیے زیادہ آم کھانے لگے۔غالب کی طرح خوب آم کھانے سے موصوف کی شاعری بہتر ہوئی یا نہیں۔اس بات کا فیصلہ نقاد کریں گے لیکن انہیں ذیابطیس کا عارضہ لاحق ہوا اپنی صحت کے لیے انہیں آم سے پرہیز کرنا پڑا تو شعر کہنا بھی بند ہوا''۔ ۲؎

مرزا غالبؔ آم کے دلدادہ تھے۔وہ پہلے اردو کے شاعر ہیں جنہوں نے سب سے زیادہ آم کھائے۔آم کی کوئی چار ہزار اقسام پائی جاتی ہیں، غالب نے تقریباً سبھی کو چکھا تھا۔وہ اپنے دوستوں کو آم

۱؎ ۔وزن سنبھال کے۔اردو میگزین۔17/مارچ 2000ء

۲؎ ۔غالب کارنر۔اعتماد۔14/اپریل 2008

بھجوانے کی خواہش کرتے تھے۔مرزا غالبؔ کی آم سے الفت وچاہت پر اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غالبؔ وہ واحد ہندوستانی شاعر تھے جس نے نہ صرف سب سے زیادہ آم کھائے ہیں بلکہ سب سے زیادہ آموں کی اقسام کو چکھا بھی ہے۔آم کی کوئی چار ہزار اقسام پائی جاتی ہیں اور غالب نے تقریباً سبھی کو کھایا ہے آموں کی ان اقسام کے نام بھی دیئے گئے تھے جن کا ذکر غالب نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔غالب نے جملہ 63 خطوط میں آم اور اس کی اقسام کے بارے میں احباب کو بتایا ہے۔

ان کے شاہکار خطوط کے حوالوں سے بتایا گیا ہے کہ وہ دوستوں سے آم بھیجنے کی خواہش کرتے تھے اور ان کے لیے دور دراز مقامات جیسے کلکتہ، مدراس اور بمبئی سے آم کے ٹوکرے بھجوائے جاتے تھے۔اتفاق دیکھئے کہ اب تینوں شہروں کے نام تبدیل ہو چکے ہیں''۔ [1]

عابد معز کا خیال ہے کہ شعراء وادیبوں کو تکیہ سے بھی خاص انس رہتا ہے۔تکیہ کی خوبی بیان کرتے ہوئے اس طرح تکیہ کو مزاح کا نشانا بنایا ہے:

''ادیبوں اور شاعروں کو تکیہ سے خاص انس ہوتا ہے۔تکیہ پر سر رکھے گھنٹوں ادبی تخلیقات افسانے کا پلاٹ یا مصرعہ کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں تکیہ سے مضامین اور موضوعات بھی آتے ہیں۔ ہمارے ایک شاعر دوست سے ایک مرتبہ پوچھا گیا تھا۔آپ شاعری کیسے کرتے ہیں؟

جواب میں انہوں نے بتایا' تکیہ کی مدد سے! مجھے شاعری کی تحریک تکیہ سے ملتی ہے۔ میں تکیہ پر سر رکھ کر گنگنانے لگتا ہوں تو شعروں کا نزول ہوتا ہے اور تخلیقی عمل سے تھک کر اسی تکیہ پر سو بھی جاتا ہوں''۔ [2]

آج شعراء کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔اور سامعین کی تعداد تشویش ناک حد تک کم

---

[1]۔غالب کارنر۔اعتماد۔14/اپریل 2008ء

[2]۔تکیہ پر ہمارا تکیہ۔فارغ البال۔ص:151

ہورہی ہے۔عابد معز کا خیال ہے کہ مشاعروں میں سامعین کی تعداد کو بڑھانے کے لیے مشاعرہ کے ٹکٹ پر انعامات رکھنا چاہیے ۔شعراء پر سامعین کو لانے کی پابندی عائد کی جانی چاہیے۔اسی سلسلے میں آگے اخبار والوں سے گزارش کرتے ہیں کہ ادبی روداد میں سامعین کو شرکاء پر فوقیت دیں۔ان کے نام اور تاثرات شائع کریں تاکہ سامعین کی ہمت افزائی ہونے کے ساتھ ادبی محافل میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوسکے۔چنانچہ مشاعروں کی اس صورت حال کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اسٹیج کی آبادی میں مستقل اور مسلسل اضافہ کے برخلاف مشاعرہ گاہ میں سامعین کی تعداد تشویش ناک حد تک کمی ہورہی ہے۔آج وہ وقت آن پڑا ہے کہ سامعین کو اسٹیج فراہم کیا جائے شعراء برادری کو مشاعرہ گاہ میں جگہ دی جائے۔
>
> مشاعروں میں سامعین کی تعداد بڑھانے کے لیے فوری اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔مشاعرے کے ٹکٹ پر انعامات دئے جاسکتے ہیں۔شعراء پر سامعین کو لانے کی پابندی عائد کرنے کے متعلق بھی سوچا جاسکتا ہے۔دو سامعین کے عوض ایک غزل اور پانچ سے زیادہ سامعین کے بدلے میں نظم سنانے کی اجازت دی جائے گی۔ایک سامع لانے پر صرف ایک قطعہ یا غزل کا مطلع اور ایک شعر سنانے کا موقع دیا جائے گا۔جو شاعر تنہا آئے گا اسے سامع بننا ہوگا''۔[1]

مدت سے مشاعرے اردو تہذیب اور مجلسی زندگی کا بہت اہم عنصر رہے ہیں۔مشاعروں نے ہی ہماری ادبی تاریخ بنائی ۔لیکن آج اور کل کے مشاعروں کے اسٹیج میں کافی فرق آچکا ہے۔کیونکہ ماضی میں مشاعرے کے اسٹیج پر صرف چار پانچ افراد ہوا کرتے تھے اور حال کے مشاعروں کے شہ نشین پر صدر مشاعرہ اور شعراء کے علاوہ مہمانان خصوصی ،مہمانان اعزازی ، مالی معاونین،معززین شہر، ارباب اقتدار، واختلافات سیاسی رہنما اور افسران کو نوازنے کا رواج عام ہوگیا ہے تب سے مشاعروں کا شہ نشین کم دامنی کا شکوہ کررہا ہے چنانچہ ڈاکٹر عابد معز اس کیفیت کو طنز کے پیرائے میں یوں رقم طراز ہیں:

---

[1] ۔سامعین کرام! توجہ چاہتا ہوں۔فارغ البال۔206

''دورحاضر میں مشاعروں کے اسٹیج پر بوجھ اور بار بڑھتا ہی جارہا ہے۔ ماضی میں اسٹیج تکیوں کے حساب سے چار پانچ تکیوں والا شہ نشین سجایا جاتا تھا۔ سجے سجائے اسٹیج پر دو چار عمائدین تشریف فرما بلکہ نیم دراز ہوتے تھے۔

آج کل اسٹیج ناپ تول کر بنایا جاتا ہے۔ دس گز لمبے اور پندرہ گز چوڑے اسٹیج تو معمولی مشاعروں کے ہوتے ہیں۔ بعض ایسے طویل اسٹیج سجائے جاتے ہیں جن پر ریلوے پلیٹ فارم کا گمان گزرتا ہے۔ اس پلیٹ فارم اسٹیج پر شعرائے کرام سامعین کے انتظار میں بے چین پہلو بدلتے دکھائی دیتے ہیں۔ لوگوں کی زیادتی کے سبب اسٹیج کا قافیہ تنگ رہتا ہے۔ مختصر سی جگہ میں اپنے آپ کو سمیٹ کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود صدر کا گھٹنا مہمان خصوصی کے پیٹ میں گھسا رہتا ہے۔ مہمان اعزازی کا ہاتھ کسی شاعر کے بغل میں پھنسا رہتا ہے۔ منتظم مشاعرہ کی کہنی ناظم کو مستقل ٹھونکے دیتی رہتی ہے۔ نیز شعراء بلا مبالغہ جونیر شعراء کو گود لیے ہوتے ہیں۔ مشاعرے کے ناتواں اسٹیج صدر بلکہ صدر مشاعرہ مہمان خصوصی اعزازی شعراء ناظم منتظمین مشاعرہ مالی معاونین، ارباب اقتدار، معززین شہر، مائک ٹھیک کرنے، تصاویر کھینچنے اور ویڈیو بنانے اور اونچا بیٹھنے والوں کے بوجھ سے ٹوٹنے لگے ہیں۔ یہی حال اگر رہا تو عین ممکن ہے کہ مشاعرہ کا اسٹیج ہی ختم ہوجائے۔ مشاعروں کو ختم ہونے سے بچانے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسٹیج کا بوجھ کم کیا جائے''۔ [1]

نقاد

ڈاکٹر عابد معز شعراء کی طرح نقاد کو بھی اپنے طنز و مزاح کا موضوع بنایا ہے یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ اردو میں تنقید نگاری انگریزی تنقید کے زیر اثر ہے۔ تنقید کا فلسفہ اور اس کے اصول انگریزی سے مستعار

---

[1] ۔ سامعین کرام! توجہ چاہتا ہوں۔ فارغ البال۔ ص:205-206

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نقاد انگریزی ادب کا دلدادہ ہوتا ہے ،وہ حوالے بھی انگریزی ادب سے لیتا ہے ۔ انگریزی وضع کے کپڑے پہنتا ہےاور انگریزی رہن سہن اختیار کرتا ہے۔نقاد کا حلیہ اوراس کی پہچان کرواتے ہوئے عابدمعزفرماتے ہیں:

''میں نے نقادوں کی اکثریت کوسوٹ بوٹ پہنے اور انگریزی بود و باش اپنائے دیکھا ہے۔ بہت کم نقادمشرقی لبادہ اوڑھے ہوتے ہیں۔ نقادوں کے برخلاف بے چارے تخلیق کارمشرقی لبادہ میں ملبوس سوٹ بوٹ کا ظلم سہتے رہتے ہیں۔ جب اس مشاہدے کو میں نے ایک نقاد کے گوش گزار کیا تو انہوں نے فرمایا 'عجیب بے تکی تنقید ہے بھلا کپڑوں کا ادب سے کیا تعلق؟ میں نے جواب دیا، یہ تعلق ایسے ہی ہے جیسے آپ نقاد حضرات تخلیقات کا ناتہ تخلیق کار کے ماحول اس کی تعلیم وتربیت اس کی ازدواجی زندگی ،اس کے چال وچلن وغیرہ سے جوڑتے ہیں''۔ [1]

عابدمعز کا ماننا ہے کہ شعراء اکثر نقادوں کے سامنے شعر سنانے سے کتراتے ہیں کہیں سامعین کے سامنے ہی نقاد فی البدیہہ ان کے اشعار پر تنقید نا کردے۔ چنانچہ ایک جگہ انہوں نے نقاد اور شاعر کے درمیان کے اس معاملہ کو بیان کرتے ہوئے نقاد کو یوں طنز کا ہدف بنایا ہے:

''میں نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔ آنکھیں مل کر پھر دیکھا۔ ایک شاعر کو چند لوگ نرغے میں لئے کلام سنانے کے لیے اصرار کررہے تھے اور وہ مسلسل انکار کئے جارہا تھا۔ ہے نا، یقین نہ آنے والا منظر۔۔۔شاعر کو گھیرے میں لیے لوگوں کے بارے میں یقین کیساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کے مداح نہیں ہوں گے۔ اس لیے کہ مداح گھیراؤ نہیں کرتے ۔ پیچھا کرتے ہیں وہ لوگ معزز سامعین ضرور تھے۔ جنہیں شاعر نے بعد اصرار

---

[1] ۔نقاد اور تنقید۔ اردو میگزین، 23/جون 2000ء

بار ہا اپنا کلام سنایا تھا۔ اس مرتبہ معاملہ اُلٹا تھا۔ سامعین اصرار کر رہے تھے اور شاعر مختلف عذر پیش کر کے دامن بچا رہا تھا۔ اس نے بہانہ بنایا کہ آج طبیعت کچھ بوجھل سی ہے تو ایک سامع نے کوئی غمگین غزل یا نظم سنانے کی فرمائش کر دی۔ شاعر نے بتایا کہ گلے میں خراش ہے تو ترنم کے بجائے تحت میں سنانے کی گزارش کی گئی اور جب شاعر نے انکشاف کیا کہ بیاض گھر پر رہ گئی ہے تو کسی نے فقرہ کسا، حافظہ تو ساتھ ہے نا......! سامعین مسلسل اصرار کرتے رہے مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے اصرار کی وجہ دریافت کی تو ایک سامع نے بتایا کہ ہم سامعین اپنا حق منوانا چاہتے ہیں ہم شاعروں کو من مانی نہیں کرنے دیں گے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جب شاعر کا جی چاہتا ہے ہمیں پکڑ کر اپنا کلام سنا دیتا ہے اور جب سامعین کلام سماعت کرنا چاہتے ہیں تو شاعر انکار کر رہا ہے۔۔۔ یہ تو یقیناً زیادتی ہے۔ آپ کو اپنا کلام سنانا ہی پڑے گا۔ مطالبہ کرنے والوں میں شامل ہوتے ہوئے میں نے شاعر سے کہا۔۔شاعر نے بے چارگی اور بے بسی سے ایک صاحب کی جانب ایسے اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں ان صاحب کی وجہ سے اپنا کلام پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ وہ صاحب نفیس سوٹ زیب کئے ہوئے تھے۔ پیروں میں چمکتا کالا جوتا پہن رکھا تھا تو آنکھوں پر بھی کالا چشمہ چڑھا رکھا تھا اور ہاتھ میں پائپ پکڑ رکھا تھا۔ وہ اطمینان سے ایک جانب کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ میں ان کی جانب متوجہ ہوا۔ ''آپ کی تعریف'' ۔''میں نقاد ہوں'' موصوف نے گمبھیر لہجہ میں بتایا۔ اصرار کے باوجود شاعر کے کلام عرض نہ کرنے کی وجہ اب میری سمجھ میں آئی۔ شاعر نقاد سے ڈرا اور سہما ہوا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں نقاد فی البدیہہ تنقید نہ کرے۔ میں نقاد کو ستائشی نظر سے دیکھنے لگا کہ کوئی تو ہے جو شتر بے مہار کو قابو میں کر سکتا ہے''۔[1]

---

[1]۔ نقاد اور تنقید۔ 23/جون 2000ء۔ اردو میگزین۔

عابد معز کا خیال ہے کہ شاعری کے علاوہ افسانہ بھی نقاد کا ایک پسندیدہ موضوع ہے۔ نقاد افسانہ کی تکنیک، پلاٹ سچویشن اور کردار واقعات جیسے الفاظ کا سہارا لے کر تنقید کرتا ہے۔ جب کہ عہد حاضر میں لکھے جانے والے افسانے عام قاری کی سمجھ سے باہر ہیں۔ ان افسانوں پر کی جانے والی تنقید قاری کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی اس لیے افسانہ نگار نقاد سے پریشان نہیں رہتا چنانچہ عابد معز لکھتے ہیں:

> ''منہ کا مزا بدلنے کے لئے نقاد نثر پر بھی تنقید کرتا ہے۔ افسانہ اس کا پسندیدہ موضوع ہے۔ افسانہ کی تکنیک۔ پلاٹ سچویشن کردار واقعات جیسے الفاظ کا سہارا لے کر وہ یہاں بھی اپنی منفرد زبان میں رائے زنی کرتا ہے۔ ایک عام قاری کے پلے آج کا افسانہ مشکل سے پڑتا ہے۔ اس پر کی گئی تنقید کو وہ پڑھ ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے افسانہ نگار نقاد سے پریشان نہیں رہتا''۔ [1]

عابد معز کے مطابق نقاد حضرات فکاہیہ ادب سے دور ہی رہتے ہیں بلکہ فکاہیہ ادب کو وہ دوسرے درجہ کا ادب قرار دیتے ہیں چنانچہ فکاہیہ ادب کے تعلق سے نقادوں کے نظریہ کو مزاح کا ہدف بنا کر کہتے ہیں:

> ''فکاہیہ یا طنز و مزاحیہ کو نقاد قابل اعتناء نہیں سمجھتا۔ اس صنف پر تنقید کرنا تو دور فکاہیہ ادب کو دوسرے اور تیسرے درجے کا ادب کہہ کر وہ اسے پڑھنا بھی نہیں چاہتا۔ بس اتنا کہنے پر اکتفا کر جاتا ہے کہ فکاہیہ ادب دو دھاری تلوار یا سفلی عمل کے مانند ہے جو تخلیق کار کو بھی متاثر کرسکتا ہے۔ مجھے نقاد کے اس رویہ پر حیرت ہوتی ہے۔ خود نقاد اپنی تحریروں میں طنز کا خاصہ استعمال کرتا ہے اور بعض نقادوں کی تحریریں مزاحیہ لگتی ہیں۔ طنز و مزاحیہ ادب سے نقاد کی دوری کے بارے میں میرے ایک شاعر دوست کہتے ہیں '' تم بڑے منہ زور ہو۔ کون تمہیں چھیڑے۔ نجات کا راستہ یہی ہے کہ تمہیں اور تمہارے ادب کو دوسرے اور تیسرے درجہ میں رکھا جائے۔ میں نے صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو شاعر دوست

---

[1] ۔ نقاد اور تنقید۔ اردو میگزین۔ 23/جون 2000ء

نے مجھے روک دیا’’مستند ہے نقاد کا فرمایا ہوا۔بس آپ خاموش رہیے‘‘۔ [1]

اردومزاح نگاری

اردومزاح نگاری میں چند ایسے کردار استعمال کیے گئے ہیں،جن کے ذریعہ خوب مزاح پیدا کیا گیا ہے۔جیسے شوہر،بیوی،شاعر،وکیل،پولس،ڈاکٹر،حجام،دھوبی،کتا،بلی،اورشیر وغیرہ ان میں خصوصاً بیوی اور کتا‘‘ کوموضوع قلم بنا کرخوب مزاح پیدا کیا ہے،اورمزاح نگاری میں شہرت بھی پائی۔چنانچہ عابد معز نے بھی ان کرداروں کے ذریعہ اپنی تحریروں کوشگفتہ و پرلطف بنایا ہے۔جیسے ایک اقتباس میں دیکھئے،جس میں مزاح نگاری کے ایک اہم موضوع کتے کوموضوع سخن بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’انگریزوں کو کتے پالنے کا شغف ہے تو اردومزاح نگاروں کوکتوں پرمضمون لکھنے کا شوق ہے۔کتوں پرمضمون لکھنا ایک روایت بن گئی ہے۔اگر اردومزاح نگاری کا کتوں سے اسی طرح انس باقی و برقرار رہا تو عجب نہیں کہ مستقبل میں کتے پرمضمون لکھنا مزاح نگاری کی شرط ٹھہرے گی۔جس نے بھی کتوں پرمضمون لکھا وہ مزاح نگارقرار پایا۔بصورت دیگر اسے ادب کی کسی اورصنف میں طبع آزمائی کے لیے کہا جائے گا۔ چنانچہ اپنی حیثیت منوانے اور اپنا مقام متعین کروانے کے لئے ہم نے کتوں پرمضمون لکھنے کا ارادہ کیا،کئی دن اور رات بے چین اور بیقرار سوچتے رہے کہ کتوں پر کیا لکھیں۔کتوں کے تعلق سے شاید ہی کوئی پہلوایسا بچا ہوگا جس پرمزاح نگاروں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔جدید مزاح نگاری کے باوا آدم پطرس نے کتوں کا ایسا شاندار مشاعرہ منعقد کیا کہ مشتاق احمد یوسفی کو کہنا پڑا۔کتے کی تخلیق کا واحد مقصد پطرس کا مضمون ہے اوراس مضمون کے بعد اس نسل کوزندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔پطرس کے لاجواب مضمون کے بعد جب کتوں کوزندہ رہنے کا حق ہی نہیں ہے تو پھرکتوں پرمضمون لکھنے کا سوال کہاں

---

[1] ۔نقاداورتنقید۔اردومیگزین۔23جون2000ء۔

اُٹھتا ہے؟ اگر کچھ کسر باقی رہ گئی تھی تو وہ بیشتر ومزاح نگار نے پوری کر دی تھی۔
ہمارے لیے کتوں کے تعلق سے سوائے مایوسی اور نا اُمیدی کے کچھ بچا نہ تھا'' ۔[۱]

عابد معز کا خیال ہے کہ کتے کے علاوہ اردو مزاح نگاروں کے پاس ایک کردار ''بیوی'' بھی ہے جس کے ذریعہ اردو مزاح نگاروں نے بے تماشہ مزاح تخلیق کیا ہے۔ لہٰذا وہ مزاح نگاروں کے اس پہلو کو اس طرح مزاح کا ہدف بنایا ہے۔ کہتے ہیں:

''انگریزی ادب میں اپنی قابلیت کے جھنڈے بلند کرنے کے بعد میرے ایک دوست نے از راہ کرم اردو ادب پر توجہ فرمائی۔ طنزیہ اور مزاحیہ صنف ادب کو پہلا نشانہ بنایا۔ ایک دن میں ان کے گھر ''ہیملٹ'' گیا۔ تبادلہ خیال کی غرض سے انہوں نے مجھ سے کہا۔ اچھے وقت پر تم آئے ہو۔ میں فکاہیہ ادب پر مضمون لکھنا چاہتا ہوں۔ میں ایک سوال کا جواب تلاش کر رہا ہوں۔ تم سے بھی پوچھ لیتا ہوں۔ تم اردو مزاح نگار بیوی کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے رہتے ہو۔ میں نے جواب دیا۔ اس لئے کہ اردو تہذیب میں فری سیکس جائز نہیں ہے''۔ [۲]

سماجی کردار

ڈاکٹر عابد معز سماجی کرداروں اور پیشوں کو موضوع قلم بنائے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں طنز و مزاح سے کام لیتے ہوئے بہترین انداز میں کرداروں کی تصویر کشی کر لیتے ہیں۔ ان کے کئی کردار جیسے شاعر، نقاد، شوہر، بیوی، وکیل، پولس حجام، دھوبی، لیڈر، ایکٹر اور ڈاکٹر، وغیرہ ہیں عابد معز نے ان کرداروں کو بے مقصد نشانہ نہیں بنایا بلکہ ان کے ذریعہ معاشرے میں چھپے ہوئے مخفی حقائق کو عیاں کیا ہے۔ ان کے ہر کردار بالکل حقیقی اور معاشرے کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ انہوں نے ان کرداروں کی شخصی خامیوں اور خوبیوں کے

۱۔ سگ گزیدہ۔ ص:۱۱۔۱۲، اشاعت 1995ء

۲۔ سگ گزیدہ۔ داستان معرکۃ لزوجہ۔ ص:۱۴۹

ساتھ نفسیات کو بھی الگ الگ اور کھول کھول کر بیان کیا ہے:

ڈاکٹر

ڈاکٹر عابد معز ڈاکٹروں کی ہنڈ رائٹنگ کو ان کی ایک خامی تصور کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر خوش لباس، خوش اخلاق اور خوش گفتار ہو سکتے ہیں لیکن خوش نویس نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ڈاکٹروں کی اس خامی پر اپنے طنز کا ہدف اس طرح بنایا، لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر حضرت خراب لکھائی کے لئے مشہور ہیں۔ ان کی ہینڈ رائٹنگ کو کسی طرح بھی خوش خط نہیں کہا جا سکتا۔ مریض ڈاکٹروں کی لکھائی کو خط ہی ماننے سے انکار کرتے ہیں ان کی لکھائی کو وہ اندھیرے میں لگائے ہوئے نشتر تصور کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خوش لباس خوش اخلاق، خوش گفتار اور خوش اطوار ہو سکتے ہیں لیکن خوش نویس نہیں ہو سکتے۔ یہ ان کی کمزوری ہے۔ بدخطی کے معاملے میں ڈاکٹر ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ ان کے درمیان خراب خط کا مقابلہ ہے لیکن لطف کی بات ہے کہ ڈاکٹر ایک دوسرے کی تحریر نہیں پڑھ پاتے۔ صرف یہی نہیں چند برس پہلے لکھی گئی خود کی اپنی لکھائی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا آپ نے کبھی کسی ڈاکٹر کو پرانا نسخہ پھر سے تحریر کرتے ہوئے یا کسی دوسرے ڈاکٹر کے نسخہ سے اتفاق کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہر بار وہ نیا نسخہ لکھتے ہیں۔ عام لوگوں کے درمیان ڈاکٹروں کو جانچنے اور پرکھنے کا ایک پیمانہ ان کا خط بھی ہے۔ ڈاکٹر جتنا بدخط ہوگا اتنا ہی بڑا سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا ہے اور تحریر میں موت!''۔ [1]

ڈاکٹر عابد معز ڈاکٹروں کی مختلف قسمیں بھی بتائے ہیں۔ جیسے دل، دماغ، کان، ناک، زبان، جلد، ہڈی، کینسر اور ذیابیطس وغیرہ لیکن مزید ان کا کہنا ہے کہ ان ڈاکٹروں کے علاوہ بھی ڈاکٹرس ہوتے ہیں جیسے

---

[1] ۔ ڈاکٹر کا نسخہ۔ اردو نیوز۔ 3-1-2003

روحانی ڈاکٹر، پوشیدہ ڈاکٹر، عطائی ڈاکٹر، خاندانی پیشہ ورحکم ڈاکٹر، کراماتی ڈاکٹر، ہرفن مولا ڈاکٹر اور پوشیدہ کا ایک قسم جس کو کہنہ ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔ جو کسی نہ کسی مرض کا شکار رہتا ہے۔

پوشیدہ ڈاکٹروں کے دواخانے اوران کے دواؤں کے نام بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ چنانچہ پوشیدہ قسم کے ڈاکٹروں کے دواخانوں اوران کی دواؤں کو طنز مزاح کا نشانہ بنایا۔ ملاحظہ کیجئے:

''پوشیدہ ڈاکٹروں کے دواخانوں کے نام عوام کی خاص توجہ کا مرکز ہوتے ہیں ہم نے کنگس کلینگ رائل سیکس کلینک اور لیلا مجنوں دواخانہ دیکھے ہیں۔ پوشیدہ ڈاکٹر کی تیار کردہ دواؤں کے مخصوص نام فلمی ویلن تاریخی عمارتیں اور شہنشاہوں کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ چندنام پیش خدمت ہیں۔ گولی واجد علی شاہ، معجون مغل اعظم، جوشاندہ قطب مینار، پریم کیپسول''۔ [1]

ڈاکٹر عابد معز کا کہنا ہے جس طرح پوشیدہ ڈاکٹروں کے دواخانوں کے نام عوام کی خاص توجہ کا مرکز ہوتے ہیں، اس طرح ان کے اشتہاروں میں استعمال ہونے والے فقرے بھی دلچسپ ہوتے ہیں، لکھتے ہیں:

''ڈاکٹروں کی ایک قسم پوشیدہ ہوتی ہے۔ ہماری مراد مردانی اور زنانی جنسی امراض کے ماہرین سے ہے۔ اس قسم کے ڈاکٹر مریضوں کا علاج پوشیدہ کرتے ہیں۔ جب کہ وہ معہ پوشیدہ امراض اشتہارات، پوسٹرس اور ورقیوں کے ذریعہ بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ شہر کا بچہ بچہ انہیں جانتا ہے۔۔۔ اخباروں اور رسالوں میں فلمی اشتہاروں کے بعد سیکس اسپیشلسٹ کے اشتہار دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ اشتہاروں میں استعمال ہونے والے چند مشہور فقرے برسوں سے رائج ہیں۔

عزت بچانے کے لئے ٹھہریئے۔ خودکشی حرام ہے۔ شادی سے پہلے شادی

---

[1]۔ ہمارے بھی ڈاکٹراں کیسے کیسے۔ فارغ البال۔ ص:162-163

کے بعد! خوشیوں سے منہ نہ موڑیئے خلوت اور جلوت میں شرمندگی کیسی۔ بچپن اور لڑکپن کی غلطیوں کا علاج۔ ہم ہر دو کی شرمندگی دور کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ''۔ [1]

ڈاکٹر عابد معز خاندانی پیشہ ور حکیموں کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''ڈاکٹری خاندانی پیشہ بھی ہے۔ پیڑھی در پیڑھی خاندان کے لوگ دواخانے چلاتے آرہے ہیں۔ دادا جان نامور طبیب تھے۔ ابا حضور کو اپنی نگرانی میں دواخانہ کے لئے تیار کیا تھا اور پھر ابا حضور نے اپنے فرزند کی تربیت کی ہے۔ خاندانی ڈاکٹر کے مطب میں شجرہ نسب کی تفصیل موجود رہتی ہے''۔ [2]

عابد معز کا خیال ہے کہ ڈاکٹری ایک خاندانی پیشہ بھی ہے۔ ڈاکٹروں کی ایک قسم عطائی ڈاکٹر کہلاتی ہے جسکا طریقہ علاج بڑا عجیب وغریب ہوتا ہے چنانچہ ڈاکٹر عابد معز نے مزاحیہ انداز میں عطائی ڈاکٹر کا طریقہ علاج یوں پیش کیا ہے:

ایک قسم عطائی ڈاکٹر کی ہوتی ہے۔ جو عطائی نسخوں سے علاج کرتے ہیں عطائی ڈاکٹر معاشی طور پر بے ضرر ہوتے ہیں۔ علاج کا معاوضہ نہیں لیتے کہتے ہیں کہ پیسے لینے سے دوا کا اثر جاتا رہتا ہے۔ لیکن تحفے قبول کرنے میں انہیں کوئی عذر نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ تحفہ لینے سے دوا کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ عطائی ڈاکٹر صرف چند امراض کا علاج کرتے ہیں۔ یرقان ان کا محبوب مرض ہے۔ عطائی ڈاکٹر کا طریقہ علاج عجیب وغریب ہوتا ہے۔ نرالا پرہیز بتایا جاتا ہے۔ دوا کو نہار پیٹ جام۔ آم، انگور یا مچھلی کے اندر رکھ کر کھانا پڑتا ہے یا پھر چار سالہ کالی گائے کے دودھ میں ملا کر استعمال کرنا پڑتا ہے تمام دن بھوکا رہنا اور رات میں مرغ پکوا کر دوسروں کو کھلانا اور خود مریض کو باسی دال اور سوکھی روٹی پر

---

[1] ۔ ہمارے بھی ڈاکٹراں کیسے کیسے۔ فارغ البال۔ ص:262

[2] ۔ ہمارے بھی ڈاکٹراں کیسے کیسے۔ فارغ البال۔ ص:168-167

گزارہ کرنا پڑتا ہے۔اس عمل کے بعد ہدایت کی جاتی ہے کہ ہر جمعرات کو صوفی صاحب کی درگاہ پر حاضری دیں اور شیرینی تقسیم کریں۔دوا دینے کے لئے سال میں چند دن اور دن میں دو پہر یا سورج طلوع اور غروب ہونے کے بعد کا وقت مختص ہوتا ہے۔مریض کی بدنیتی سے دوا کی تاثیر ختم ہوجاتی ہے اور جہاں فائدہ نہیں ہوتا وہاں بدنیتی عطائی ڈاکٹر کی ڈھال بنتی ہے‘‘۔ ؎۱

اسی طرح ایک اور مضمون ’’مچھلی کے پیٹ میں دمہ کی دوا‘‘ میں کراماتی ڈاکٹروں کا طریقہ علاج بتاتے ہوئے یوں طنز کیا ہے:

’’بعض معالجین کا طریقہ علاج عجیب ہوتا ہے۔ ایک صاحب ڈنڈے والے ڈاکٹر بابا کے نام سے مشہور ہیں۔وہ اپنا کراماتی ڈنڈا گھما کر علاج کرتے ہیں۔گردن میں اکڑن،سر میں پکڑن، جوڑوں میں اینٹھن یا پٹھوں میں سوجن یا کوئی دوسری شکایت ہو،موصوف کراماتی ڈنڈا مار کر سب ٹھیک کر دیتے ہیں۔ ڈنڈے کی کراماتی خوبی کی دریافت ایک حادثاتی واقعہ کا نتیجہ تھی۔موصوف کو شدید آدھے سر کے درد کی شکایت تھی۔ بہت علاج کرایا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ایک دن درد برداشت سے باہر ہوا تو انہوں نے غصہ اور بے بسی میں دادا ابا کا ڈنڈا اپنے سر پر دے مارا بس کرامت ہوگئی۔موصوف کے سر کا درد یکدم سے غائب ہوا اور ڈنڈے کی کرامتی خوبی کا انکشاف اور اظہار ہوا تب سے موصوف ڈنڈے کے زور پر علاج کررہے ہیں۔ ؎۲

مضمون ’’ہمارے بھی ڈاکٹراں کیسے کیسے‘‘ میں کہنہ ڈاکٹروں کی تصویر اس طرح کھینچی ہے:

امراض کہنہ جیسے دمہ، بواسیر،نواسیر، السر ذیابطیس وغیرہ کا شرطیہ علاج کرنے والے ماہرین کو ہم کہنہ ڈاکٹر، کہیں گے۔کہنہ ڈاکٹر خود کسی دائمی مرض کا

؎۱۔ہمارے بھی ڈاکٹراں کیسے کیسے۔فارغ البال۔ص:۱۶۴

؎۲۔مچھلی کے پیٹ میں دمہ کی دوا۔اعتماد۔19/جون۔2006ء

شکار رہتے ہیں۔ہم ایک صاحب کو جانتے ہیں جنہیں دمہ کا عارضہ تھا علاج تعویذ۔گنڈے اور چٹکلے، سب کروا چکے لیکن افاقہ نہ ہوا۔ایک دن خودکشی کے ارادے سے انہوں نے نامعلوم جڑی بوٹی کھائی۔موت تو نہ آئی لیکن مرض دمہ جاتا رہا۔آج یہی صاحب ڈاکٹر بنے دمہ کا شرطیہ علاج کرتے ہیں''۔ [1]

ڈاکٹری پیشے میں روحانی ڈاکٹر یعنی (مرشد) کا طریقہ علاج اوران کے پیدا کردہ مرض کسی کے پلےنہیں پڑتا۔تشخیص علاج کے بارے میں سوچتے ہوئے ااحساس کے پر جلنے لگتے ہیں۔عقل حیران اور دماغ نہ مانتے ہوئے بھی خاموش ہوجاتا ہے۔یہاں ثبوت کی ضرورت نہیں صرف اندھی عقیدت کی ضرورت ہوتی ہے۔ڈاکٹر عابد معزروحانی ڈاکٹروں کے طریقہ علاج اورعوام کی عقیدت پر گہرا طنز کیا ہے:

''اکثر ڈاکٹروں کا طریقہ علاج سمجھ میں نہیں آتا جب کہ 'روحانی ڈاکٹر' کا پیدا کردہ مرض پلےنہیں پڑتا۔ایسے ایسے امراض تشخیص کرتے ہیں کہ سنتے ہوئے ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے ہیں۔پسینہ آنے لگتا ہے۔حلق خشک ہوجاتا ہے۔کہتے ہیں'' آپ سرشام املی کے درخت کے نیچے سے گزر رہے تھے۔آپ کے حسن سے متاثر ہوکر ایک چڑیل وارد ہوچکی ہے۔چڑیل کا پریشان کرنا فطری عمل ہے لیکن چڑیل کا'' چڑیلا'' جذبہ رقابت میں آپ کا جانی دشمن ہوگیا ہے اور پھر بھیانک موت کا نقشہ کھینچا جاتا ہے۔۔۔روحانی ڈاکٹر اکثر و بیشتر تشخیص کرتے ہیں۔آپ پر کسی نے جادوٹونا کروادیا ہے۔ایک ادھیڑعمر کی عورت۔جو موٹی ہے نہ دبلی۔کالی ہے نہ گوری،رشتہ میں دور ہےاورنہ قریب نے تیرہ تاریخ کی دوپہر میں اثرات ملا کھانا کھلایا تھا۔روحانی ڈاکٹر گولی کیپسول،شربت کے بجائے تعویذ،گنڈے،لوبان، لیموں سے لے کر مرغ اور بکرے تک علاج میں استعمال کرتے ہیں۔بعض وقت جھاڑو اور جوتوں سے مریض کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔روحانی ڈاکٹر کے بیان کے مطابق جوتے مریض نہیں بلکہ مریض پر

---

[1] ۔ہمارے بھی ڈاکٹراں کیسے کیسے۔فارغ البال۔ص:163

وارد شیطان کو پڑتے ہیں جو مار کے ڈر سے بھاگ جائے گا۔ روحانی ڈاکٹر کے فلسفہ پر یقین رکھنے والوں کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ بڑی عقیدت کے ساتھ روحانی ڈاکٹر سے علاج کرواتے ہیں۔[۱]

روحانی ڈاکٹروں کے پاس ہر مرض کی دوا ہوتی ہے۔ ان کے یہاں مرض کی تشخیص فال سے دیکھی کی جاتی ہے۔ یہ روحانی ڈاکٹر فالوں کے ذریعہ دوسروں کی قسمت و تقدیر دیکھ کر جیون ساتھی چننے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ اپنی شعبدہ بازی کے ذریعہ لوگوں کا اچھا اور برا وقت بتلاتے ہوئے اُنہیں گردش میں لاتے ہیں۔ جب کہ خود اپنی بیوی اور بچوں کی قسمت کب سنورنے اور خراب ہونے والی ہے بتلا نہیں سکتے۔ ڈاکٹر عابد معز پی سی مشین کے حوالے سے بابا لوگ و جیوتشیوں پر یوں گہرا طنز کیا ہے، لکھتے ہیں؛

''پی سی نے بتایا کہ اس کے پاس ایک ایسا پروگرام بھی ہے جو شادی کے امیدواروں کو جیون ساتھی چننے کے لئے مشورہ دیتا ہے۔ لڑکے اور لڑکی کے درمیان نباہ ہونے کے امکانات کا جائزہ لیتا ہے متوقع امیدواروں کو ان کی پسلی کا جوڑا بھی فراہم کرتا ہے۔ ہم نے اس پروگرام کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ میں اور بیگم نے سوال نامہ پُر کر کے پی سی کے حوالے کیا اور پوچھا کیا ہم میں نباہ ہو سکے گا؟ کچھ دیر گھمبیر خاموشی کے ساتھ پی سی سوچتا رہا اور پھر جواب دیا۔ امیدواروں کی عادت و اطوار اور خیالات قطب شمالی اور قطب جنوبی کی طرح ہیں۔ نباہ ممکن نہیں ہے۔ دونوں آپس میں شادی سے سخت پرہیز کریں۔ اگر بد قسمتی سے شادی ہو بھی جائے تو چند ہفتوں سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔ پی سی کا فیصلہ سن کر میں نے بیگم سے کہا۔ داد دیجئے بیگم پچھلے پندرہ برسوں سے نباہ کئے جا رہا ہوں۔ بیگم نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور میں جو صبر کئے جا رہی ہوں۔ اس کا بھی حساب کیجئے گا''۔ [۲]

---

[۱] ۔ ہمارے بھی ڈاکٹراں کیسے کیسے۔ فارغ البال۔ ص:166-167

[۲] ۔ سگ گزیدہ۔ پی سی۔ ص:15-19

ڈاکٹر عابد معز کا کہنا ہے کہ بعض ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹروں کے طریقہ علاج کی خامیوں کو بتلاتے ہوئے اپنے طریقہ علاج کی خوبیوں کو بہترین انداز میں ظاہر کرتے ہیں۔لیکن ان ڈاکٹروں میں ایک ایسا ڈاکٹر ہوتا ہے جو تمام ڈاکٹروں کے طریقے علاج اپنا تا ہے۔ یونانی حکمت میں اس کا دخل رہتا ہے۔وہ بیماری کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لئے ہومیوپیتھی کی دواؤں کا استعمال کرتا ہے اور وقتی آرام کے لئے ماڈرن میڈیسن سے کام لیتا ہے عابد معز کے مطابق ایسے ڈاکٹر کو ہرفن مولا ڈاکٹر کہتے ہیں، چنانچہ ہرفن مولا ڈاکٹر کے طریقہ علاج پر ضرب کاری کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایک قسم ہرفن مولا ڈاکٹر'' کی ہے انہیں حکمت میں دخل رہتا ہے۔ جڑی بوٹی ان کے گھر کی کھیتی، ماڈرن میڈیسن ان کا شوق اور ہومیوپیتھی موصوف کا مرغوب موضوع ہوتا ہے۔نام سے پہلے ڈاکٹر حکیم اور وید لکھتے ہیں تو نام کے بعد اسپیشلسٹ کا دم چھلا لگاتے ہیں۔ایک مرض کا علاج مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔وقتی آرام کے لئے ماڈرن میڈیسن سے کام لیتے ہیں۔ جڑ پیڑ سے مرض کو ختم کرنے کے لئے حکمت کا سہارا لیتے ہیں۔ دوا کے مضر اثرات کو زائل کرنے کے لئے ہومیوپیتھی طریقہ علاج کام آتا ہے۔ چونکھا علاج سے معلوم نہیں مرض کا حشر کیا ہوتا ہے لیکن مریض کی حالت قابل رحم ہوجاتی ہے''۔[1]

عابد معز کے مطابق ایسے ڈاکٹروں کے پاس ہر مرض کی دوا اور علاج شرطیہ ہوتا ہے ایسے ڈاکٹروں کے اشتہارات میں صرف دعوے و چیلنج ہی ہوتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''بغیر آپریشن علاج، کی سرخی کے ساتھ لکھا ہوتا ہے۔ سرجن کا استرا آپ کے جسم پر مستقل نشان لگانے سے پہلے ہمیں موقع دیجئے! ہماری آزمودہ دوا کے استعمال سے سرجری کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ دونوں باتیں صحیح ثابت ہوتی ہیں۔انہیں موقع دینے سے اکثر و بیشتر پیچیدگیوں کے ساتھ سرجن سے رجوع

---

[1] ۔ ہمارے بھی ڈاکٹر اں کیسے کیسے۔فارغ البال۔ص:166 -165

ہونا پڑتا ہے اور کبھی کبھی تو سرجری کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ جب مریض ہی باقی نہ رہے تو سرجن اپنے فن کا مظاہرہ کہاں کرے گا‘‘۔ ۱؎

ڈاکٹر عابد معز کا کہنا ہے کہ ایسے ڈاکٹروں کے اشتہاروں میں ان کے شرطیہ دعوے جو پڑھنے کے قابل اور دل کو لبھانے والے ہوتے ہیں، جب کہ ایسے ڈاکٹر جو کسی نہ کسی مرض کا شکار رہتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے اشتہاری ڈاکٹروں پر روشنی ڈالتے ہوئے طنز کا نشتر چلاتے ہیں:

’’ایک اشتہاری ڈاکٹر کا دعویٰ ہے۔ دنیا میں کسی کو بیمار نہ رہنے دوں گا۔ اب آپ سے کیا چھپائیں ہمیں دواخانے کے اطراف کئی افراد مختلف بیماریوں میں مبتلا نظر آئے اور باوثوق ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ ڈاکٹر صاحب بواسیر کے مریض ہیں آنکھوں کے اشتہاری ڈاکٹر کا بیان ہے، میرے ہوتے ہوئے کوئی اندھا نہیں ہوگا۔ ایک اور اشتہاری ڈاکٹر کا کہنا ہے۔ کوئی ایسا مرض نہیں ہے جس کا علاج نہ ہوا ہو! پھر آپ اتنے دن سے کیوں بیمار ہیں ہم سے ملئے۔ ہمارے پاس ہر مرض کا علاج اور ہر علاج کا مرض موجود ہے۔ معاشیات سے دلچسپی رکھنے والے ایک ڈاکٹر کا نعرہ ہے۔ مہنگائی کے دور میں ہمارے یہاں سستے دام صحت خرید فرمائیے‘‘۔ ۲؎

ڈاکٹر عابد معز نے جہاں ڈاکٹروں کی خصوصیات کی تصویر کشی کرتے ہوئے اُن کی خوبیاں اور خامیاں ظاہر کی ہیں وہیں یم بی بی یس (MBBS) ڈاکٹروں کی خامیاں اور خوبیاں بھی بیان کی ہیں۔ بلڈ پریشر کے حوالے سے (MBBS) ڈاکٹروں کی خصوصیات کو اس طرح طنز و مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے لکھتے ہیں:

’’دوسرے لوگوں کا بلڈ پریشر شاید اس لیے نارمل ہے کہ وہ ابھی تک ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے۔ اگر وہ ڈاکٹر کے پاس گئے ہوتے تو ان پر بھی ہائی بلڈ پریشر کا

۱؎ ۔ مچھلی کے پیٹ میں دمہ کی دوا۔ اعتماد۔ 19/جون 2006ء

۲؎ ۔ ہمارے بھی ڈاکٹراں کیسے کیسے۔ فارغ البال۔ ص:161-162

لیبل چسپاں ہو گیا ہوتا یا پھر انہیں یہ مشورہ ملتا اس وقت آپ کا پریشر نارمل ہے آپ چند دن بعد مجھ سے ملئے۔ میں دوبارہ بلڈ پریشر چیک اپ کروں گا۔ یہ دھمکی سن کر جلد یا دیر ان حضرات کا بلڈ پریشر بھی نارمل سے ہائی ہونے پر مائل ہوتا ہے۔ ہائی بلڈ پریشر کو عام کرنے میں ڈاکٹروں کا بہت اہم رول ہے۔ وہی تو ہیں جو ہمیں ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا کرتے ہیں۔ ورنہ ہمیں کیا پتہ! ہمیں تو اندازہ نہیں ہوتا کہ ہمارا کوئی پریشر بھی ہے اور وہ زیادہ بھی ہے''۔ ۱؎

عصر حاضر کے مادہ پرست ڈاکٹروں نے طب کو اتنا بدنام کیا ہے کہ انسانیت کانپنے لگتی ہے۔ وہ پہلے مریضوں سے رقم وصول کرنے ڈھیر سارے غیر ضروری معائنے کرواتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز ایسے ڈاکٹروں پر برہم ہو کر انہیں یوں نشانہ تمسخر بنایا ہے:

''ہماری نظر میں ڈاکٹر سماج کے اس طبقہ کا نام ہے۔ جو لوگوں کو مختلف بیماریوں میں مبتلا دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے۔ آپ شائد ہم سے اختلاف کریں۔ ماضی میں ڈاکٹر کے تعلق سے ہمارا نظریہ ایسا نہ تھا۔ سماج میں موجود ڈاکٹر کہلائے جانے والے مختلف افراد کی بہتات نے ہمیں اپنا خیال بدلنے اور ڈاکٹروں کی اقسام پر مضمون لکھنے کے لیے مجبور کیا ہے''۔ ۲؎

ڈاکٹر عابد معز کے موضوعات میں زندگی کے مسائل کے علاوہ سماج اور معاشرے کی ناہمواریوں کا غم اور دکھ کا احساس بھی ملتا ہے۔ اپنے دل کی بات کسی نہ کسی طرح اپنی تحریروں سے ظاہر کر دیتے ہیں مثلاً ہندوستان میں ہر سال ہزارہا MBBS ڈاکٹرس کالجوں سے نکلتے ہیں لیکن پھر بھی یہاں کے سرکاری اسپتال ڈاکٹروں سے خالی نظر آتے ہیں۔ غریب عوام مجبوراً خانگی دواخانوں کی جانب رخ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ملک کے سرکاری دواخانوں کی صورت حال اور حکومت کی لاپرواہی پر گہرا طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱؎ ۔ بلڈ پریشر کیوں بڑھتا ہے۔ اعتماد۔ 2/جولائی۔ 2007ء

۲؎ ۔ ہمارے بھی ڈاکٹراں کیسے کیسے۔ فارغ البال۔ ص: 161

''وطن میں ڈاکٹر جنس نایاب ہے۔ سرکاری دواخانوں میں ڈاکٹر نظر نہیں آتے اور نہ ہی دوائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ہر سمت مریضوں اور بیماریوں کا بول بالا ہوتا ہے۔ خانگی مطب کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں مریض اور بیماریاں ڈاکٹر کا انتظار کررہی ہوتی ہیں۔ انتظار میں آنکھیں تھک کر بند ہونے کو رہتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب وارد ہوتے ہیں۔ مریض ڈاکٹر کو گھیر لیتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کسی نبض پر ہاتھ رکھے دوسرے مریض کی شکایت سنتے ہوئے تیسرے مریض کا نسخہ لکھ رہے ہوتے ہیں۔ نظریں چوتھے مریض کے منہ کے اندر جھانک رہی ہیں۔ ایسے افراتفری میں ہم اپنا مدعا بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سے دوائیں لیتے ہیں استفسارات اور پرہیز سے معلومات کم اور جھڑکیاں زیادہ ملتی ہیں''۔ [1]

سرکاری دواخانوں میں ڈاکٹروں کی کمی سے مریض ڈاکٹروں کی آمد کا اور بیماریاں موت کا انتظار کرتے دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے ہی کوئی ڈاکٹر وارڈ میں داخل ہوتا ہے تو مریض ڈاکٹر کو گھیر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر کسی مریض کے نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوسرے مریض کی شکایات سنتا ہے۔ ایسے افراتفری ماحول میں ڈاکٹر سے دوائیوں اور پرہیز کے بارے میں مزید معلومات کرنا گویا معلومات کم اور جھڑکیاں، حاصل کرنا ہوتا ہے غرض ڈاکٹروں کی کمی کی وجہ سے مریضوں کی صحیح جانچ ہو نہیں پاتی۔ سرکاری دواخانوں میں MBBS ڈاکٹروں کی جنس نایاب اس لئے ہورہی ہے کہ ملک کا اڈمنسٹریشن اور سیاسی لیڈر حضرات ڈاکٹر تیار کرنے کا ہنر سیکھ لیا ہے لیکن ڈاکٹروں سے خدمت لینے کا فن نہیں سیکھا۔ اسی لئے ہمارے یہاں تیار ہونے والے ڈاکٹر سیدھے یوروپ یا عرب ممالک کا رخ کرتے ہیں وہاں انہیں مکمل معاوضہ اور عزت بھی ملتی ہے، یا خانگی دواخانوں میں خدمات انجام دینا بہتر سمجھ رہے ہیں۔ ڈاکٹری ایک مقدس پیشہ ہے۔ دور حاضر کے چند مادیت پرست ڈاکٹروں نے پیشہ طب کو اتنا بدنام کیا ہے کہ انسانیت شرمسار ہونے لگی ہے۔ وہ مریضوں سے موٹی تازی رقم حلال کرنے کے لیے ڈھیر سارے معائنے غیر ضروری ایکس رے کرواتے ہیں۔ بعض

---

[1] ۔الدکتورالمریض۔اردونیوز۔۴/مارچ،۱۹۹۶ء

اوقات کچھ ڈاکٹر دوران آپریشن مریضوں کے اعضاء نکال کر ضرورت مندوں کو فروخت کر دیتے ہیں۔ آج سے پچیس تیس سال پہلے مریض حضرات تکلیف کے ڈر سے آپریشن کروانے سے ڈرتے تھے۔ لیکن آج مریض آپریشن کروانے سے ڈرتے ہیں، تکلیف کے ڈر سے نہیں بلکہ اپنے جسم کے اعضاء چوری ہونے کے ڈر سے۔ ڈاکٹر عابد معز اپنے مضمون ''گردہ چوری'' میں ان مادا پرست انسان نما بھیڑیے ڈاکٹروں پر گہرا طنز اس طرح کیا ہے۔ کہتے ہیں:

''میں ایک دوست کی عیادت کرنے ان کے گھر گیا۔ چند دن پہلے آپریشن کر کے موصوف کا پتہ نکالا گیا تھا اور اب وہ گھر پر آرام کر رہے تھے۔ میں نے ان کی صحت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا۔ آپریشن کامیاب رہا۔ الحمدِللہ بعد میں کوئی پیچیدگی یا مشکل نہیں ہوئی۔ طبیعت پہلے سے بہتر ہے لیکن ایک بات پریشان کئے جا رہی ہے میرا پیٹ کھولا گیا تھا اور پیٹ میں گردے بھی ہیں کہیں بیمار پتے کے ساتھ صحت مند گردہ تو نہیں نکال لیا گیا ہے۔

کیا تمہیں سرجن پر بھروسہ نہیں ہے؟ میں نے سوال کیا۔

پہلے تھا لیکن اب نہیں رہا۔ جب سے گردہ چوری اور گردہ کے کاروبار کے بارے میں پڑھا ہے ڈاکٹروں اور دواخانوں پر رہا سہا اعتماد ختم ہوتا جا رہا ہے۔ سن رکھا تھا کہ ڈاکٹر ڈھیر سارے معائنے کرواتے ہیں تا کہ انہیں کمیشن ملتا رہے دوائیں زیادہ لکھتے ہیں کہ ان میں ان کا بھی حصہ ہوتا ہے اور غیر ضروری چیر پھاڑ تک کر دیتے ہیں تا کہ طاقتور بل بنے''۔ [1]

مضمون ''آدمی کماتا نصیب سے ہے'' میں موجودہ دور کے MBBS ڈاکٹروں کی صورت حال پر بھی گہرا طنز کیا ہے:

''آزادانہ طور پر کام کرنے والے ایک ہی پیشہ سے وابستہ مختلف افراد کی

---

[1] ۔ ''گردہ چوری'' اعتماد۔ 25 / فروری۔ 2008ء

الگ الگ آمدنی ہوتی ہے۔ وطن میں ڈاکٹر حضرات کو پیسہ بنانے کی مشین تصور کیا جاتا ہے لیکن ہم نے بعض ڈاکٹروں کو مطب کے دروازے پر کھڑے مریضوں کا انتظار کرتے دیکھا ہے۔ اب تو سنا ہے کہ ڈاکٹر مریضوں کی تلاش میں گلی گلی بھٹک رہے ہیں پھر بھی لوگ وہیں علاج کروانا پسند کرتے ہیں جہاں ایک مریض کی دوا دوسرے کو دیئے جانے کا احتمال رہتا ہے ایسی صورتحال سے ہمارا یقین پختہ ہوا جاتا ہے کہ آدمی کما تا نصیب سے ہے''۔ [1]

پولس

عابد معز اپنی تحریروں میں ڈاکٹروں کے علاوہ پولس، وکیل، درزی اور حجام وغیرہ جیسے سماجی کرداروں کی خوبیوں کو شگفتہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ وہیں اُن کے خامیوں پر طنز بھی کیا ہے۔ ہر ملک میں پولس امن و امان کی ضامن کہلاتی ہے۔ ہر شہری کی حفاظت کرنا بھی اس کا فرض بنتا ہے۔ اس کے باوجود پولس بعض مرتبہ تعصب برتتی ہے۔ پولس بے انصافیاں وبے اعتدالیاں اور رشوت خوری کے معاملے میں بدنام بھی ہے۔ پولس کا دعویٰ ہے کہ وہ عوام کی دوست ہے۔ انہیں چورا چکوں، بدمعاشوں، قاتلوں اور دہشت گردوں سے بچاتی ہے۔ کبھی کبھار عوام انصاف کے نہ ملنے پر احتجاج کرتے ہوئے تشدد پر بھی آجاتے ہیں۔ ایسی ناگہانی حالت میں پولس احتجاجی عوام کو منتشر کرنے کے لیے سیدھے بندوق کا استعمال کرتی ہے۔ جب کہ دوسرے طریقوں سے بھی عوام کو منتشر کیا جاسکتا ہے۔ جیسے آنسو گیس، لاٹھی چارج وغیرہ۔ عابد معز پولس کی کارکردگی پر اس طرح طنز کیا ہے لکھتے ہیں:

''اس کے پاس نہتے لوگوں کو قابو میں کرنے کے لیے دوسرے طریقے بھی ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کو رلا سکتی ہے۔ بندوق ہی چاہے تو ان کے پاس واٹر گن

---

[1] ۔ ''آدمی کما تا نصیب سے ہے''۔ اردو نیوز۔ ۲۷/ جولائی ۱۹۹۴ء۔

ہوتی ہے۔اسے وہ چلاسکتی ہے۔لیکن پولس فوری بے قابو ہوکر گولیاں چلانے لگتی

ہے''۔ ۱؎

متعصب پولس والوں کے نزدیک مسلم نوجوان کو گرفتار کرنے کے لیے صرف داڑھی اور ٹوپی جیسے ثبوت کافی ہیں۔عابد معز اپنے ایک مضمون ''چھپ جا بیٹا نہیں تو پولس گولی مار دے گی'' میں پولس کے تعصّبانہ رویئے پر گہرا طنز کیا ہے:

''معلوم نہیں کیوں ہماری پولس کو نوجوان نسل ایک آنکھ نہیں بھاتی، نوجوان بالخصوص داڑھی پالنے والے، پولس کو دشمن دکھائی دیتے ہیں اور دشمنوں کا صفایا کرنے کا پولس کے پاس ایک آزمودہ نسخہ ہے۔اسے پولس انکاؤنٹر کہتی ہے۔بڑی چابکدستی سے پولس انکاؤنٹر کرتی ہے۔بہت دیر بعد ہمیں پتہ چلا کہ انکاؤنٹر اصلی اور نقلی بھی ہوتے ہیں اور پولس نقلی انکاؤنٹر میں ماہر ہے۔اتنے نقلی انکاؤنٹر ہوئے ہیں کہ اب ماہرین کو انکاؤنٹر کی نئی تعریف وضع کرنی پڑ رہی

ہے''۔ ۲؎

جہاں کہیں بھی فساد برپا ہو پولس فساد کے دوران یا فساد کے بعد فسادیوں کو گرفتار کرنے کے بجائے صرف مسلم گھروں یا عربی مدرسوں کی تلاشی لیتی ہے، چنانچہ عابد معز حلیم کے حوالے اس ایک طرفہ رویہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اس طرح طنز کیا ہے کہتے ہیں:

''ایک دوست کو فون کر کے معلومات حاصل کرنا چاہا میں نے رمضان کی مبارک باد دے کر حلیم خوری کے متعلق اور حلیم کا مزا اور مزاج پوچھا۔کون سی اور کیسی حلیم میاں وہ پھٹ پڑے امسال شہر کا ہی مزاج بگڑا ہوا ہے۔پچھلے سال حلیم کھائی تھی اور انعام میں ایک ٹوپی بھی ملی تھی۔لیکن اس مرتبہ حلیم کھانے کو جی نہیں چاہتا۔رسم بنھانے کے لیے زبردستی آدھی ایک پلیٹ حلیم زہر مار کی

۱؎ ۔چھپ جا بیٹا نہیں تو پولس گولی مار دے گی۔اعتماد۔28 مئی۔2007 ء

۲؎ ۔چھپ جا بیٹا نہیں تو پولس گولی مار دے گی۔اعتماد۔28 مئی۔2007.ء

ہے۔شاید تم یہاں کے حالات سے باخبر نہیں ہو۔۔۔شہر میں جا بجا پولس تلاشی
لے رہی ہے۔ٹیلی ویژن پر پولس کو تلاش کرتا ہوا دکھایا جا رہا ہے اور اخباروں
میں بھی تصویریں چھپ رہی ہیں۔ پولس تلاش کرنے میں رات دن مصروف
ہے۔دن میں راہ چلتے لوگوں کی تلاشی لیتی ہے اور رات میں گھروں اور مدرسوں
کی۔۔۔''۔ [1]

عابد معز نے ڈاکٹر، پولس کے علاوہ بیمہ ایجنٹ کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے ان کے مطابق بیمہ ایجنٹ باتونی ہوتے ہیں۔ان کے چنگل سے نکلنا محال ہوتا ہے۔ پہلے وہ اشاروں و کنایوں میں سمجھا کر صارف بناتے ہیں۔اگر صارف اشاروں و کنایوں میں نہ آئے تو وہ کڑوے کسیلے تباہی و بربادی پریشانی اور مایوس کن واقعات سناتے ہوئے دھمکاتے ہیں۔موت سے ہر کوئی ڈرتا ہے۔ یہ ایک فطری خوف رہتا ہے۔ بیمہ ایجنٹ اس خوف سے فائدہ اٹھا کر اپنا روزگار پیدا کرتا ہے۔چنانچہ عابد معز بیمہ ایجنٹ کی خصوصیات کو ظاہر کرتے ہوئے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔لکھتے ہیں:

''دعا سلام اور خیریت دریافت کرنے کے بعد ہماری صحت اور کاروبار کے
متعلق چند سرسری سوالات کرتے ہیں اور پیسے کی قدر و قیمت پر تقریر شروع
کر دیتے ہیں۔آج کا نظام حیات صرف روپیہ پیسہ ہے۔ پیسہ ہے تو سب کچھ
ہے رشتہ دار دوست احباب ہیں۔اعتماد اور آپ کا وقار بھی ہے۔ پیسہ نہ ہو تو آپ
کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔آج آپ خوش ہیں اس لئے کہ آپ کے پاس پیسہ
ہے دولت ہے۔معلوم نہیں کل آپ کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو۔سوچئے اس وقت
کیا ہوگا؟ کوئی ساتھ نہیں دیتا۔اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ اچھے وقتوں کا پیسہ
برے وقتوں کے لئے اٹھا کر رکھنا چاہئے۔آپ ہمیں اچھے وقت کا پیسہ دیجئے ہم
آپ کے برے وقت پر کام آئیں گے۔آپ کے پیسوں پر ہم منہ مانگا فائدہ بھی

---

[1] ۔شہر الحلیم۔اعتماد۔24 ستمبر۔2007ء

دیتے ہیں۔اشاروں کنایوں میں اگر ہم بیمہ ایجنٹ کی بات سمجھ گئے تو ٹھیک ہے ورنہ ہمیں کھلے الفاظ میں ڈرانے اور دھمکانے لگتے ہیں۔ دنیا فانی ہے۔ زندگی آنی اور جانی ہے۔ اگر آپ چل بسے تو بیمہ کی رقم آپ کے پسماندگان کے کام آئے گی اور ان کی زندگی آپ کے بغیر سکون سے گذرے گی۔ بیمہ پالیسی آپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گی۔ زندگی کے ہر موڑ پر بیمہ ایجنٹ ہمارا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ہمیشہ کڑوی کسیلی، تباہی و بربادی اور مایوسی اور پریشانی کی باتیں کرتے ہیں۔ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زبان خراب ہوتی ہے۔انہیں ناراض کرنے سے بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں ان کی باتیں سچ ثابت نہ ہو جائیں۔نوکری ملتے ہی ہر ماہ میں حصہ دار بننے کے لیے آدھمکیں گے۔مبارک آپ کو نوکری مل گئی ہے۔لیکن کیا آپ نے سوچا ہے نوکری آخر نوکری ہے۔آج ہے کل نہیں۔اپنی مرضی سے نہ چھوڑا تو شائد مالک چھٹی کردے۔ تب آپ کیا کریں گے؟ ایک بیمہ پالیسی لے رکھئے نوکری چھوٹنے پر کام آئے گی۔

شادی کے مبارک موقع پر دلہن کے بیوہ ہونے کی دہائی دے کر پالیسی کے لیے ورغلائیں گے۔لڑکے کی پیدائش پر پڑھائی اخراجات اور لڑکی پیدا ہونے پر شادی کے وقت لٹ جانے کا اندیشہ ظاہر کرکے پالیسی لینے پر مجبور کردیں گے۔۔۔ بڑھاپے کے لئے جوانی کی کمائی کر رکھ چھوڑنا چاہئے۔اگر بڑھاپے میں پالیساں پاس ہوں گی تو اصلی بیٹا تو اصلی ہے کئی نقلی بیٹے خدمت کرنے دوڑے چلے آئیں گے''۔ [1]

خامیوں کو خوبیوں میں تبدیل کرنا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں ہوتی لیکن بعض لوگ اس معاملے میں خوب مہارت رکھتے ہیں جیسے ٹیلر اور حجام وغیرہ۔ چنانچہ ایک جگہ عابد معز درزی کی اس مہارت کو اس طرح

---

[1] بیمہ ایجنٹ سے بچنا محال ہے۔ فارغ البال۔ص:57

ہدف طنز بنایا ہے لکھتے ہیں:

''ہمارے خیال میں کم سے کم کپڑے پہننے کا نام فیشن ہے۔لیکن درزیوں کا کہنا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کپڑے سلیقہ سے پہننا فیشن ہے۔درزی دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ نت نیا فیشن ایجاد کرتے ہیں۔ہمیں درزیوں کے اس دعویٰ سے اتفاق ہے۔دراصل درزی اپنی غلطیوں کو فیشن کا نام دیتے ہیں۔بڑا کالر کاٹنے میں درزی سے غلطی ہوئی تو چھوٹے کالر کا فیشن چل پڑا۔گردن کو صراحی دار شکل نہیں دے سکے تو بغیر کالر شرٹ کے فیشن کا بول بالا ہوا۔درزی گاہک کے فیشن نامی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔جہاں درزی سے غلطی ہوئی تو موصوف نے اس غلطی کو نبھانے کے لیے نیا فیشن وجود میں لے آئے۔دو دن پہلے کی بات ہے درزی نے ہماری پتلون کو بہت تنگ کاٹ دیا۔اور اسے پہننے کے قابل بنانے کے لئے رومالی لگائی۔اور ہم سے کہہ دیا کہ یہ نیا فیشن ہے۔ ابھی ابھی شروع ہوا ہے''۔

ڈاکٹر صاحب نے درزی کی ایک اور خوبی وخصوصیات کو مزاحیہ انداز میں یوں پیش کیا ہے کہتے ہیں:

''درزی وہ شیر ہوتا ہے جو دوسروں کے شکار یا اپنے ہی شکار پر دوسری بار منہ نہیں مارتا۔پرانے کپڑوں کے مرمت کے لئے گھر والی یا پھر دھوبی کی خدمت حاصل کرنی پڑتی ہے''۔ ۲

عابد معز کے مطابق ٹیلر اور حجام دو ایسے افراد ہوتے ہیں جو اپنی غلطیوں پہ نادم ہونے کے بجائے فیشن کا نام دے کر گاہک کو زیادہ لوٹتے ہیں چنانچہ انہوں نے حجام کی فطرت اور مہارت کو اس طرح اپنے طنزو

۱۔ہم آپ کو معزز بناتے ہیں۔فارغ البال۔ص:۱۱۰

۲۔ہم آپ کو معزز بناتے ہیں۔فارغ البال۔ص:۱۱۱

مزاح کا موضوع بنایا ہے:

''فارغ البال شخص بے بسی اور لاچارگی پر خود اپنے آپ کے بعد اگر کسی دوسرے کو ہمدردی ہوسکتی ہے تو وہ حجام ہے۔ حجام فارغ البال شخص کا سر ایسی مایوسی کے عالم میں تکتا ہے جیسے کوئی کسان اپنی بنجر زمین کو دیکھ کر آہیں بھرتا ہے۔ حجام کو بال اور کسان کو فصل نہ کاٹنے کی خلش رہتی ہے۔ بعض حجام سروں پر بال برقرار رکھنے اور بال اگانے پر تحقیق کرتے ہیں۔ فارغ البال سر ان کی تجربہ گاہ ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جس دن بھی کوئی حجام، یا خود فارغ البال شخص، فارغ البال کا علاج کا دریافت کر لے گا وہ اسی دن مالا مال ہو جائے گا اور فارغ البال کا خاتمہ ہو جائے گا''۔ [1]

شوہر

عابد معز نے اپنی تحریروں میں شوہر بیوی جیسے کرداروں کے فطری اور نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے مزاح پیدا کیا ہے۔ موقع محل سے ان کرداروں کو طنز کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ ڈاکٹر عابد معز بیانیہ اور افسانوی انداز سے کرداروں کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ جس سے انکا قاری مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کا مقصد کرداروں کی خامی اور خوبی پیش کر کے طنز و مزاح پیدا کرنا نہیں بلکہ ہنستے ہنساتے اصلاح معاشرہ ہے۔ شادی کے بعد شوہر کی حالت کو مزاح کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شادی کے بعد مرد بحیثیت شوہر مظلوم ترین شخصیت بن جاتا ہے۔ یہ خیال صرف ہمارا ہی نہیں ہے۔ کئی اور شوہر بھی متفق ہیں لیکن انہیں اس طرح کہنے کی شاید اجازت یا ہمت نہیں ہے۔۔۔ کہتے ہیں شادی وہ ناول ہے جس کے پہلے باب میں ہیرو کی موت ہو جاتی ہے۔ ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ بہانہ سازی کے فن میں مہارت حاصل کر کے ایک شوہر شادی کے بعد اپنی انفرادیت

---

[1] ۔فارغ البال۔فارغ البال۔ص

باقی و برقرار رکھ سکتا ہے۔ بیوی سے محبت کے ساتھ جنگ بھی ہوتی ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دنیا کی طویل ترین جنگ وہ ہے جو شوہر اور بیوی کے درمیان روزِ اول سے اب تک جاری ہے۔محبت اور جنگ میں سب جائز ہے کہ اصول پر ہم سمجھتے ہیں کہ شادی کے بعد بہانہ بنانا یا جھوٹ بولنا بری عادت نہیں بلکہ یہ ایک طرح کا حفظ ما تقدم ہے۔مشکل یہ ہے کہ عورت بہانہ سازی کے فن میں مرد پر سبقت لے چکی ہے۔۔۔محبت اندھی ہوتی ہے لیکن کھونگھٹ الٹنے سے پہلے۔ شادی کے بعد جب خوش قسمت محبوب بدقسمت شوہر بن جاتا ہے''۔ [1]

بعض نوجوان ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ صرف کھانے اور سونے کے لیے ہی گھر آتے ہیں۔کچھ ایسے بھی نوجوان ہوتے ہیں جو دوستوں کی محفلوں میں مست مگن ہنستے ہنساتے رہتے ہوئے اپنے گھروں کو بھول جاتے ہیں۔والدین انہیں گھر پر رہنے کی تلقین کریں تو ناراض ہوجاتے ہیں۔جب یہی نوجوانوں کی شادی ہوجاتی ہے تو ان کی زندگی یکسر بدل جاتی ہے۔نوجوانوں کی شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کی صورت حال پر طنز ومزاح کے انداز میں بیان کرتے ہوئے یوں روشنی ڈالی ہے:

''شادی کے بعد بیوی کے آنچل میں شوہر کی تعلیم وتربت شروع ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ شادی سے قبل ہی تعلیم وتربیت کی ابتداء ہوجاتی ہے ۔تعلیم کم اور تربیت زیادہ ہوتی ہے۔اس لیے کہ اکثر شوہر شادی تک اپنی تعلیم مکمل کرچکے ہوتے ہیں۔آنچل کی تربیت کا پہلا سبق بخوشی ورضا اپنے آپ کو گھر کی چہار دیواری میں مقید ہونے یا کر لینے کا دیا جاتا ہے۔۔شادی کے بعد مختلف طریقوں اور حربوں سے گھر پر رہنے کی تربیت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے تیس مار خاں جو محفلوں کی جان اور دوستوں کی آن بان ہوا کرتے تھے،شادی کے بعد بھیگی بلی بنے گھر بیٹھے رہتے ہیں۔ہمارے ایک اپنی ذات میں انجمن قسم کے دوست کی

---

[1] ۔گھونگھٹ اُلٹنے سے پہلے،سگ گزیدہ ص:۱۱۱۔جنوری:1995

شادی ہوئی۔شادی سے پہلے موصوف کے چوبیس گھنٹے یار دوستوں ہی میں کٹتے تھے۔رات کبھی اس دوست کے گھر تو کبھی اس دوست کے روم پر بسر ہوتی تھی۔ شادی کے بعد کئی دن تک ان سے ملاقات نہ ہوئی تو ہمیں تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں دشمنوں کی طبیعت ناساز نہ ہو۔ہم عیادت کرنے موصوف کے گھر گئے۔موصوف نے کھڑکی سے جھانک کر اپنی خیریت کی اطلاع دی اور پھر گھر میں غروب ہو گئے۔

گھر پر رہنے کی عادت پڑنے کے ساتھ بیوی پر دل و جان سے فدا ہونے کی تربیت ہوتی۔قسم ڈالی جاتی، وعدہ لیا جاتا ہے اور ایسے ایسے حربے استعمال ہوتے ہیں کہ منہ زور اور شہ زور مرد بیوی کے ایک اشارے پر مثل پروانہ اپنے بال و پر جلا بیٹھتے ہیں، تربیت کے ایسے شاندار نتائج شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آتے ہیں۔اچھا خاصا شوہر خواہ مخواہ ہی بیوی کے حسن کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ایک کرنے لگتا ہے۔آپ جنت کی حور ہیں۔میرے لیے زمین پر آئی ہیں۔خدا نے فرصت سے آپ کو بنایا اور مجھے عطا کر کے کرم کیا ہے''۔[1]

آج کے نوجوانان کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی قدر و عزت نہیں کرتے بلکہ اپنے ہر عمل سے انہیں ناراض کرتے رہتے ہیں، اگر گھر میں کھانا اچھا نہ بنا ہو تو خوشی سے کھانے کے بجائے ناراض ہو کر کسی اچھے ہوٹل کا رخ کرتے ہیں لیکن شادی کے بعد یہی معاملہ بیوی سے ہو تو شوہر کا رویہ بدلا ہوتا ہے۔چنانچہ عابد معز کہتے ہیں:

''شروع میں شوہر بیوی کے ہاتھ کا بنا کھانا مجبوراً کھاتا ہے۔پھر اسے عادت پڑ جاتی ہے۔وقت کے ساتھ اس عادت میں اتنی پختگی آتی ہے کہ اِسے کوئی اور کھانا اچھا نہیں لگتا اور نہ ہی ہضم ہوتا ہے''۔ [2]

---

[1] ۔آنچل کی تربیت۔فارغ البال۔ص:113-114

[2] ۔معرکتہ الزوبہ۔سگ گزیدہ۔ص:151

مرد کی زندگی میں عورت ایک ایسا کردار ہے جو غیر ذمہ دار مرد کو ذمہ دار مرد بناتی ہے بلکہ محبت محنت مشقت،صبر،شکر،اور کفایت شعاری کا عالمانہ درس دیتی ہے۔ چنانچہ ایک مرد کو ذمہ دار اور گھریلو شخص بنانے میں بیوی کا کس قدر رول ہوتا ہے اس کی تفصیل کو عابد معز نے مزاحیہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے لکھتے ہیں:

> ''بیوی مرد کو ذمہ دار انسان بناتی ہے۔ بیوی بچوں اور ان کی خواہشات اور ارمانوں کی ذمہ داری نبھانے والا فرمابردار انسان! شادی سے پہلے کی غیر ذمہ دار اور آزاد زندگی کا خاتمہ کر کے بیوی اپنے شوہر کے گلے میں گھر گرہستی کا طوق لٹکاتی ہے۔ اس خوش گوار ذمہ داری کے سبب شوہر کی فطرت میں بنیادی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔محنت اور مشقت کی عادت پڑتی ہے۔ وہ کفایت شعار بنتا ہے۔بعض حضرات جنہیں بازار کا راستہ معلوم نہ تھا اور جو تھیلی اٹھا کر چلنے سے زمین میں گڑا جاتے تھے، شادی کے بعد ہم نے انہیں ہر دم تھیلی تھیلوں سے لدے پھندے دیکھا ہے۔ بے خبری اور گھوڑے بیچ کر سونے والی نیند رخصت ہوتی ہے۔ دو چار اقساط میں نیند پوری کرنے کا ہنر آتا ہے۔صبر کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔لڑائی جھگڑے سے گھبراتا ہے۔ بحث اور مباحثہ سے کتراتا ہے۔ بے چوں وچرا حامی بھرنے لگتا ہے۔ ہمارے خیال میں بے صبر و زبان دراز، لاپرواہ اور کام چور نوجوان کے لئے بیوی جیسی دوا سے بہتر علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا''۔ [1]

عابد معز کا خیال ہے کہ شادی کے بعد مرد مظلوم ترین شخص بن جاتا ہے اور شادی اس کے سنہرے دور کا اختتامیہ کہلاتی ہے شادی کے بعد ہی وہ ذمہ دار شخص ہو جاتا ہے۔ بلکہ راہ راست پر بھی آجاتا ہے۔لڑائی جھگڑوں سے کوسوں دور اور آہستہ آہستہ اپنی شریک حیات سے ڈرنے بھی لگتا ہے۔شوہروں کی اس مظلومیت کو مزاح کا نشانہ بناتے ہوئے عابد معز یوں رقم طراز ہیں:

---

[1] ۔فارغ البال۔مضمون آنچل کی تربیت۔ص:115-114

''بیوی کے طاقتور ترین خاتون ہونے کا اندازہ کرنے کے لئے فوربس میگزین کی طرح سروے کرنے کی ضرورت بھی نہیں بس آس پاس نظریں دوڑانا کافی ہے۔ کیسے کیسے اڑیل مردوں کو وہ ٹھیک کر دیتی ہے کہ زمانہ مثال دیتا ہے۔ بگڑے ہوئے نوجوانوں کو راہ راست پر لانے کے لئے زمانہ قدیم سے ان پر بیوی لادنے کا نسخہ کارگر ہے۔ شہ زور مردوں کو سب نے اپنی طاقتور ترین خاتون کے آگے، میں ......! ، میں......!! کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ تلوار کی نوک کی طرح کھڑی مونچھوں کو بیوی کے آگے مفلوج ہاتھ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ شیر خاں بہادر خان جیسے سورماؤں کو بیگمات سے ڈرتے دیکھا ہے''۔[1]

خواتین

عابد معز کی تحریروں میں شوہر جیسے کردار سے مردوں کی خامیوں اور خوبیوں کو ظاہر کیا وہیں انہوں نے خواتین کے فطری اور نفسیاتی پہلوؤں کو ظاہر کرنے کے لئے زیادہ تر بیوی جیسے کردار کا سہارا لے کر ان کی خامیوں اور خوبیوں کی نشاندہی کی ہے۔

عابد معز سماج میں عورت کے مقام و مرتبہ کو سمجھانے کے لیے علامہ اقبالؒ کے شعر کا ایک مصرعہ استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ، انہیں کے دم سے دنیا کی رنگینی اور دلچسپی بھی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ دنیا عورتوں کے لیے ہے اور ہر کوئی ان ہی کے لیے فکر کرتا ہے۔ لڑکا پیدا ہوتا ہے تو پوچھا جاتا ہے کہ ماں کی صحت کیسی ہے لڑکا بڑا ہو کر شادی کرتا ہے تو سوال ہوتا ہے دلہن کیسی ہے اور جب مرد اپنی زندگی کے دن پورے کر کے اس دار فانی سے چلا جاتا ہے تو دریافت کیا

---

[1] ۔ دنیا کی طاقتور ترین خاتون۔ اعتماد۔ 18/ اکٹوبر 2006ء

جاتا ہے کہ مرحوم نے بیوہ کے لیے کیا کیا چھوڑا ہے؟''۔ [1]

اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ اس دنیا میں عورت کا وجود نہ ہوتا تو یہ کائنات ویران سی ہوتی ہر کوئی عورتوں کی فکر کرتا ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو لوگ پوچھتے ہیں کہ ماں کی صحت کیسی ہے۔ یہاں تک کہ شوہر کے انتقال پر بھی ایسے ہی سوالات کئے جاتے ہیں کہ مرحوم نے بیوہ کے لیے کیا چھوڑا ہے۔ اس کے باوجود خواتین کی انجمن آزادی نسواں، عدم مساوات کا مسئلہ کھڑا کرتی رہتی ہیں کہ ہمیں مردوں کے برابر حقوق چاہئے۔ خواتین کے اس عدم مساوات کے تعلق سے ڈرامائیت وافسانوی انداز میں طنز ومزاح کا ہدف بناتے ہوئے اس طرح پیش کیا ہے:

''ہمارا سب سے اہم مسئلہ عدم مساوات ہے۔ آپ مرد حضرات ہمیں اپنے برابر نہیں سمجھتے۔ ہمیں اپنے سے کمتر درجہ کی مخلوق سمجھتے ہیں۔۔۔اس مرتبہ میں نے بیگم کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔ یہ سچ ہے کہ ہم خواتین کو اپنے برابر نہیں سمجھتے۔ ہم آپ کو اپنے سے بہتر جانتے ہیں اسی لیے تو آپ کو نصف بہتر کہتے ہیں اور لیڈیز فرسٹ کہہ کر آپ کی بڑائی کا اعتراف کرتے ہیں۔ آپ کو آگے رکھتے ہوئے ہم ہمیشہ آپ کے پیچھے رہتے ہیں۔ اپنے سے بہتر اور برتر لوگوں کی قدر اور ان سے والہانہ محبت کی جاتی ہے۔ ہم بھی یہی کرتے ہیں۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ آپ سے ہماری وفا کی داستانیں بھری پڑی ہیں۔ ہم نے آپ کی محبت میں بڑے بڑے معرکے انجام دیئے ہیں۔ آپ کی محبت کی خاطر تخت و تاج تک کو ٹھکرا دیا۔ ہم آپ کو چاہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بارہا ہم نے ثابت بھی کیا ہے۔ میری باتوں کو خاموشی سے سن کر بیگم نے دوسرا وار کیا۔ آپ مردوں کو فوقیت حاصل ہے۔ تعلیم کے مواقع آپ کو زیادہ ہیں۔ نوکریوں میں اہمیت آپ کی ہے۔ کھانا آپ کو زیادہ ملتا ہے۔ علاج معالجہ میں آپ کو ترجیح دی جاتی ہے۔

---

[1] ۔ دنیا بوڑھی ہو رہی ہے۔ اردو میگزین۔ ۱۱رجنوری ۲۰۰۲ء

۔۔یہ صدیوں پرانی قبل مسیح کی باتیں ہیں جو تب سے اب تک دہرائی جا رہی ہیں۔ چلئے آپ کا دل رکھنے کے لیے ان باتوں مان لیتے ہیں۔ ہاں ہمیں فوقیت حاصل ہے۔ پتھر پھوڑنے کے لیے۔ بوجھ اٹھانے کے لیے محنت اور محبت کے لیے آپ کی حفاظت کرنے کے لیے۔ آپ کا خیال رکھنے کے لیے۔ علم حاصل کرنے مواقع ہمیں زیادہ ہیں لیکن ہم کہاں علم حاصل کرتے ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کے پیچھے ہیں اور لڑکیاں علم کے پیچھے پڑھ کر ہم سے قابل بن رہی ہیں۔ ہماری نقالی کرتے ہوئے ہمیں چیلنج کر رہی ہیں لیکن میں آپ کو بتادوں کہ ہم نقالی میں آپ سے آگے ہیں معلوم نہیں یہ کیسی ہوا چلی ہے کہ کئی مرد عورت بننے کے خواہشمند نظر آتے ہیں اور کچھ تو باقاعدہ بن بھی جاتے ہیں۔ دنیا میں آپ کی بالادستی ہے۔ آپ نے اپنے لیے دنیا بنائی۔ یہ دنیا آپ کی ہے۔۔۔ یہ ہم پر بہتان ہے۔ دنیا آپ کے لئے ہے اعداد و شمار اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ دنیا میں ہم سے زیادہ آپ رہتی ہیں۔ عورتیں مردوں کے مقابلے میں اوسطاً چار برس زیادہ جیتی ہیں۔ چار برس کم نہیں ہوتے۔ ڈیڑھ ہزار دن ہوتے ہیں۔ آپ دنیا کو ہماری ہونے کا الزام رکھتی ہیں جب کہ دنیا میں ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ سب کو فکر آپ کی ہوتی ہے۔ ہر کوئی خواتین سے تعلق خاطر کا اظہار کرنا۔ جب کوئی پیدا ہوتا ہے تو پوچھتے ہیں۔ ماں کیسی ہے؟ جب یہی بچہ بڑا ہو کر شادی کرتا ہے تو دریافت کیا جاتا ہے، دلہن کیسی ہے، اور آخر جب وہ اپنی دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو سوال کیا جاتا ہے۔ مرحوم نے بیوی کے لیے کیا چھوڑا ہے''۔ [1]

قدرت نے عورت میں بے پناہ پیار محبت، جذبہ رقابت، قوت و برداشت اور ان گنت صلاحیتوں سے نوازا ہے لیکن عورتوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے کہ وہ باتونی ہوتی ہیں۔ ایک کی بات ختم ہونے نہیں پاتی کہ دوسری شروع کر دیتی ہیں بلکہ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ دونوں ایک ساتھ بولتی رہتی ہیں۔ چنانچہ

---

[1] ۔ مجھے نیویارک جانا ہے۔ اردو میگزین۔ 30/جون 2000ء

خواتین کی اس عادت کو اپنی بیگم کے حوالے سے اس طرح بیان کرتے ہیں:

''جب میں نے بیگم کو اپنے برابر بٹھا کر کار چلانی شروع کی تو مجھے بے انتہا مصائب اور آلام کا سامنا کرنا پڑا۔ اندازہ ہوا کہ بیگم کے مشورے پر کار خریدنے سے بڑی غلطی بیگم کو برابر بٹھا کر کار چلانا ہے۔ سجھائی نہیں دیتا کہ اپنی سمجھ کے مطابق کار چلاؤں یا بیگم کی ہدایت پر عمل کروں اس بات کا فیصلہ کرنا بھی میرے لیے مشکل ہوتا ہے کہ بیگم کی باتیں سنوں، انہیں جواب دوں یا ان سے بے تعلق رہوں۔ بعض مرتبہ بیگم سے نظریں ہٹا کر سڑک پر جمانا مشکل ہوتا ہے۔ قصہ مختصر بیگم کو برابر بٹھا کر کار چلانا جوئے شیر لانے سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ ایک تجربے کار فوجی ڈرائیور نے بتایا کہ تیس سال کی نوکری کے دوران اس نے سائکل اور کار سے لے کر ٹرک اور ٹینک تک ہر قسم کی گاڑی بغیر کوئی حادثہ کئے چلائی ہے۔ ایسا صرف اس لیے ممکن ہو سکا کہ نوکری پر اس کی بیوی اس کے ساتھ نہیں تھی''۔ [1]

ایک اور مضمون ''قصہٗ تیمارداری کا'' میں ڈاکٹر کے حوالے سے باتونی خواتین پر اس طرح طنز کے تیر چلائے ہیں، لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی بپتا شروع کرنے سے پہلے ہی بیوی ڈاکٹر سے کہنے لگیں۔ شام سے تیز بخار ہے۔ ماتھے کو چھوئیں تو ہاتھ جلتا ہے۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ سردی ہو رہی ہے۔ تین چار لحاف اُڑھا کر رکھنا پڑ رہا ہے۔ ہاتھ پیر بہت درد کر رہے ہیں۔ ناک سے پانی نل کی طرح بہہ رہا ہے۔ گلے میں خراش ہے۔ نگلنے میں تکلیف ہے۔ نیند کوسوں دور ہے۔ آنکھیں جلتی اور گدگداتی ہیں۔ کان بند لگتے ہیں۔ دوسروں کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ کھانسی شروع ہوئی ہے۔ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ خود سے اٹھا اور چلا نہیں جا رہا ہے۔ بھوک بالکل

---

[1] ۔ سگ گزیدہ ۔ شریک زندگی ۔ ص:23-22

نہیں ہے۔ کچھ کھا پی نہیں رہے ہیں۔ دودھ تک پینے سے انکار کر رہے ہیں۔
بچوں کا سا غصہ اور ضد کر رہے ہیں۔ آپ انہیں سمجھائیے اگر غذا استعمال نہ کریں
تو مزید کمزور ہو جائیں گے۔ بیوی سانس لینے لیے رکیں تو ڈاکٹر نے میری
جانب دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں۔ کیا تمہیں کچھ کہنا ہے''۔ [1]

بعض خواتین اتنی باتونی ہوتی ہیں کہ گھنٹوں بولتی رہتی ہیں سننے والے تھک جائیں اس کے علاوہ خواتین میں جذبہ رقابت، قوت برداشت ان گنت صلاحیتوں کی مالکہ ہوتی ہیں لیکن خواتین اپنی ان خوبیوں کو خامیاں سمجھتی ہیں چنانچہ عابد معز خواتین کی اس سوچ وفکر پر اس طرح روشنی ڈالی ہے فرماتے ہیں:

''گھونگھٹ الٹنے کے بعد مرد کم بولتا ہے اور عورت بہت باتونی ہو جاتی ہے ۔ اپنے ''صاحب'' کے بارے میں گھنٹوں بولتی ہے۔ ایسی باتیں کہتی ہے جس کا علم شوہر کو بھی نہیں ہوتا۔ اگر آپ کسی بات کو راز رکھنا چاہتے ہوں تو اس کی خبر کسی صورت بیگم کو نہ ہونے دیں۔ راز اور عورت کبھی ایک میان میں اس لیے نہیں رہ سکتے کہ عورت بذات خود ایک معمہ ہے۔۔۔ عورت میں جذبہ رقابت کا پایا جانا فطری تقاضہ ہے۔ جذبہ رقابت کا دوسرا نام عورت ہے۔ جذبہ رقابت عورت کی سب سے بڑی کمزوری اور شوہر بیوی کے خلاف واحد اخلاقی ہتھیار ہے۔ بیوی شوہر کی بڑی سے بڑی دھمکی سے متاثر نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف اگر آپ اپنی بیگم کو سوت لانے کی دھمکی دیں تو بیگم صاحبہ کا وجود لرز جائے گا۔ خود اعتمادی پارہ پارہ ہو جائے گی۔ روتے روتے آنکھیں موٹی اور لال ہو جائیں گی۔ ہمارے ایک دوست اس افواہ پر گھر میں شیر بنے دندناتے پھرتے ہیں کہ وہ دفتر میں عشق لڑا رہے ہیں اور کسی بھی وقت حسین فتنہ کو گھر لا سکتے ہیں۔ آپ اس اخلاقی ہتھیار کو وقتاً فوقتاً استعمال نہیں کر سکتے۔ بار بار استعمال سے یہ اپنی اہمیت کھو دے گا اور ہو سکتا ہے کہ بیوی سوت کا وجود گوارا کرنے کے لیے راضی ہو جائے۔ وہ کون

---

[1] ۔ سگ گزیدہ ۔ قصۂ تیمارداری کا ۔ ص:132-33

بے وقوف مرد ہوگا جو ایک اور ملک الموت کو سر پر مسلط کرنا پسند کرے۔ ویسے دو بیویاں رکھنے سے فائدہ یہ ہے کہ دونوں آپس میں لڑتی رہیں گی اور آپ انگریز کی طرح خاموش تماشائی بنے لطف ہی نہیں بلکہ فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں''۔ ۱

اکثر خواتین باتونی ہوتی ہیں لیکن شادی کے بعد اور زیادہ باتونی بن جاتی ہیں بلکہ اپنے شوہر کے حصہ کی باتیں بھی وہی کرتی ہیں۔ عابد معز کا کہنا ہے کہ شادی کے بعد مرد کم بولتا ہے۔ شادی کے بعد خواتین کی اس تبدیلی پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''بیوی شوہر کی بولتی بند کرتی ہے۔ خاموشی سکھاتی ہے۔ چُپ شاہ کا روزہ رکھاتی ہے۔ شوہر کو خاموش رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ جمائی لینے کے لئے بھی مشکل سے منہ کھلتا ہے۔ شوہر کو خاموشی سکھا کر خود بیوی اس کے حصہ کا بولنا بولتی ہے اور اس کی جانب سے بھی بولنے لگتی ہے۔ ایسی بیویاں بہت جلد مشہور ہوتی ہیں۔۔۔ مشہور ہے کہ بلی شیر کو جھاڑ چڑھنا سکھاتی ہے لیکن اترنا نہیں! اسی طرح بیوی شوہر کو کمانا سکھاتی ہے خرچ کرنا نہیں۔ خود بے دریغ خرچ کرتی ہے۔ شوہر کو کنگال کرنے کی حد تک۔ ایک بیوی نے اپنی سہیلی سے کہا۔ شادی سے پہلے میرے شوہر لکھ پتی تھے۔ اب پتی ہیں۔ صرف میرے پتی۔ بیوی ماں باپ اور بھائی بہنوں سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔ اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں سے! ہمارے ایک دوست سے ان کی بیوی کی لڑائی اکثر اس دعوے سے شروع ہوتی ہے۔ میں آپ کی ساس سے کتنی محبت کرتی ہوں اور ایک آپ ہیں جو اپنی ساس کو خاطر میں نہیں لاتے ایسا کیوں؟''۔ ۲

یہ بات سچ ہے کہ عورت غیر ذمہ دار مرد کو ذمہ داری کا احساس اور محنت و کفایت شعاری کا درس دے کر بھٹکے ہوئے شوہر کو صحیح راستے پر لاتی ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود خواتین میں کچھ خامیاں بھی ہوتی

۱۔ سگ گزیدہ۔ گھونگھٹ الٹنے سے پہلے۔ ص:16-15-114، جنوری 1995ء

۲۔ فارغ البال۔ آنچل کی تربیت۔ ص:116-115

ہیں جیسے فضول خرچی ،فضول باتیں کرنا،حسد،جلن طعنہ اوراپنے آپ کو دیگر خواتین سے کم عمر سمجھنا۔ چنانچہ خواتین کی اس خامی کو ہدف طنز بناتے ہوئے عابد معز فرماتے ہیں:

''زمانہ قدیم ہی سے عمر کا موضوع خواتین کے نزدیک ایک بڑا نازک مسئلہ رہا ہے۔اور پھر کوئی بیوی نہیں چاہتی کہ اس کی عمر شوہر سے زیادہ ہو۔ بیوی شوہر سے کم عمر ہی ہوتی ہے۔ چاہے حقیقت میں اس کی عمر زیادہ ہی کیوں نہ ہو......!''۔ [1]

خواتین کے نزدیک عمر کا موضوع بڑا نازک مسئلہ رہا ہے وہ ہمیشہ کم عمر کہلانا پسند کرتی ہیں۔خواہ اُن کے نزدیک کوئی پندرہ یا سولہ سال کی لڑکی کیوں نہ ہوں اس کے علاوہ خواتین کی عمر مردوں سے زیادہ ہوتی ہیں ۔اسی لیے عورت مرد سے زیادہ عمر پاتی ہے۔ چنانچہ عابد معز نے خواتین اور مرد کی عمر کا موازنہ کرتے ہوئے یوں روشنی ڈالی ہے:

''خواتین کی اوسط عمر بھی مردوں سے زیادہ ہے۔ظاہر بات ہے۔رفتار زیادہ ہوگی تو فاصلہ بھی زیادہ طے ہوگا۔عمر کے معاملے میں عورتوں کی فوقیت کے بارے میں میں نے بہت سوچا لیکن کچھ سجھائی نہ دیا۔ میں نے بیگم سے پوچھنا مناسب سمجھا'' آپ خواتین ہم سے زیادہ کیوں جیتی ہیں؟'' آپ کو جلانے کے لئے بیگم نے جواب دیا''۔ [2]

عورت اپنی حقیقی زندگی میں بے انتہا مصائب اور آلام برداشت کرسکتی ہے۔لیکن زیادہ عمر والی کہلانا ہرگز پسند نہیں کرتی۔اس کا اظہار ایک اینکر کے حوالے سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں سوچنے لگا کہ کسی خاتون کو زیادہ عمر والی کہنا یا سمجھنا کیا گل کھلاتا ہے۔وہ پرانی اور پختہ عادت تک چھوڑنے کے لیے تیار ہوجاتی ہے۔ جو لوگ یہ نکتہ جانتے ہیں وہ خواتین کی اس کمزوری کا خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ایک محفل میں

---

[1] ۔سگ گزیدہ۔نام میں کیا رکھا ہے۔ص: 59

[2] ۔اردو میگزین۔متوقع عمر اور عمر کا زیاں۔28/جون 2002ء

خواتین بہت زیادہ باتیں کررہی تھیں۔ان کے شوروغل میں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔انہیں خاموش کرنے کی تمام تدبیریں ناکام ہوچکی تھیں۔ایسے میں کمپیئر کوصنف نازک کی یہ کمزوری یادآئی۔اس نے کہا۔ براہ کرم۔صرف وہی خواتین باتیں جاری رکھ سکتی ہیں جن کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہے۔۔شکریہ۔اس اعلان کے ساتھ ہی محفل میں یکلخت خاموشی چھاگئی۔کوئی بھی خاتون منہ کھولنے کے لیے تیار نہ تھی‘‘۔[۱]

عورت کا شمار دنیا کی حسین ترین چیزوں میں ہوتا ہے۔اسی لیے اس کوحُسن کی دیوی کہا جاتا ہے۔ لیکن عورت ہی ایسی مخلوق ہے جو اپنے حسن سے کبھی مطمئن نہیں ہوتی، چنانچہ عابد معزطنز ومزاح کے پیرائے میں عورت کی اس کمزوری کواس طرح نمایاں کیا ہے:

’’عوت ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے حسن سے کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کوخوب تر اورحسین بنانے کے لیے اپنی عمراورشوہر کی دولت کا ایک قابل لحاظ حصہ صرف کردیتی ہے۔اس تعلق سے ہم کچھ نہیں کہیں گے۔بعض مرتبہ خاموشی بہتر ہوتی ہے۔عورت ہمیشہ خودکوصحیح سمجھتی ہےاوراپنی کمزوریوں کو قبول کرنا صنف نازک کےبس کی بات نہیں ہے‘‘۔ [۲]

ڈاکٹر عابدمعزکتابوں سے زیادہ انسانی فطرت کو پڑھتے ہیں وہ کسی واقعہ کے تاثر کومختصر یاچند جملوں میں بیان نہیں کرتے بلکہ قاری کواُس ماحول میں لے جاتے ہیں جس کے پس منظر میں واقعہ کے تمام نفسیاتی پہلوؤں کا مشاہدہ ہوجائے جیسے ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے:

’’کتے اورڈاکٹرصاحب کاظلم وستم برداشت کرکے رات دیرگئے گھر پہنچے۔ بیوی کو کتا کاٹنے کی روداد سنانے کے بجائے ہم نے حادثے کی ایک فرضی داستان گڑھ دی۔ یہ احتیاط اس لیے برتی کہ کتا کاٹنے کی پریشانیوں سے کم ازکم

۱۔ سگ گزیدہ۔نام میں کیارکھا ہے۔ص:62-61

۲۔سگ گزیدہ۔مضمون گھونگھٹ الٹنے سے پہلے۔ص:116۔اشاعت1995ء

بیوی محفوظ رہے۔لیکن ہمارے اس سفید جھوٹ کا اثر الٹا نکلا۔ بیوی نے زخم دیکھا اور منہ پھلائے پیر پٹکتے ہوئے بستر میں چھپ کر ہمیں برا بھلا کہنے لگیں۔اس عمر میں عشق لڑاتے ہوئے شرم نہیں آئی،سفید بالوں اور بچوں کا خیال کیا ہوتا۔کلموہی نے کس بے دردی سے کاٹا ہے۔چار و ناچار ہمیں حقیقت اگلنی پڑی لیکن بیوی نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ہم نے کہا۔ بھاگیہ وان !تم دوسری طرف کاٹ کر اپنے دانت کے نشان لگاؤ اور دونوں کا تقابل کرو۔ بیوی چراغ پا ہوگئیں۔ میں تمہاری بیوی ہوں۔کوئی معشوقہ نہیں کہ غیر فطری حرکتیں کروں۔ہم نے اپنا پیٹ دکھایا جہاں انجکشن کی جگہ مزید ایک چھوٹا پیٹ اُبھر آیا تھا۔اپنی اور بیوی کی قسم کا اعتبار تو تھا ہی نہیں۔بچوں کی قسمیں کھائیں،تب کہیں بیوی کو یقین آیا پھر سے زخم کو غور سے دیکھا اور سوال کیا ’’کتے نے آپ ہی کو کیوں کاٹا‘‘ دوسرے کتوں کی طرح اس کی دم بھی ٹیڑھی ہے۔کتا ہمارا ہم جنس نکلا ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کتا ہماری بیوی کا ہم جنس نہیں تھا ورنہ جذبہ رقابت میں ہمارا حشر برا ہوتا‘‘۔ ؎۱

شک ایک ایسی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔خوش حال ازدواجی زندگی میں شک پیدا کرتا ہے۔لیکن خواتین اپنے شوہروں پر شک کرنا اپنی خاص خوبی سمجھتی ہیں۔شک کی بنیاد پر وہ معمولی سی بات پر دوسری شادی کا طعنہ دیتی ہیں۔بعض باہمت شوہر بار بار دوسری شادی کا طعنہ سن کر شک کو حقیقت میں تبدیل کرنے کا عملی جامہ پہناتے ہیں،لہٰذا عابد معز خواتین کی اس نفسیاتی خامی کو اس طرح اُجاگر کیا ہے:

’’یہ بھی تقریباً ہر بیوی کی کمزوری ہے۔معمولی سی بات پر دوسری شادی تک جا پہنچتی ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔بات بات پر شوہر کی دوسری شادی کے بارے میں سوچنے لگتی ہے۔اگر بات صرف سوچنے کی حد تک رہتی تو ٹھیک تھی وہ اس موضوع پر شوہر سے بحث کرتی ہیں۔بعض مرتبہ بیوی کی کمزوری شوہر کو

؎۱۔سگ گزیدہ۔مضمون سگ گزیدہ۔ص:14-13 سنہ اشاعت 1995ء

دوسری شادی کی تحریک دلاتی ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے دوسری مرتبہ سہرا باندھنے کی وجہ پوچھی تو اُنہوں نے بتایا۔ مجھے پہلی بیوی سے ہر دم دوسری شادی کے طعنے سن کر خیال آیا یہ تجربہ بھی کرنا چاہئے۔ سو میں نے دوسری شادی رچالی اچھا تو یہ تجربہ کیسا رہا۔ میں نے دوسرا سوال کیا۔ پہلے جیسا کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ اب دونوں بیویاں تیسری شادی کا طعنہ دیتی ہیں۔ موصوف نے بتایا۔ میں نے ان سے یہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ اب آپ کا کیا خیال ہے۔ مجھے ان کی دو بیویوں سے ہمدردی تھی اور اب بھی ہے''۔ [۱]

خواتین میں ایک عیب یہ ہے کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو یا نہ ہو، پسند آنے کی دیر ہے ذرا پسند آئی اور لے لی، خواہ قرض ہو جائے لیکن کچھ پرواہ نہیں اگر قرض بھی نہ لیا تب بھی اپنے پیسے کو اس طرح بیکار خرچ کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔ بیوی اپنے شوہر کو گھر اور بچوں کا احساس دلاتے ہوئے کفایت شعار بناتی ہے لیکن خود نہیں۔ عابد معز نے اپنے مضمون ''میں صرف پتی ہوں'' میں خواتین کی اس عادت کو طنز و مزاح کے پردے میں یوں پیش کیا ہے:

'' چلیئے مان لیا آپ کے پاس اربوں ڈالر ہیں۔ آپ کیا کریں گی۔ میں نے بیگم کو اربوں ڈالر رقم دے دی۔ میں شاپنگ کروں گی۔ وہ تو اب بھی کرتی ہیں۔ شاپنگ کے علاوہ بتایئے۔ اب کیا خاک شاپنگ ہوتی ہے۔ کئی اشیاء کے دام پوچھ کر رہ جاتی ہوں۔ بیگم نے شکایت کرنے کے بعد کہا۔ میں وہ تمام چیزیں خریدوں گی جن کی اب تک صرف قیمت دریافت کر کے صبر کیا ہے۔ شاپنگ کے علاوہ بھی شاپنگ ہی کروں گی۔ میں ڈھیر سارے کپڑے خریدوں گی۔ زیور خریدوں گی۔ جوتے خریدوں گی۔۔۔''۔ [۲]

عابد معز اپنے مخصوص اسلوب کے ذریعہ فرد و افراد کی ذہنی اور نفسیاتی اُتار چڑھاؤ کو پیش کرنے میں

---

[۱] ۔ اردو میگزین۔ شوہر کا نام اور بیوی کی عمر۔ اشاعت 13 / اگست 2001ء

[۲] ۔ میں صرف پتی ہوں۔ 10 / اپریل۔ 2006ء

خوب مہارت رکھتے ہیں۔

الغرض مذکورہ موضوعات کے تجزیوں کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عابد معز کی شگفتہ تحریروں میں زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ معاشرے کے دکھ درد اور اخلاق کی پاسداری کا احساس نمایاں ہے۔ان کی بیشتر تحریروں میں وہ خود ایک کردار کی حیثیت سے شامل رہتے ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بناتے وقت شائستگی کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور موضوع پر اپنی بات کہنے کے تمام پہلوؤں سے اچھی طرح واقف ہیں۔اس لیے ہر خاص عام موضوعات پر اپنی باریک بینی سنجیدگی، روانی، خیالات کی صفائی، سلاست، علمیت کے ساتھ اپنے منفرد لب و لہجے میں موضوع کے مطابق تبصرہ کرتے جاتے ہیں۔

عابد معز کی شگفتہ تحریروں کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کے آرزومند ہیں۔ اس کا عکس ہمیں ان کی تحریروں میں ملتا ہے۔انہوں نے جن موضوعات کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے، وہ ہمارے سماج و معاشرے میں مستقل اور مرکزی حیثیت رکھتے ہیں جیسے مہنگائی، بڑھتی ہوئی آبادی، اخلاقی گراوٹ، نوجوان نسل کی بے راہ روی، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید اور جنگ ردہشت گردی وغیرہ جس سے معاشرہ ناہموار صورت حال کا شکار ہوتا جارہا ہے جن پر عابد معز نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔

غرض عابد معز کی مزاح نگاری اُن کی تحریروں، مشاہدوں، جذبات و احساسات کے اظہار کا نام ہے۔ وہ سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو نہایت کھلے سادہ اور آسان ڈھنگ سے کہہ دینے کے فن سے خوب واقفیت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

باب سوم

عابد معز بحیثیت انشائیہ نگار،
کالم نگار، افسانہ نگار

ڈاکٹر عابد معز بحیثیت انشائیہ نگار

انشائیہ عربی زبان کے لفظ ''انشاء'' سے ماخوذ ہے جو مضمون سے مشابہت رکھتا ہے۔ اصطلاح میں انشائیہ اس نثری صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی خیال یا بات کو خوش نما لفظی پیرائے میں بیان کیا جائے۔ یہ ادب کا جز ہی نہیں بلکہ کل بھی ہے۔ یہ شخصی جذبات اور احساسات اور ذاتی تجربات ومشاہدات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مختلف لغات میں انشائیہ کی مختلف تعریفیں ملتی ہیں فرہنگ عامرہ میں اس کے معنی یوں درج ہیں:

''عبارت لکھنا، بات پیدا کرنا''۔ ۱

فرہنگ آصفیہ میں لفظ انشائیہ کے معنی اس طرح ملتے ہیں:

''۱)۔ لغوی معنی کچھ بات دل سے پیدا کرنا''۔

۲)۔ عبارت، تحریر، علم، معانی، بیان، صنایع وبدائع، خوبی طرز تحریر۔

۳)۔ وہ کتاب جس میں خط وکتابت لکھانے کے واسطے ہر قسم کے خطوط جمع ہوں۔ لیٹر بک، چھٹیوں کی کتاب''۔ ۲

نور اللغات میں انشائیہ کے معنی یوں لکھے گئے ہیں:

''دو جملہ میں جھوٹ اور سچ دونوں باتیں کہی جاسکتی ہوں''۔ ۳

انشائیہ میں آپ بیتی اور جگ بیتی کی دھوپ چھاؤں ہوتی ہے۔ ایک مرکزی خیال سے کچھ ضمنی خیالات پھوٹ کر انشائیے کے تانے بانے بنتے ہیں۔ غیر رسمی طریقہ کار اور شخصی ردعمل لازمی ہے، مسرت بہم پہنچانا اس کا بنیادی کام ہے تو عدم تکمیل اس کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ مضمون یا مقالہ کے مقابلے میں اس کا

۱۔ فرہنگ عامرہ۔ محمد عبداللہ خان۔ ص:67

۲۔ فرہنگ آصفیہ، ص:259۔ ۳۔ فرہنگ نور اللغات، ص:50

ڈھانچہ کہیں زیادہ لچکدار ہوتا ہے۔اس میں مرکزی خیال کے باوصف دلائل کا کوئی مضبوط سلسلہ قائم نہیں کیا جاتا۔ یہ دعوت فکر دیتا ہے، اختصار بھی اس کا ایک بنیادی وصف ہے۔انشائیہ نگار کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی مشورہ دیتا ہے بلکہ وہ مخصوص انداز سے کسی موضوع پر سوچنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اردو کی اصناف نثر میں انشائیہ مضمون کے زیادہ قریب ہے۔ یہ قربت الگ الگ شناخت کو اور مشکل بنا دیتی ہے۔لیکن ان دونوں کی تعریفوں کو مدنظر رکھ کر اگر ہم غور کریں تو یہ الجھن دور ہو سکتی ہے۔مضمون کی فضاء رسمی ہوتی ہے، جہاں ہر بات اور ہر پیرگراف مرکزی خیال کی منطقی وضاحت کرتا ہے جب کہ انشائیہ غیر رسمی ماحول میں لکھا جاتا ہے۔اس میں محض تاثرات ہوتے ہیں جو ذہنی ترنگ کے تابع ہوتے ہیں۔مضمون میں موضوع پر سنجیدگی سے بحث ہوتی ہے اس میں صراحت اور وضاحت کی بنیاد دلائل پر دی جاتی ہے جب کہ انشائیہ میں داخلیت کی کارفرمائی ملتی ہے۔ ایجاز واختصار اور رمزو اشاریت اس کا حسن اور حقائق کا اظہار موضوع کی طرف شخصی ردعمل اور عدم تکمیل اس کے فنی اجزاء ہیں۔دوسری جانب مضمون یا مقالے میں بات یا خیال کو عالمانہ انداز سے کہنے اور معلومات فراہم کرنے پر خاصا زور دیا جاتا ہے۔اور زیادہ تر علم وحکمت کی باتیں ہوتی ہیں لیکن انشائیہ میں خاص زور انداز بیان پر ہوتا ہے اور واقعات سے زیادہ واقعات کے ردعمل سے سروکار رہوتا ہے۔مضمون کے موضوعات محدود ہوتے ہیں جب کہ انشائیہ میں کسی بھی موضوع پر قلم اٹھایا جا سکتا ہے،خود انشائیہ نگار اپنی تحریر میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے۔اس کی تحریر میں داخلی کیفیات کا بیان ہوتا ہے اس کے برعکس مضمون میں خارجی باتوں کا ذکر ہوتا ہے۔

بہت سے ناقدین اسے صنف نہیں مانتے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے فنی خدوخال کا تعین مکمل طور پر ابھی تک نہیں ہو پایا ہے لیکن بعض ناقدین نے اس کی خصوصیات کو اکٹھا کر کے اس کے حدود متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔مگر موضوع کے لحاظ سے کوئی قید نہیں ہے کیونکہ وہ مواد اور عنوان کے انتخاب میں آزاد ہوتا ہے اہم یا غیر اہم حقیقت کو بھی موضوع بنا سکتا ہے۔اس لیے اس کی قطعی تعریف ممکن نہیں ہو سکتی۔

لیکن اس کا بنیادی وصف یہی ہے کہ کوئی نیا خیال جو نئے تجربے نئے مشاہدے نئے جذباتی کیفیت سے ہو کر سامنے آتا ہے وہ ہی انشائیہ کہلاتا ہے۔

اس کی کامیابی کا دارمدار نئے مشاہدے تجربے اور خیال کو موثر انداز میں دلکشی اور شگفتہ بیانی کے ساتھ پیش کرنے میں ہے۔

انشائیہ کے لیے مختلف ناقدین نے مختلف خصوصیات کو ناگزیر بتایا ہے جو حسب ذیل ہیں:

شگفتہ بیانی ۔ بے ربطی۔ اختصار و جامعیت ۔ بے تکلف انداز بیان۔ ذہنی آزادی۔ غور فکر کی دعوت ۔شخصیت کا اظہار۔خوشگوار موڈ۔ حقیقت بیانی۔جدّت پسندی۔مبالغہ آرائی۔ ماحول کا اثر وغیرہ۔

ڈاکٹر عابد معز کے انشائیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں انشائیہ کی تقریباً تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ان کے انشائیوں کی خاص خصوصیت یہی ہے کہ وہ ہلکے پھلکے طنز ومزاح کے ساتھ شگفتہ پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔

دعوت غور وفکر

دعوت غور وفکر انشائیہ کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ جہاں انشائیہ نگار اپنے تجربات ومشاہدات و خیالات کو تخلیقی رنگ دے کر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے وہ نہ ہی کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے اور نہ ہی مشورہ دیتا ہے بلکہ اس کا کام محض اتنا ہوتا ہے کہ وہ کسی موضوع کے کسی انوکھے اور تازہ پہلو کی طرف قاری کو متوجہ کرتے ہوئے ایک مخصوص انداز سے سوچنے کی ترغیب دیتا ہے یہی دعوت غور وفکر ہے۔

ڈاکٹر عابد معز کے انشائیوں میں بھی یہ خوبی جا بجا ملتی ہے۔ وہ اپنے قاری کو صرف مسرت ہی نہیں پہنچاتے بلکہ دعوت غور وفکر بھی دیتے ہیں۔ جس میں زندگی مشکلات و پریشانیوں اور اس کا حل تلاش کرنے کے لیے اکساتے ہیں یہ خصوصیات ان کے بیشتر انشائیوں میں نظر آتی ہیں۔ان کی نظر زندگی کے ہر زاویے پر ہوتی ہے۔ وہ ہمیں غور وفکر کی ترغیب دیتے ہیں۔ جب قاری ان کے انشائیہ کا بغور مطالعہ کرتا ہے تو وہ اپنے

آپ سوال کرنے لگتا ہے کہ ہم نے پہلے اس طرح کیوں نہیں سوچا ہمارا ذہن اس پہلو کی طرف کیوں نہیں گیا۔ غرض وہ اپنے انشائیوں کے ذریعہ زندگی کے اصلی معنی بتاتے اور اس کی حقیقتوں سے رو بہ رو کراتے ہیں۔ خاندان کا ہر فرد اپنی ماں بہن بیوی بیٹی سے ہمدردی کرتا ہے اور پیار و محبت نچھاور کرتا ہے لیکن لڑکی کی پیدائش کے وقت وہ خوشی کا اظہار نہیں کرتے یہاں تک کہ عورت تک نہیں چاہتی کہ اس کے بطن سے اس کی ہم جنس پیدا ہو۔ اس تعلق سے ڈاکٹر عابد معز اس طرح غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں:

> ''ایسے حالات ہیں کہ کوئی بھی تصویر کائنات میں اپنی طرف سے رنگ بھرنا نہیں چاہتا مرد تو خیر مرد ہے وہ اپنے جیسی ہی اولاد چاہے گا۔ عورت تک نہی چاہتی کہ اس کے بطن سے اس کی ہم جنس پیدا ہو! سائنس کی مدد سے جنس معلوم کر کے لڑکی کی پیدائش سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اتنا عام ہو چلا تھا کہ حکومت کو پیدائش سے قبل جنس معلوم کرنے پر پابندی لگانی پڑی''۔[1]

ڈاکٹر عابد معز کے پاس سیاسی و سماجی شعور بہت گہرا ملتا ہے وہ اپنے انشائیوں کے ذریعہ دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے مسائل کی جانب متوجہ کراتے ہوئے غور فکر کی دعوت دیتے ہیں، بلا شبہ آج کرہ ارض پر بعض مقامات ایسے ہیں جہاں برسوں سے لڑائی جاری ہے کوئی آزاد ہونا چاہتا ہے تو کوئی انہیں محکوم بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ عصر حاضر کا انسان ترقی کے ساتھ اپنی وقعت کھونے لگا ہے جس سے جرائم میں آئے دن مزید اضافہ ہوتا جارہا ہے:

> ''کرۂ ارض پر بعض مقامات ایسے ہیں جہاں برسوں سے لڑائی جاری ہے۔ کوئی آزاد ہونا چاہتا ہے تو کوئی انہیں محکوم بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ مرنے اور مارنے والے کو کوئی مجاہد مانتا ہے تو کوئی دہشت گرد قرار دیتا ہے۔ بارود کے ڈھیر پر انسان پیدا ہوتے ہیں۔ بندوق سے کھیلتے ہوئے پلتے ہیں۔ مسیں بھی نہیں بھیگیں کہ مزائل اٹھائے لڑنے چلے۔ پیٹ بھرنے کے لیے روٹی نہیں ملتی تن

---

[1] مضمون۔ ''تصویر کائنات میں رنگ''۔ فارغ البال۔ ص:20

ڈھانکنے کے لیے کپڑے نہیں ہوتے اور پیروں میں پہننے کے لیے جوتے
دستیاب نہیں ہیں لیکن مرنے اور مارنے کے لیے بندوق گرینیڈ، بم اور نہ جانے
کیا کچھ حاصل ہے''۔ [1]

خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد فرانس، انگلینڈ اور صیہونی منصوبوں نے عالم عرب کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر کے انھیں منتشر کر دیا ہے۔ عربوں میں نسلی، تہذیبی، ثقافتی اور طرح طرح کی گروہ بندیوں کا بیج بو کر انھیں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار کر دیا ہے۔ یہیں سے فلسطینیوں کی آزمائش کا دور شروع ہوا جو آج تک تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ ان سامراجیوں کے منصوبوں کی وجہ سے عالم عرب میں کبھی نہ ختم ہونے والا موت کا ننگا ناچ جاری ہے۔ خلیج کی صورت حال پر لکھتے ہیں۔

خلیج میں کبھی نہ ختم ہونے والا موت کا ننگا ناچ جاری ہے۔ ظلم اور بربیت سے
زندگی فرار کے راستے ڈھونڈتی ہے لیکن تمام راستے مسدود ہیں۔ بندوق کی
متعدد گولیوں کے علاوہ ہر زندگی میں پچاس ساٹھ کلو بارود ملی ہے۔ زندگی
سر پر پیر رکھ کر بھاگ رہی ہے لیکن بے وقت موت سے بچنا ممکن نہیں دکھائی
دیتا۔ فلسطینیوں میں موت کا مقابلہ نہتے ہاتھ پتھر اٹھاء کر کرتے ہیں۔ لبنان
میں موت نے زندگی کے حصے بقرے کر دیئے۔ ایک مقام سے دوسرے مقام کو
پہنچے نہیں کہ موت نے آدبوچا۔ [2]

اسی طرح ایک اور مضمون میں دنیا کی صورت حال پر اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرتے ہوئے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں:

''لیکن آج کون جی رہا ہے اور کسے سکون سے زندہ رہنے دیا جا رہا ہے۔ بے
وقت اور بے سبب موت زندگی کے تعاقب میں لگی ہوئی ہے۔ وقت سے پہلے زندگی
ختم ہوتی ہے۔ پر لطف طویل زندگی سمٹ کر بندوق کی گولی یا بم کا بارود بن گئی ہے۔
کرۂ ارض پر جدھر دیکھئے اُدھر زندگی موت سے پناہ مانگتی نظر آتی ہے''۔ [3]

---

[1] اتفاق ہے کہ زمانہ ہیں ہم۔ فارغ البال۔ ص:146-145 [2] مجھے زندہ رہنے دو۔ فارغ البال، ص41
[3]۔ مجھے زندہ رہنے دو۔ فارغ البال ص:40

حقیقت پسندی

انشائیہ میں حقیقت پسندی ایک اہم خصوصیت ہے اس میں انشائیہ نگار اپنے پیش کش میں اطراف پیش آئے زندگی کے حقیقی واقعات قلم بند کرتا ہے۔ڈاکٹر عابد معز کے انشائیوں کا جب ہم بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے ہاں حقیقت پسندی بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ پیسہ کی قدر و قیمت ہر زمانے میں رہی ہے اسی کی بدولت دولت مند لوگوں کی عزت کی جاتی ہے۔ بلکہ مال و زر کی وجہ سے سبھی دولت مند کے قریب آنے لگتے ہیں خواہ رشتہ دار ہو، کہ دوست احباب یا بیمہ ایجنٹ، اس حقیقت کو ڈاکٹر عابد معز اس طرح عیاں کرتے ہیں:

''چند سال پہلے کی بات ہے۔پہلی مرتبہ بیمہ ایجنٹ ہمارے گھر آئے تھے۔ ہم خوش ہوئے کہ ہمارا شمار اب دولت مند لوگوں میں ہونے لگا ہے۔انسان کے پاس روپیوں پیسوں کی ریل پیل ہوتے ہی رشتہ دار قریب آنے لگتے ہیں۔ دوست احباب کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے چور انہیں لوٹنے کا پلان بنانے لگتے ہیں اور بیمہ ایجنٹ ورغلانے چلے آتے ہیں کہ مختلف پالیساں خرید کر اپنا مستقبل محفوظ کرلیں۔

پیسہ نہ ہو تو کوئی قریب نہیں بھٹکتا، ہمدردی کے دو بول بھی گراں بار ہوتے ہیں دنیا کا دستور یہی ہے''۔ [1]

عصر حاضر میں لوگ اپنی مادری زبان سے دور ہوتے جارہے ہیں اس حقیقت بیانی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اب آپ سے کیا چھپائیں۔ہم اُردو لکھنے پڑھنے اور اس کے حقوق کے

---

[1] مضمون۔''بیمہ ایجنٹ سے بچنا محال ہے''۔فارغ البال۔ص:52

لیے جدوجہد کرتے ہیں ہمارے بچے بھی انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم پاتے ہیں ۔ہم نے بہت کوشش کی کہ کم ازکم ہمارا لڑکا مادری زبان میں تعلیم حاصل کرلے۔ لیکن ہماری بیوی بضد رہیں۔ میں بچے کی زندگی خراب نہیں ہونے دوں گی۔ وہ پڑھے گا تو انگلش میڈیم اسکول میں ورنہ ان پڑھ جاہل اور گنوار ہی سہی! ہم اپنا سا منہ لے کر چپ ہو رہے''۔[1]

ازل سے آج تک سچ اور جھوٹ کے درمیان معرکہ آرائی ہوتی رہی ہے۔ ہر مذہب و معاشرہ اور سماج میں سچ کہنے کے تلقین کی جاتی ہے اس کے باوجود جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے۔معاشرے کی اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے عابد معز لکھتے ہیں:

''بعض سوالات میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ ایک سوال سے کئی سوال جنم لیتے ہیں۔اس قسم کے سوالوں کو' ام السوال'' کہا جاسکتا ہے۔ایسے سوالات عموماً پولس تفتیش کے دوران کرتی ہے یا وکلا جرح کرتے وقت گواہ کو پریشان کرنے کے لیے ان سوالوں کا مقصد حقیقت اگلوانا نہیں ہوتا بلکہ اپنے مطلب کا بیان حاصل کرنا ہوتا ہے۔ایسے سوالوں کے جوابات دینے سے پہلے سچ بولنے کی قسم بھی دلائی جاتی ہے یا جھوٹ بولنے کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان سوالوں کے جوابوں میں لوگ سچ کے علاوہ سب کچھ بولتے ہیں''۔ [2]

ایک مرد کے لیے کائنات کی بے شمار نعمتوں میں سب سے اہم نعمت عورت ہے اور عورت کے لیے مرد۔ خدا تعالیٰ نے بناؤ سنگار عورت کی فطرت میں رکھا ہے۔ وہ اپنے لاکھ بناؤ سنگھار کے باوجود کبھی مطمئن نہیں رہتی لہٰذا اس ضمن میں ڈاکٹر عابد معز خواتین کی اس فطری حقیقت کی عکاسی یوں کی ہے:

''عورت خدا کی ایک ایسی مخلوق ہے جو اس کے دئے ہوئے حسن سے کبھی

---

[1] ''انگلش میڈیم اسکول''۔فارغ البال،ص:82 [2] ''سوال نامہ''۔فارغ البال۔ص:73

مطمئن نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کوخوب تر اور حسین تر بنانے کے لیے اپنی عمر اور
شوہر کی دولت کا ایک قابل لحاظ حصہ صرف کر دیتی ہے۔ اس تعلق سے ہم کچھ نہیں
کہیں گے۔ بعض مرتبہ خاموشی بہتر ہوتی ہے۔ اس خیال سے شاید شوہر کو تسلی ہو
کہ جس طرح چاند مانگی ہوئی روشنی لے کر چمکتا ہے اسی طرح بیوی کا میک اپ
سہاگ کی نشانی ہے!''۔ [1]

بے تکلف گفتگو

انشائیہ کی ایک خصوصیت بے تکلف گفتگو بھی ہے۔ یہی وہ اہم خصوصیت ہے جو انشائیہ کو ادب کی دوسرے اصناف ناول افسانہ وغیرہ سے الگ کرتی ہے۔ یہاں انشائیہ نگار قاری پر اپنی رائے کو مسلط ہونے نہیں دیتا۔ بلکہ ہلکے پھلکے انداز میں اپنی بات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری لطف اندوز ہوتے ہوئے انشائیہ نگار کے تجربات ومشاہدات میں شریک ہو جاتا ہے اور اعتماد بھی حاصل کر لیتا ہے۔ ایسی بے تکلفی انشائیہ کا امتیازی وصف ہے۔ یہی انداز و بیان ہمیں ڈاکٹر عابد معز کے انشائیوں میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں بے تکلف انداز سے اپنے مشاہدات وتجربات کو بیان کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بے تکلف اندازِ بیانی میں ایک ماہر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا یہی انداز بیان ان کے تقریباً تمام انشائیوں میں نظر آتا ہے۔ درج ذیل میں ہم چند مثالیں پیش کر رہے ہیں، جس سے ان کے بے تکلف انداز بیان کا اندازہ آپ کو بخوبی ہو جائے گا:

''کسی مظلوم شوہر کا کہنا ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا غم شادی اور سب سے
بڑی پریشانی بیوی ہے۔ اگر بس میں ہوتا تو ہم خود بھی شادی نہ کرتے اور دنیا کے
تمام مردوں کو شادی نہ کرنے کا مشورہ دیتے لیکن یہ صلاح دینا ایسا ہی ہے جیسا
کہ سقراط کا زہر پینا۔ سقراط ہی نے کہا تھا کہ ہر مرد کو شادی ضرور کرنی چاہیے۔

---

[1] ''گھونگھٹ الٹنے سے پہلے''۔ فارغ البال، ص:175

اچھی بیوی ملی تو زندگی ہنسی خوشی گزرتی ہے اور خراب بیوی شوہر کو فلسفی بنادیتی ہے
۔ یوں بھی مرد کو ''خوشہ گندم'' کا مزہ چکھنا چاہیے۔ ہم یہ مشورہ دینے کی غلطی کبھی
نہیں کریں گے کہ آپ شادی ہرگز نہ کریں، شادی ضرور کریں اور دھوم دھام سے
کریں لیکن شادی کرنے میں جلد بازی نہ کریں۔ ہر مرتبہ کچھ دن کے لیے ہی سہی
شادی کی گھڑی کو ٹال کر اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں''۔ [۱]

ڈاکٹر عابد معز کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے قاری کو بے تکلف انداز میں کچھ مشورے بھی دیتے ہیں۔، یہاں ان کی بے تکلفی کا اندازہ بہ خوبی ہوجاتا ہے:

''عورت میں جذبہ رقابت کا پایا جاتا فطری تقاضہ ہے۔ جذبہ رقابت کا دوسرا
نام عورت ہے۔ جذبہ رقابت عورت کی سب سے بڑی کمزوری اور شوہر کا بیوی
کے خلاف واحد اخلاقی ہتھیار ہے۔ بیوی شوہر کی بڑی سے بڑی دھمکی سے متاثر
نہیں ہوتی۔اس کے برخلاف اگر آپ اپنی بیگم کو سوت لانے کی دھمکی دیں تو بیگم
صاحبہ کا وجود لرز جائے گا۔ خود اعتمادی پارہ پارہ ہوجائے گی۔ روتے روتے
آنکھیں موٹی اور لال ہوجائیں گی ۔ ہمارے ایک دوست اس افواہ پر گھر میں
شیر بنے دندناتے پھرتے ہیں کہ وہ دفتر میں عشق لڑا رہے ہیں اور کسی بھی وقت''
حسین فتنہ'' کو گھر لا سکتے ہیں۔

آپ اس اخلاقی ہتھیار کو وقتاً فوقتاً استعمال نہیں کرسکتے ہیں۔ بار بار استعمال
سے یہ اپنی اہمیت کھودے گی۔ اور ہوسکتا ہے کہ بیوی سوت کا وجود گوارا کرنے
کے لیے راضی ہوجائے''۔ [۲]

ڈاکٹر عابد معز کا مشاہدہ بہت وسیع ہے وہ ہمیں زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کراتے ہوئے اپنے بے تکلفی اور اپنے پن سے قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے یہی وہ خصوصیات ہیں جس کی وجہ سے وہ دوسرے

۱۔ ''گھونگھٹ الٹنے سے پہلے''۔ فارغ البال، ص:170

۲۔''گھونگھٹ اُلٹنے سے پہلے''۔ فارغ البال، ص:175-174

انشائیہ نگاروں سے مختلف نظر آتے ہیں وہ اپنے قاری سے بہت جلد گھل مل جاتے ہیں۔ وہ اپنے بے تکلف انداز سے درزی کی کچھ بنیادی اور مخصوص خصوصیات یوں بیان کرتے ہیں:

گاہک کا لایا ہوا کپڑا ہمیشہ درزی کے حساب سے کم ہوتا ہے ہر مرتبہ کپڑا زیادہ منگوایا جاتا ہے............! پرانے درزی اپنی غلطیوں پر نادم رہتے تھے اور اپنا یا اپنی دکان کا لیبل کپڑوں کے اندر کسی کونے میں لگاتے تھے لیکن آج درزی اپنے نام اور فن کا لیبل کپڑوں کے اوپر چسپاں کرتے ہیں۔ گاہک ان کی تشہیر کا ذریعہ بنتے جیسے وہ ان کا پراڈکٹ ہے۔

ایک مرتبہ کپڑا سل کر درزی کی دکان سے باہر آنے کے بعد کسی صورت واپس درزی کے پاس نہیں جاسکتا۔ درزیوں کو نئے کپڑوں سے فرصت نہیں ملتی کہ وہ پرانے کپڑوں کو ٹھیک کریں، حالانکہ ان کپڑوں کو خود اسی درزی نے خراب بنایا تھا۔ درزی وہ شیر ہوتا ہے جو دوسروں کے شکار یا اپنے ہی شکار پر دوسری بار منہ نہیں مارتا۔ پرانے کپڑوں کی مرمت کے لیے گھر والی یا پھر دھوبی کی خدمات حاصل کرنی پڑتی ہیں'' [1]

شگفتہ بیانی

شگفتہ بیانی انشائیہ کا امتیازی وصف تصور کیا جاتا ہے۔ شگفتہ بیانی سے مراد موضوع اور نقطہ نظر کا انوکھا پن ہے جو ہمیں زندگی کی یکسانیت سے اوپر اٹھا کر ماحول کا دوبارہ جائزہ لینے کی طرف مائل کرتا ہے۔ عابد معز کے انشائیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ خوبی بارہا ملتی ہے۔

دور حاضر میں کرکٹ تمام کھیلوں پر سبقت لے چکا ہے کرکٹ کے کھلاڑیوں سے زیادہ شائقین کرکٹ سے والہانہ محبت کرنے لگے ہیں۔ بعض شائقین اس کھیل سے اتنی والہانہ محبت کر گئے کہ اب وہ اس کے شائقین نہیں بلکہ دیوانے عاشق ہوگئے ہیں۔ ایسے لوگ گفتگو بھی کرکٹی زبان میں کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک

---

[1] ''ہم آپ کو معزز بناتے ہیں'' فارغ البال، ص: 111-110-108

کرکٹ زدہ شخص ڈاکٹر سے اپنے مرض کی شکایت کرکٹی انداز میں کرتا ہے۔ڈاکٹر بھی اسی لب ولہجہ میں جواب دیتاہے۔عابدمعزکرکٹ زدہ افراد کے حوالے سے اس طرح شگفتہ بیانی سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کرکٹ زدہ لوگ گفتگو بھی کرکٹی زبان میں کرتے ہیں، جیسے دیکھئے کرکٹ کی چند اصطلاحیں استعمال کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ایک مریض نے ڈاکٹر سے کہا۔ڈاکٹر صاحب کیا بتاؤں،سرمیں درد ہے۔محسوس ہوتا ہے کہ سر کے اندرکوئی بیٹنگ کررہا ہے۔اسکوئر ڈرائیواور ہک کرکے پریشان کررہا ہے۔ڈاکٹر نے بھی اسی رنگ میں جواب دیا۔''کوئی بات نہیں میں تین گولیاں پھینک کردردکوآ ؤٹ کردوں گا''۔[1]

ہمارے معاشرے میں ایک اہم خرابی جوپھیلتی جارہی ہے وہ لڑکیوں پرلڑکوں کوفوقیت دیے جانے کی ہے۔پہلی پسند بھی لڑکا ہوتا ہےاور دوسری پسند بھی لڑکا ہوتا ہے اگرکسی کے ہاں دولڑکے پیدا ہوجائیں تو فوراً فیملی پلاننگ کا زریں مشورہ دیاجاتاہے۔ڈاکٹر عابدمعز کے مطابق آج فیملی پلاننگ کا مطلب ایک یا دو لڑکے بس ہے۔اسی موضوع پروہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ہم بعض ایسے خاندانوں سے واقف ہیں جہاں لڑکے کی آس پر کائنات میں رنگ بھرنے کے لیےلڑکیوں کی رنگارنگ فوج تیار ہوتی ہے۔جب لڑکا تولد ہواتو گویا دونوں جہاں کی نعمت اور دولت مل گئی۔خاندان کا نام روشن کرنے اور ''ونش'' بڑھانے والا آ گیا۔بوڑھاپے کا سہارا اور ٹھکانہ مل گیا اور فوری فیملی پلاننگ پرعمل شروع ہوگیا۔فیملی پلاننگ کا مطلب بھی یہی ہے کہ ایک یا دولڑکے بس!اگلا بچہ ابھی نہیں لڑکے بعد کبھی نہیں''۔[2]

شادی انسان کی سب سے بڑی تمنا ہوتی ہے خواہ مرد ہوکہ عورت۔ڈاکٹر عابدمعز کا ماننا ہے کہ شادی سے پہلے عورت صرف ایک شوہر کی تمنا رکھتی ہے۔لیکن شادی کے بعد اس کے دل میں ڈھیر ساری خواہشات

---

[1] ''یارے کرکٹ کا کچھ بیان ہوجائے''فارغ البال۔ص:90-89۔

[2] ''تصویرکائنات میں رنگ''فارغ البال۔ص:15۔

پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ عورتوں کی اس فطری خواہش کو انہوں نے شگفتہ انداز سے یوں بیان کیا ہے:

''صنف نازک شادی سے پہلے صرف اور صرف ایک عدد شوہر کی تمنا کرتی ہے۔شوہر مل جانے کے بعد بیوی کے دل میں کئی ارمان کروٹیں لینے لگتے ہیں۔ گھر چاہیئے۔گھر بھرنے کے لیے مختلف سامان درکار ہے۔کار کی ضرورت ہے۔ زیور خوب صورتی میں اضافہ کا باعث ہیں۔کپڑے قدر و منزلت بڑھاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ مختلف خواہشات پورا کرنے کی کوشش میں بیوی شاہ خرچ بن جاتی ہے اور شوہر کنگال۔شوہر کو چاہیے کہ اپنی آمدنی کم بتائے جس طرح سے بیوی اپنی عمر بتاتی ہے اور سیاست دانوں کی طرح بیوی سے مختلف وعدے کرلے اور پھر ٹالتا جائے!''۔ [1]

ہمارے سماج میں حجام ایک ایسا بنیادی فرد ہوتا ہے جس کی ضرورت ہر باشعور فرد کو ہوتی ہے لیکن با شعور افراد میں فارغ البال ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو حجام سے دور رہنا چاہتا ہے۔ڈاکٹر عابد معز حجام اور فارغ البال کے درمیان ہونے والی نوک جھونک کو شگفتہ پیرائے میں لکھتے ہیں:

''حجام تجربہ کے لیے فارغ البال سروں کی تلاش میں رہتا ہے جب کہ فارغ البال اشخاص حجام کے پاس کیوں جائیں؟ دو چار بال خود ہی کیوں نہ کاٹ لیں! حجام کے پاس جانے سے خدشہ لگا رہتا ہے کہ اس کی قچ قچ کرتی تیز قینچی بالوں کی تلاش میں کہیں کان اور ناک نہ کاٹ لے۔یوں بھی حجام فارغ البال شخص کے سر پر بال ڈھونڈنے اور ان کے جمانے کا انداز دریافت کرکے بال کاٹنے کی اجرت زیادہ لیتے ہیں''۔ [2]

---

[1] ''گھونگھٹ الٹنے سے پہلے'' فارغ البال۔ص:171۔

[2] ۔مضمون ''فارغ البال'' فارغ البال۔ص:10۔

اختصار و جامعیت

انشائیہ کا ایک بنیادی وصف اس کا اختصار و جامعیت ہے۔اس میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ مفاہیم ادا کرنا ہوتا ہے، اس لیے انشائیہ نگار کوالفاظ کے انتخاب کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ انشائیہ میں اختصار کی خاص اہمیت سمجھی جاتی ہے کیونکہ انشائیے کا حسن اس کے اختصار میں پوشیدہ ہے۔اختصار و جامعیت والی تحریروں میں تشریح وضاحت اور تفصیل نہیں دی جاتی صرف چند مسائل کی طرف ذہن کو خوبصورت انداز میں منتقل کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔عابد معز کے انشائیوں میں اختصار اور جامعیت کی خوبی بھی نظر آتی ہے۔

بے شک محبت زندگی ہے اور زندگی محبت ۔اگر محبت نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا، اس کے دم سے دنیا کی رونق ہے۔ ہر کوئی محبت میں گرفتار ہے بلکہ اس جذبے سے سرشار ہے۔اس کے ہزار ہا روپ ہیں اور ہر روپ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ان میں مخالف جنس سے محبت تمام سے الگ تھلگ ہے۔ جب جب مخالف جنس کی محبت عام ہوئی اہل زمانے نے اس کی مخالفت کی۔تب نئے نئے عشاق ابھرنے لگے جن کی ایک الگ تاریخ ہے۔آج عصر حاضر نے مخالف جنس کی محبت کے معنی ومفہوم کو یکسر بدل دیا ہے۔اب اس کی اہمیت اب وہ نہیں رہی جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ عابد معز اس جانب اشارہ کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> ''محبت کے تمام مشہور قصے ماضی سے تعلق رکھتے ہیں ۔حالیہ دور کا کوئی ایسا واقعہ مشہور نہیں ہوا۔معلوم نہیں کیوں؟ ہوسکتا ہے کہ زمانے نے محبت کی مخالفت کرنا بند کر دی ہے''۔[1]

عصر حاضر کے حالات اتنے مشکل، خراب اور ناگفتہ بہ ہوتے جارہے ہیں کہ بیان کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ایسے مشکل دور میں بغیر بیمہ کے گزارنا مزید پریشانی کا سامنا کرنا ہے۔ان پریشانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لوگ قیمتی اشیاء کا بیمہ کرواتے ہیں۔لیکن اپنی تہذیب اور ثقافت جو آج ہمارے ہی آنکھوں کے

---

[1] ''سوزمحبت''۔فارغ البال۔ص:67۔

سامنے دم توڑ رہی ہے۔اس کی حفاظت اوراس کو بچانے کی کسی کے پاس کوئی تدبیر نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے پاس کوئی ایسی بیمہ پالیسی ہے جو اس کی حفاظت کر سکے۔ڈاکٹر عابد معز اس المیے کو چند جملوں میں یوں بیان کرتے ہیں:

''بیمہ کے بغیر زندہ نہ رہ سکنے کے اس دور میں ہمیں اس بیمہ ایجنٹ کی تلاش ہے جو ہماری تہذیب، سماجی اقدار اور ثقافت کا بیمہ کر سکے جنہیں آج جو قطرہ لاحق ہے شاید پہلے کبھی پیش نہ تھا''۔ ۱

ہر زمانے میں کھیلوں کو فوقیت حاصل رہی ہے۔اسی لحاظ سے ہر ملک کا قومی کھیل ہوا کرتا ہے۔عصر حاضر میں کرکٹ ایک ایسا کھیل ہے جس نے تمام کھیلوں کو پیچھے کر دیا ہے بلکہ براعظم ایشیاء کے چند ممالک کا یہ قومی نشہ ہو گیا ہے حالانکہ یہ کھیل بڑے نازنخروں اور وقت و پیسہ برباد کرنے والا کھیل ہے۔پھر بھی آج یہ قومی شوق اور دیوانگی کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ڈاکٹر عابد معز اختصار کا لحاظ کرتے ہوئے کرکٹ کے تعلق سے لکھتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''کرکٹ ریکارڈ بنانے و ریکارڈ توڑنے کا دوسرا نام ہے''۔ ۲

شاعر سماج کا ایک حساس فرد ہوتا ہے اس کے یہاں شعر کہنے کی خداداد صلاحیت ہوتی ہے اس کے باوجود بہت ساری خامیاں بھی ہوتی ہیں ان میں اس کی سب سے بری خامی سامعین سے داد حاصل کرنے کی ہوتی ہے۔ڈاکٹر عابد معز نے اختصار و جامعیت سے شاعر کی فطرت کو یوں عیاں کیا ہے:

''صدر مشاعرہ شاعر کو شروع ہونے کی اجازت دیتا ہے لیکن شاعر کو روکنا یا ٹوکنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔شاعر اور مائیکروفون میں مقناطیسی ربط ہوتا ہے۔ قریب ہوتے ہی دونوں چمٹ جاتے ہیں''۔ ۳

---

۱ ۔''بیمہ ایجنٹ سے بچنا محال ہے''فارغ البال۔ص:59

۲۔''یارے کرکٹ کا کچھ بیان ہو جائے''،فارغ البال۔ص:84

۳ ۔''سامعین کرام!توبہ چاہتا ہوں''فارغ البال۔ص:209

ماحول کا اثر

ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور ادیب سماج کی عکس بندی کرتا ہے۔ انسان جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے اس ماحول کا اثر قبول کرنا فطری بات ہے۔ ادیب بھی سماج کا ایک فرد ہوتا ہے لیکن وہ سماجی اثرات کا اظہار شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنی تحریروں کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ ڈاکٹر عابد معز کے انشائیوں میں بھی یہ تمام خصوصیات نظر آتی ہیں۔

پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا کو اپنانے والے نوجوانوں نے اپنی خیالی جنت کو پایا ہے اس کے باوجود وہ نہایت ہی سخت نفسیاتی اضطراب سے دوچار ہیں۔ ایسا اضطراب جس کی حقیقت کا سراغ لگانے یا اس کی آنچ کو کچھ کم کر دینے کی اب ان میں سکت باقی نہیں رہ گئی۔ یہ مصیبت دراصل مادہ پرست مذہبیت بیزار ذرائع ابلاغ، فحش لٹریچر اور روحانی خلاء کا فقدان ہے۔

دنیا کے ہر خطہ کی الگ الگ تہذیب ہوتی ہے انسان کی پہچان اس کی تہذیب سے ہوتی ہے۔ آج یوروپ کا سیاسی ماحول اور تہذیب بہت طاقت ور مضبوط ہے لیکن سماجی و معاشرتی نظام میں بہت حد تک بگاڑ آچکا ہے کہ اس کے برعکس مشرق میں سیاسی نظام کے مقابلے میں سماجی و خاندانی نظام کچھ حد تک مضبوط اور قائم ہے۔ بے شک ہم مشرقیوں میں شرم و حیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ آج بھی یہاں کی بیشتر خواتین اپنے شوہر کا نام دوسروں کے سامنے یا تنہائی میں بھی زبان پر لانا گوارا نہیں کرتیں۔ لیکن کچھ مغربی تہذیب کے دل دادہ افراد اپنی تہذیب کی عظیم قدروں کو بھلا بیٹھے ہیں۔ بعض مغرب زدہ مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اپنے شوہروں کو ناموں سے یا ان کے عہدوں و پیشوں یا ان کے کاروبار کی مناسبت سے مخاطب کر رہی ہیں۔ اس تعلق سے ڈاکٹر عابد معز یوں فرماتے ہیں:

> ’’چند بیویاں اپنے شوہروں کو ان کے عہدوں پیشوں یا ان کے کاروبار کی
> مناسبت سے مخاطب کرتی ہیں۔ مثلاً وکیل صاحب، تحصیلدار صاحب، سیٹھ

صاحب، ڈاکٹر صاحب، اس ضمن میں ایک محترمہ اعتراض کرتی ہیں کہ عہدوں کا نام لے کر مخاطب کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے خواتین عہدیداروں کی بجائے ان عہدوں کی بیویاں ہیں......! بعض شوہر اور بیویاں شادی سے پہلے کے طرز تخاطب کو تھوڑا بہت تبدیل کر کے مخاطب کرتے ہیں۔ ایک صاحبہ جمیلہ سے جمی ہوگئیں تو ایک صاحب مظہر سے مجو ہوگئے۔ ہمارے ایک دوست نے ٹیوشن پڑھاتے پڑھاتے نکاح پڑھوالیا۔ شادی کے بعد بھی موصوف کی بیوی اپنے شوہر کو ''ماسٹر صاحب'' کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔ غصّے میں صرف ''ماسٹر'' کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے، صاحب غصے کی نذر ہو جاتا ہے۔ ایک محترمہ مالک مکان سے شادی کے بعد بھی شوہر کو ''مکاندار'' کے نام سے مخاطب کرتی ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے اپنی سکریٹری سے شادی رچالی۔ شادی کے بعد بھی بیوی انہیں ''باس'' کہہ کر مخاطب کرتی ہیں جب کہ عملاً بیوی باس بنی ہوئی تھی'' [1]

خدائے تعالٰی نے اپنی تمام مخلوق میں انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا فرمایا ہے اور اس کو دوسری مخلوق سے بہترین ساخت میں پیدا کیا ہے لیکن انسان اس کی دی ہوئی نعمتوں سے مطمئن نہیں ہے۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں چند لوگ غلط ماحول کے اثر سے خواہ مرد ہو کہ عورت اپنی جنس سے مطمئن نہ ہو کر سائنس کی مدد سے اپنی جنس بدلنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس تعلق سے ڈاکٹر عابد معز نے اس طرح اشارہ کیا ہے:

''پسند اپنی اپنی اور خیال اپنا اپنا کے تحت چاہے تو کوئی اپنی جنس تبدیل کرلے شمیم خاں شمیم النساء یا وجے کمار، وجے کماری بن جائے۔ چند دن قبل ہم نے اخبار میں خبر پڑھی تھی کہ ایک صاحب تیس سال مرد رہنے کے بعد اپنی بقیہ زندگی عورت بن کر گزارنے کا فیصلہ کیا اور ڈاکٹروں کی مدد سے اب بقیہ زندگی کے

---

[1] ۔مضمون ''یہ القاب وآداب!'' فارغ البال۔ص:131-130

لیے وہ خاتون بن گئے رگئی ہیں''۔ [1]

مبالغہ آرائی

مبالغہ آرائی بھی انشائیہ کی ایک اہم خصوصیت ہے۔اس میں انشائیہ نگار کبھی کبھار اپنی تحریر میں مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے۔مبالغہ آرائی کے باوجود پیش کردہ واقعہ حقیقت سے قریب یا سچ معلوم ہوتا ہے۔

عابد معز کے انشائیوں میں ہمیں یہ خصوصیت نظر آتی ہے جوانہوں نے اپنے مختلف مضامین میں کبھی کبھار استعمال کیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں حجام اور درزی دو ایسے بنیادی افراد ہوتے ہیں جن کی ضرورت ہر ذی شعور فرد کو ہوتی ہے۔ان میں درزی ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو کسی کی مجبوری کو سمجھے بغیر اپنی من مانی کرتا رہتا ہے۔ڈاکٹر عابد معز نے مبالغہ آرائی کے انداز میں درزی کی منجملہ خصوصیات اس طرح لکھی ہیں:

> ''ہمیں شریف اور معزز بننے کے لیے مختلف درزیوں سے رجوع ہونا پڑتا ہے۔ہم نے اپنی شادی میں سالے اور سالیوں سے زیادہ درزیوں کے نازنخرے برداشت کئے ہیں۔شادی سے چند دن پہلے بلکہ بعد میں بھی ہر شام ہم درزی یاترا پر نکلتے تھے......ایک مرتبہ ہم نے عید سے دو روز قبل منت سماجت کر کے درزی کو شیروانی سینے دیا۔درزی نے عید سے پہلے کچی سلائی اور عید کے بعد پکی سلائی کر کے دینے کا وعدہ کیا۔عید کے دن ہم شیروانی پہن کر دوست احباب سے عید ملنے گئے۔ہم سے ایک قریبی دوست کچھ بے تکلفی سے گلے ایسے ملے کہ شیروانی کا ایک ہاتھ ان کے پاس بطور سوغات چلا گیا''۔ [2]

عشق محبت کرنے کا رجحان زمانہ ازل سے رہا ہے۔اہل زمانہ نے کبھی اس کی اجازت نہیں دی بلکہ ان سے نفرت کا رویہ ہی اختیار کیا ہے۔عشق عاشقی کے معاملے میں نوجوان طبقہ ہمیشہ ہی متاثر رہا۔بعض نوجوان فلمیں دیکھ کر اس جانب اپنی توجہ کرتے ہیں۔عابد معز کا کہنا ہے کہ فلموں اور ٹی وی کے ذریعہ نوجوان

---

[1] ۔''تصویر کائنات میں رنگ''فارغ البال۔ص:14

[2] مضمون''ہم آپ کو معزز بناتے ہیں''فارغ البال۔ص:106-109

ہی نہیں بلکہ نابالغ بچے بھی عشق عاشقی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اس صورت حال کے اظہار میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''جوانی کی محبت کا چلن تو تھا ہی فلموں کی بدولت بچپن کی محبت عام ہوئی ہے۔ بچے چڈی سنبھالتے، انگوٹھا چوستے اور کھلونوں سے کھیلتے ہوئے تتلا کر ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھاتے ہیں۔ جنم جنم ساتھ رہنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ معصوموں میں جذبہ رقابت بھی پروان چڑھنے لگتا ہے۔ ایک بار ہمارے چھ سالہ لڑکے نے شکایت کی۔ 'ڈیڈی آپ راشد کے ابو سے کٹی کرلیں'۔

ہم نے سبب دریافت کیا تو جواب ملا: 'اس لیے کہ راشد میری پنکی سے دوستی کر رہا ہے میں نہیں چاہتا کہ پنکی کسی دوسرے کے ساتھ کھیلے'......!''۔ [۱]

انسانی زندگی میں تکیہ ایک اہم ضرورت ہے۔ عابد معز تکیہ کے مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیتے ہوئے اس کی اہمیت وافادیت کو بیان کرتے ہیں۔ یہاں بھی وہ مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادیبوں اور شاعروں کو تکیہ سے خاص انس ہوتا ہے۔ تکیہ پر سر رکھے گھنٹوں ادبی تخلیقات، افسانے کا پلاٹ یا مصرعہ کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ تکیہ سے مضامین اور موضوعات بھی آتے ہیں۔ ہمارے ایک شاعر دوست سے ایک مرتبہ پوچھا گیا تھا۔ آپ شاعری کیسے کرتے ہیں؟۔ جواب میں انہوں نے بتایا ۔تکیہ کی مدد سے! مجھے شاعری کی تحریک تکیہ سے ملتی ہے۔ میں تکیہ پر سر رکھ کر گنگنانے لگتا ہوں تو شعروں کا نزول ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل سے تھک کر اسی تکیہ پر سو بھی جاتا ہوں۔ جب بھی ہمارے شاعر دوست مشاعروں میں جاتے ہیں اپنا تکیہ ساتھ ضرور لے جاتے ہیں سفر کے دوران اپنے تکیہ کی مدد سے شاعری کرتے ہیں اور مشاعرہ میں تازہ کلام سنا کر مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ

۱۔ ''سوز محبت''، فارغ البال۔ص:68

> اتفاق سے موصوف کا تکیہ ایک مترنم شاعر کے تکیہ سے بدل گیا۔ مشاعرہ میں انہوں نے دوسرے تکیہ کی بدولت بے وزن کلام تحت میں سنایا اور ہوٹ ہوئے''۔[1]

جدت پسندی

جدت پسندی انشائیہ کا ایک اہم جز ہے۔ اس میں انشائیہ نگار اپنی جدت پسندی سے دوسرے انشائیہ نگاروں سے ہٹ کرا لگ راہ نکلتا ہے۔ جدت پسندی سے انشائیہ کی الگ پہچان بنتی ہے۔ اس میں انشائیہ نگار اپنی پیش کش میں نیا انداز نیا قصہ، نئی بات، نئی سوچ یا نئی فکر کو قلم بند کرتا ہے جس سے قاری یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اب تک ہمارا ذہن اس جانب کیوں نہیں گیا۔

ڈاکٹر عابد معز کے ہاں ہمیں جدت پسندی مختلف انداز میں یعنی پیش کش ،موضوعات لب ولہجہ اور اسلوب وغیرہ میں ملتی ہے۔

عقبی ادب سے مراد مختلف اشیاء پر لکھی گئی تحریر ہے جیسے سواریوں کے پیچھے، کپڑوں پر، تکیہ اور اسکے غلافوں پر ٹوپی (کیپ) بیگ اور ٹی شرٹس وغیرہ۔ اس وقت عقبی ادب انگریزی زبان میں سب سے زیادہ لکھا جارہا ہے۔ ڈاکٹر عابد معز کا ماننا ہے کہ اردو زبان میں عقبی ادب کا رجحان عام کرنے سے اردو کی ترقی و ترویج میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ اس تعلق سے وہ نمونے اس طرح پیش کیے ہیں:۔ اس طرح لکھا ہے:

> ''عقبی ادب کی تیسری قسم کپڑوں پر چھپے ادب کی ہے۔ یہ جدید ادب انگریزی زبان ہوتا ہے۔ ابھی اس کا چلن دوسری زبانوں میں رائج نہیں ہوا ہے۔ کسی حسینہ کے ٹی شرٹ کے پیچھے Follow me لکھا ہوا ہے تو کسی کی جینز کے پیچھے Property Private گڑھا ہوتا ہے۔ نمبر قسم کے کپڑوں پر مختلف نمبر درج ہوتے ہیں جیسے Love 88 ,Disco 87,007 ہمارے

---

[1] ۔''تکیہ پر آسہارا تکیہ'' فارغ البال۔ص:151

خیال میں کپڑوں کے پیچھے اردو فقروں اور محاوروں کا استعمال خوب رہے گا۔
شرٹ پر لکھنے کے لیے چند نمونے پیش خدمت ہیں۔ دل دیوانہ۔ اندھی محبت۔
تلاش گم شدہ، رائی کا پربت۔ اندھیر نگری چوپٹ راجا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے
پات۔ مصرعوں کو بھی آزمایا جاسکتا ہے۔ جیسے ابھی تو میں جوان ہوں۔ کوئی امید
بر نہیں آتی۔ دل نادان تجھے ہوا کیا ہے۔ وغیرہ۔ جس طرح کپڑوں پر کھلاڑیوں
اور اداکاروں کی تصویریں اور نام چھاپے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر ادیبوں اور
شاعروں کی تصویریں اور نام بھی کپڑوں پر چھاپے جائیں تو انہیں جائز مقام نہ
ملنے کی شکایت دور ہوسکتی ہے۔ غالبؔ شرٹ اقبالؔ قمیص۔ میرؔ ٹی شرٹ۔ داغؔ
شرٹس اور ایسے ہی دور حاضر کے ادیبوں اور شاعروں کے نام کے کپڑے اگر
مفت تقسیم کئے جائیں تو یہ تحریک عملی جامہ پہن سکتی ہے۔ ادب کے طالب علموں
پر ان کپڑوں کو پہننے کا لزوم عائد کیا جاسکتا ہے۔ تن ڈھانکنے کے مقصد کے ساتھ
ادب کو سمجھنے میں بھی سہولت ہوگی''۔ [1]

آج ہمارے معاشرے میں ٹی وی سیریل اور فلمیں دیکھنے کا رجحان اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ گھر کے چھوٹے بڑے سب افراد سیریلوں اور فلموں کے سبب اپنی اپنی ذمہ داریوں سے دور ہوتے جارہے ہیں یہی نہیں بلکہ اس مصروف ترین زندگی کا وقت بھی برباد کررہے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر عابد معز کا خیال ہے کہ فیملی پلاننگ کی طرح فلمی پلاننگ ضروری ہے:

''فلموں اور فلم زدہ ماحول سے پریشان ہوکر میں فلمی پلاننگ کے تعلق سے
سوچنے لگا۔ جس طرح فیملی پلاننگ سے خوشحالی آتی ہے۔ ویسے ہی میں نے
قیاس کیا کہ فلمی پلاننگ کے ذریعہ کچھ ڈھنگ کی زندگی گزرے گی۔ میں نے
''دو یا ایک بس'' کا نعرہ اپنایا۔ اپنے گھر میں فلمی پلاننگ پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔

---

[1] ۔ عقبی ادب۔ فارغ البال۔ ص:29

خاندان کے سبھی افراد نے ہفتہ میں دو فلموں پر اکتفا کرنے کا فیصلہ کیا۔اس فیصلہ
سے بہت خوش ہوا''۔ [1]

شخصیت کا اظہار

انشائیہ کی ایک اہم خصوصیت شخصیت کا اظہار بھی ہے۔اس میں شخصی ردعمل کو لازمی جز تسلیم کیا جاتا ہے۔فن کار کے ذہن کی تربیت اور اسکے مزاج کی تعمیر میں سماج اور ماحول ہمیشہ اثر انداز رہا ہے۔وہ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے ذاتی خیالات، جذبات، احساسات، مشاہدات کو بڑے خوبصورت پیرائے میں پیش کرتا ہے اسی پیش کش کے دوران انشائیہ نگار کی شخصیت کے کئی پہلو قاری کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں۔

عابد معز کے انشائیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت ہمہ گیر ہے۔ ہر مضمون میں وہ الگ الگ انداز سے دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً ان کی پسند، ناپسندیدہ مشاغل، رہن سہن طور طریقے وغیرہ۔

ڈاکٹر عابد معز کی ابتدائی تعلیم انگلش میڈیم اسکول میں ہوئی انہوں نے مادری زبان اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھا اور سیکھا۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ ایک ایم بی بی ایس (MBBS) ڈاکٹر ہیں اس کے باوجود اردو زبان کی ترقی و ترویج میں ہر دم مصروف رہتے ہیں۔انہیں اردو زبان و ادب سے جنون کی حد تک عشق ہے۔ان کو ان لوگوں سے سخت نفرت ہے جن کی مادری زبان اردو ہونے کے باوجود اپنی مادری زبان سے بے راہ روی برتتے ہیں ایسے اشخاص پر وہ برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔جس سے ان کی شخصیت کا اظہار بخوبی ہوجاتا ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

''مجھے اردو نہیں آتی ۔ یہ عام اور مقبول جواب ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ
اس قسم کا جواب دینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چند برس پہلے

---

[1] ۔ ''فلمی پلاننگ'' فارغ البال۔ص:51

تک کانونٹ اسکولوں میں زیر تعلیم نوجوان اور بچوں سے اس قسم کے جواب کی توقع کی جاتی تھی لیکن اب بڑی عمر کے لوگ بھی خاص تعداد میں سینہ ٹھونک کر دعویٰ کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں کہ مجھے اردو نہیں آتی۔ میں نے یہ جملہ اتنی مرتبہ سنا ہے کہ بعض اوقات میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں مجھے اردو کیوں آتی ہے؟۔اس بے تکے سوال پر میں جذباتی ہوکر اپنے آپ کو ڈانٹتا ہوں۔ بے وقوف! تجھے اردو اس لیے آتی ہے کہ یہ تیری مادری زبان ہے اس میں تعجب کی کیا بات ہے''۔ ۱؎

ایک اور مضمون میں اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو زبان کے تعلق سے اس طرح لکھا ہے:

''اردو زبان سے عشق کی حد تک محبت ہے۔ ہم زبان لوگوں میں جذبہ رقابت نہ ہونے اور ان میں پائی جانے والی بے حسی سے دل ہول آتا ہے۔ان افراد پر بہت غصہ آتا ہے جن کی مادری زبان اردو ہونے کے باوجو سینہ تان کر ''ہمیں اردو نہیں آتی'' کہتے ہیں فخر محسوس کرتے ہیں۔ میں ان سے الجھ پڑتا ہوں''۔ ۲؎

ڈاکٹر عابد معز اپنے اندر اردو زبان و ادب کے شعراء کے تئیں ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں اس کا اظہار انہوں نے اپنے مضامین میں کہیں طنز کے پردے میں تو کہیں مزاح کے پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔ شعراء کے تعلق سے ان کی شخصیت اس طرح واضح ہوتی ہے ملاحظہ فرمائیں:

''میں شعرا کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔گھاٹے کا سودا جو کرتے ہیں۔ خون دل جلا کر شاعری کرتے ہیں۔ بدلے میں انہیں کیا ملتا ہے۔ معدُودے چند کو چھوڑ دیجئے خود اپنا مجموعہ کلام چھپوانا پڑتا ہے۔۔ادبی رسالوں کی سرپرستی قبول کرنی پڑتی ہے۔اپنے خرچ پر مشاعروں میں جاتے ہیں۔اس صورت

۱؎ A Complicated case فارغ البال۔ص:225

۲؎ مضمون ''اپنے منہ میاں مٹھو''۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر نومبر 2008،ص:241

حال کے ذمہ دار صرف شعراء نہیں ہم سب اردو والے ہیں''۔ ؎۱

ماضی میں خوشامد، سفارش اور رشوت کا حربہ ایک کے بعد ایک آزمایا جاتا تھا یا تینوں میں کسی ایک سے کام نکل آتا تھا۔ آج کے اس مسابقتی دور میں ایک ساتھ تینوں حربوں کو بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ دور حاضر کا انسان ان تینوں کو بنیاد بنا کر محنت مشقت سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اس خیال سے ڈاکٹر عابد معز مکمل طور پر مطمئن نہیں ہیں بلکہ محنت و مشقت کو ہی بنیادی وصف قرار دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''محنت کا پھل، مسئلہ کا حل، امتحان یا انٹرویو کا نتیجہ، عرضی کی قبولیت، آمدنی میں اضافہ، غرض ہر پہلو سے زندگی میں خوشحالی کا دارومدار ہمارے تکون پر ہے ہمارے تکون کے ارکان پر صدق دل سے عمل پیرا ہونے والے کی زندگی میں خوش حالی کی گارنٹی ہم دے سکتے ہیں''۔ ؎۲

ہمارے سماج میں مختلف پیشے ہیں ان میں ایک معتبر اور عزّت دار پیشہ طب بھی ہے۔ جی ہاں! انسان تکلیف میں خدا کو یاد کرنے کے بعد ڈاکٹر کو تلاش کرتا ہے۔ لیکن موجودہ دور کے ڈاکٹروں کی سوچ و فکر عمل ورد عمل سے ڈاکٹر عابد معز پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ اس حقیقت بیانی سے ہماری زندگی کی ایک تلخ حقیقت کی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''انسان تکلیف میں خدا کو یاد کرنے کے بعد ڈاکٹر کو تلاش کرتا ہے۔ اس سے مشورہ کرتا ہے اور اس کی ہدایات پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ لفظ ڈاکٹر سے ذہن میں مختلف صورتیں ابھرتی ہیں۔ بچہ سمجھتا ہے کہ ڈاکٹر ایک جلاّد ہے جس کے ہاتھ میں سدا ایک موٹا انجکشن رہتا ہے۔ قریب المرگ شخص کے لیے ڈاکٹر ملک الموت ہے۔ شفایاب مریض ڈاکٹر کو فرشتہ سمجھتا ہے۔ ہماری نظر میں ڈاکٹر سماج کے اس طبقہ کا نام ہے جو لوگوں کو مختلف بیماریوں میں مبتلا دیکھ کر خوش ہوتا اور فائدہ اٹھاتا

؎۱۔ مضمون، ''پیشگی خطبۂ صدارت'' ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ ص:202

؎۲۔ ''خوشحالی کا تکون'' فارغ البال۔ ص:97۔

ہے۔آپ شاید ہم سے اختلاف کریں۔ ماضی میں ڈاکٹر کے تعلق سے ہمارا نظریہ ایسا نہ تھا''۔ [1]

الغرض ڈاکٹر عابد معز کے انشائیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں انشائیہ نگاری کی تمام بنیادی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔مثلاً۔دعوت غور وفکر، حقیقت پسندی، بے تکلف گفتگو، شگفتہ بیانی، اختصار و جامعیت، ماحول کا اثر، مبالغہ آرائی۔ جدت پسندی، شخصیت کا اظہار وغیرہ بلا شبہ ہم عابد معز کے انشائیوں کے مطالعے کے بعد ڈاکٹر عابد معز کو ایک کامیاب انشائیہ نگار کہہ سکتے ہیں۔

☆☆☆

---

[1]۔''ہمارے بھی ہیں ڈاکٹراں کیسے کیسے'' فارغ البال۔ص:161

عابد معز بحیثیت کالم نگار

کالم جدید صحافت کا ایک اہم جز ہے جو انفرادی اور شخصی صحافت کی ایک بہترین مثال ہے۔ اسی لئے کالم نویسوں کو دانشور طبقہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ کالم نویس کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار پوری ذمہ داری اور یقین کے ساتھ کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے قارئین کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے مختلف موضوعات پر اپنی رائے کا بھی اظہار کرتا ہے۔

کالم کے لغوی معنی ستون یا پلّر (piller) کے ہیں۔ صحافتی اصطلاح میں کالم اخباری صفحے کا عمودی حصہ ہوتا ہے اور روزناموں میں عموماً ہر صفحہ پر آٹھ کالم ہوتے ہیں۔ خبریں، مضامین، ادارے اور دیگر صحافتی مواد کو انہی کالموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جب صحافتی مواد، موضوعاتی تحریریں، مستقل عنوانات کے تحت پابندی سے شائع ہوتے ہیں اور اخبار کے صفحہ پر ان کی جگہ متعین کیا جاتا ہے تو اسے کالم کہتے ہیں۔ یعنی کسی اخبار میں مقرر موضوع پر اپنے مخصوص انداز بیان واسلوب پر لکھی جانے والی تحریر کو کالم کہتے ہیں۔ عام طور پر کالم میں وقتی، قومی، ملی ثقافتی، علمی، ادبی، تہذیبی، اور سیاسی باتوں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔

عابد معز کی ادبی شخصیت کا ایک پہلو کالم نگاری بھی ہے۔ انہوں نے مختلف اخباروں میں مختلف عنوانات کے تحت ادبی کالم لکھے ہیں۔ ان کی کالم نگاری کی ابتداء ہفت روزہ اور میگزین، جدہ سے اگسٹ 1997ء میں ہوئی۔ ہفت روزہ اردو میگزین جدہ سے 'فکاہیہ' کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔ 'فکاہیہ' کالم کا سلسلہ ہر ہفتہ فروری 2003ء تک چلتا رہا، اس کے علاوہ ان کا دوسرا کالم ''پھر چھڑی بات'' کے عنوان سے روزنامہ اعتماد حیدرآباد کے ادبی ایڈیشن ''اوراق ادب'' میں مارچ 2006ء تا اگسٹ 2008ء تک ہر دوشنبہ شائع ہوتا رہا۔ ان کا تیسرا ادبی کالم 'بات سے بات'' کے عنوان سے ہفت روزہ اردو میگزین جدہ سے 15 مئی

2007ء اکٹوبر 2009ء تک شائع ہوتا رہا۔غرض عابد معز اب تک مختلف اخباروں میں مختلف عنوانات کے تحت 600 سے زائد کالم لکھ چکے ہیں۔ان کے ہفتہ وار کالموں کا ایک انتخاب ''بات سے بات'' کے عنوان سے کتابی شکل میں ہدیٰ پبلی کیشنز حیدرآباد سے ستمبر 2012ء کو شائع ہوا۔اس مجموعہ میں کل 88 کالم ہیں۔ جنھیں 17 مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔یہ مجموعہ کل 276 صفحات پر مشتمل ہے۔عابد معز نے ادبی کالم کے علاوہ صحت ،طب اور تغذیہ کے موضوعات پر بھی بے شمار کالم لکھے ہیں۔جن کا تفصیلی تجزیہ آئندہ باب میں کیا جائے گا۔

عابد معز عصر حاضر کے نمائندہ کالم نگار ہیں۔جنہوں نے سماجی ،معاشرتی ،ثقافتی کے علاوہ نمائش وٹکنالوجی ،صحت وطب اور تغذیہ جیسے موضوعات کو اپنی کالم نگاری کا موضوع بنایا ہے۔ان کے کالموں کا اسلوب مزاحیہ وطنز آمیز اسلوب ہے۔وہ اپنے کالموں میں قارئین کو ہنسی ہنسی میں دنیا میں وقوع پزیر ہونے والے واقعات سے مکمل آ گہی کراتے ہیں۔سائنسی ایجادات و عالمی صورت حال کے منظر نامے کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔کہ ان کے کالم معلومات کا خزانہ معلوم ہوتے ہیں۔قاری ان کالموں کے باعث ہمیشہ نئے علوم سے اپنا رشتہ بنائے رکھتا ہے۔یہاں ان کے کالموں کے چند موضوعات جیسے صحت ،آبادی ،تعلیم ،نئی نسل ، انسانی فطرت ،سانس وٹکنالوجی ، ٹیلی فون ،کمپیوٹر ،ای میل ایس ایم ایس ،فلمیں ،اشتہارات غذا ، بیماری ، عالمی شہرت یافتہ شخصیت اور شہر حیدرآباد ، وغیرہ کا تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔تاکہ ان کے ذریعہ عابد معز کی کالم نگاری کی خصوصیات کا علم ہوسکے۔

صحت:

زندگی میں صحت سے بڑھ کر کوئی قیمتی شئے نہیں ہے۔اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔صحت کی اہمیت کے پیش نظر ہر کوئی اپنی صحت بنائے رکھنا چاہتا ہے۔مختلف وجوہات کے سبب صحت بہت جلد متاثر ہوتی ہے۔فی زمانہ صحت مند رہنے کے لئے ڈاکٹروں کے ناز ونخرے اور دواخانوں کے بے

تحاشہ اخراجات اٹھانا پڑ رہا ہے۔ ماضی میں معمولی امراض کا علاج گھریلو نسخوں سے کیا جاتا تھا لیکن موجودہ دور میں معمولی بیماری کے لئے کئی ٹسٹ کروانے پڑتے ہیں۔اس کے بعد علاج شروع ہوتا ہے۔تب کہیں جا کر ہم اپنے آپ کو تندرست محسوس کرتے ہیں چنانچہ عابد معز نے صحت وتندرستی کے اس پیچیدہ مسئلہ کو اپنے کالموں کا موضوع بنایا ہے۔ان کے مطابق فی زمانہ صحت بہت مہنگی ہوگئی ہے لہذٰا اپنے ایک کالم میں وہ لکھتے ہیں:

''دور حاضر کے امراض بڑے قیمتی ہیں، ہزاروں روپئے ہڑپ کر جاتے ہیں۔معمولی امراض جیسے نزلہ، زکام، کھانسی، سر درد اور بدہضمی کا علاج کبھی گھریلو چٹکلوں سے ہو جاتا تھا۔سوتے وقت گرم دودھ میں ہلدی ملا کر پی لیا یا صبح انڈا اوبال کر کالی مرچ کے ساتھ کھالیا۔نہار منہ ادرک چبالی یا لیمو پانی پی لیا۔سر میں تیل ڈال کر مالش کرالی، بھلے چنگے ہوگئے۔لیکن اب پتہ نہیں ہماری صحت کو کیا ہوگیا ہے۔معمولی گڑ بڑ کو سدھارنے کے لئے تین چار قسم کے ڈاکٹروں سے مشورہ کرنا پڑتا ہے اوران کی تجویز کردہ گولیاں، کیپسول اور انجکشن کی ضرورت ہوتی ہے۔اکثر مرتبہ پیشاب اور خون کے معائنے اور ایکسرے بھی اخراجات میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔تب کہیں جا کر ہماری صحت درست ہوتی ہے۔''[1]

عابد معز کا خیال ہے کہ فی زمانہ لوگ صحت قائم رکھنے کے لئے مختلف حربے آزماتے جارہے ہیں۔ جیسے غذاؤں میں احتیاط برتنا، ہر وقت اپنے آپ کو حرکت میں رکھنا وغیرہ لیکن آگے وہ کہتے ہیں کہ ان تدابیروں کے علاوہ اچھی خاصی رقم بھی تیار رکھنا ضروری ہوتا جارہا ہے پتا نہیں کب ضرورت پڑ جائے۔ چنانچہ اسی صورت حال کا محاسبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] بات سے بات صفحہ نمبر 23۔سن اشاعت ستمبر۔2012ء

''لوگ صحت قائم رکھنے کے لئے مختلف حربے آزماتے ہیں۔غذا میں احتیاط برتتے ہیں۔کم کھاتے اور میٹھا چکھتے تک نہیں۔ بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔ ہر کام وقت پر انجام دیتے ہیں۔لیکن ایک تجربہ کار مریض کا ماننا ہے کہ صحت قائم رکھنے کے لئے ان تدابیر کے علاوہ ہر دم ایک موٹی رقم تیار رکھنا ضروری ہے۔ معلوم نہیں کب ضرورت پڑ جائے۔اگر طبی اخراجات پیشگی ادا نہیں کئے گئے تو علاج تو دور فرسٹ ایڈ تک نہیں ملتی۔دواخانے اپنے دروازے بند کر لیتے اور ڈاکٹر زمنہ پھیر لیتے ہیں۔لیکن ہر دواخانہ اور ڈاکٹر اتنا سنگ دل نہیں ہوتا۔ وہ علاج کرتے ہیں۔اور مریض کو اس وقت تک جانے نہیں دیتے جب تک کہ بل چکتا نہیں ہوتا مریض کو زندہ یا مردہ یرغمال بنالیا جاتا ہے''۔ ؎۱

آج صحت اس لئے بھی بڑی دولت ہے کہ لوگ صحت کا انشورنس کروا رہے ہیں۔لیکن اس انشورنس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ صحت دیکھ کر قیمت تعین کی جاتی ہے۔اگر صحت تندرست نہیں ہے۔تو پریمیم کی قیمت بڑھادی جاتی ہے۔ڈاکٹر عابد معز صحت کی اس انمول دولت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' یوں تندرستی کی قیمت کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ صحت بہت بڑی دولت ہے اور یہ بھی کہ وقت کے ساتھ اس کی قیمت میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔قیمتی اشیا کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔لوگ مختلف حربے آزماتے ہیں، ایک طریقہ انشورنس بھی ہے۔صحت کا اندازہ کر کے اس کی قیمت معین کی جاتی ہے اور پھر اس دولت کا انشورنس کیا جاتا ہے۔صحت کی دولت ،زیادہ رہی تو پریمیم کم ہوتا ہے اور اگر یہ دولت کم ہوئی تو پریمیم زیادہ''۔ ؎۲

موجودہ دور میں لوگ صحت مند رہنے کے لئے کئی ایک تدابیر اختیار کر رہے ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح کوئی نہ کوئی بیماری میں مبتلا ہو جا رہے ہیں۔ جیسے شوگر، بلڈ پریشر۔ عابد معز اپنے ایک کالم میں شوگر کی

؎۱ ۔بات سے بات صفحہ نمبر 23

؎۲ ۔ بات سے بات صفحہ نمبر 26

بڑھتی ہوئی بیماری پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''شوگر برادری کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں ہے، کوئی کچھ کہتا ہے تو کوئی کچھ، لیکن ہمارا مشاہدہ اور ماہرین کے جمع شدہ اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ شوگر برادری میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ میں نے چند دن پہلے اخبار میں پڑھا تھا۔ کہ شوگر برادری میں اضافہ ماہرین کی پیش قیاسی سے تیس چالیس فیصد زیادہ تیز ہے۔ حتمی طور پر نہیں معلوم کہ اس اضافے اور شوگر بھائی بننے کی وجوہات کیا ہیں۔ ماہرین خوب اٹکلیں لگاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے ہماری ترقی اس کی اہم وجہ ہے۔ ترقی ہمیں زیادہ غذا مہیا کر رہی ہے اور ہم خوب کھا کر شوگر بھائی بننے کے لیے تیار ہو رہے ہیں، ترقی ہمیں آرام طلب آلسی اور فربہ بنا رہی ہے۔ ہم پیدل چلنا بھولتے جا رہے ہیں کم کام اور زیادہ آرام کرنا شوگر بھائی بناتا ہے۔ ٹیلی وژن بھی ہمیں کئی طریقوں سے شوگر بھائی بناتا ہے۔ شوگر بھائی بننے کی وجوہات کے بارے میں جاننے لگتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ خود اپنے دام میں گرفتار ہو کر ہم شوگر بھائی بنتے جا رہے ہیں''۔[1]

شوگر کی طرح بلڈ پریشر کی بیماری میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ آج انسان کو سکون میسر نہیں ہے۔ صبح سے شام تک زندگی کے کسی نہ کسی مسئلہ میں الجھا ہوا ہوتا ہے چاہے امیر ہو یا غریب، عابد معز کا خیال ہے کہ اپنے بلڈ پریشر کو نارمل رکھنا ہے تو ہمیں بے خبری میسر آنی چاہئے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے ہم دنیا سے بے خبر ہو کر زندگی گذار سکیں۔ عابد معز نے اپنے ایک کالم میں بلڈ پریشر کے اسباب بتاتے ہوئے ڈاکٹر حضرات کو ہی شگفتہ انداز میں ذمہ دار گردانتے ہیں، لکھا ہے:

''دوسرے لوگوں کا بلڈ پریشر شائد اس لئے نارمل ہے کہ وہ ابھی تک ڈاکٹر

---

[1] ۔ بات سے بات صفحہ نمبر 41

کے پاس نہیں گئے۔ اگر وہ ڈاکٹر کے پاس گئے ہوتے تو ان پر بھی ہائی بلڈ پریشر کا
لیبل چسپاں ہو گیا ہوتا یا پھر انھیں یہ مشورہ ملتا،، جناب اس وقت آپ کا پریشر
نارمل ہے۔ آپ چند دن بعد مجھ سے ملئے۔ میں دوبارہ بلڈ پریشر چیک کروں
گا۔ یہ دھمکی سن کر جلد یا دیران حضرات کا بلڈ پریشر نارمل سے ہائی ہونے پر مائل
ہوتا ہے۔ ہائی بلڈ پریشر کو عام کرنے میں ڈاکٹروں کا بہت اہم رول ہے۔ وہی تو
ہیں جو ہمیں ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا کرتے ہیں۔ ورنہ ہمیں کیا پتہ ہمیں تو اندازہ
نہیں ہوتا کہ ہمارا کوئی پریشر بھی ہے۔[1]

مختلف قسم کی بڑھتی ہوئی بیماری کے باعث انسان کی صحت اب صرف گولیوں پر منحصر ہوگئی ہے۔ ہمارے آس پاس کئی ایسے افراد مل جاتے ہیں جو دن میں کم سے کم ایک وقت تو گولی لیتے ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آج لوگ درد اور بیماری کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، معمولی صحت بگڑنے پر فوری گولیوں کا سہارا لیتے رہے ہیں۔ چنانچہ گولیوں پر منحصر انسان کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے عابد معز لکھتے ہیں:

،، کوئی یومیہ ایک گولی کھاتا ہے تو کوئی چار گولی روزانہ استعمال کرتا ہے کسی کا
راشن دو گولی ہے تو کسی کو درجنو بھر گولیاں درکار ہیں۔ شائد ہی کوئی بشر ایسا ہو گا جو
یہ دعوی کرے کہ میں گولی نہیں کھاتا یا میں نے کبھی کوئی گولی نہیں کھائی ہے۔
جب بھی ہمیں تکلیف ہوتی ہے، ہم فوری گولی کھاتے ہیں۔ سر، کمر، داڑھ یا کہیں
بھی درد ہو، درد کا درماں گولی ہے۔ طبیعت ناساز ہو تو گولیاں ہی اسے بحال
کرتی ہیں۔ چکراتے ہیں تو گولیاں ہی سیدھا کرتی ہیں۔ مایوسی کے اندھیرے
میں گم ہوتے ہیں تو گولیاں ہی اس سے باہر نکالتی ہیں۔ گولیاں ہی کمزوری دور
کرتی اور خوشی عطا کرتی ہیں۔ گولیاں کھا کھا کے ہم گولیوں کے اتنے عادی

---

[1] بات سے بات صفحہ 42

ہو گئے ہیں کہ ان کے بغیر ہمارا گزارا نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کو نینداس وقت تک نہیں آتی جب تک گولی ان کے اندر نہیں جاتی اور کچھ لوگوں کو صبح کی کشادگی کے لئے رات میں گولیاں لینا ضروری ہوتا ہے''۔ [1]

انسان صحت مند رہنے کے لاکھ جتن کر لے کبھی کبھار ایسی صورت حال سے دوچار ہو جاتا ہے کہ بات گولیوں سے بڑھ کر آپریشن جیسے مرحلے تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسی نازک صورت میں دواخانے کو رجوع ہونا پڑتا ہے۔ لیکن آج کے دواخانوں پر اعتماد رہا نہ ڈاکٹروں پر کیوں کہ آئے دن ایسے کئی واقعات سامنے آرہے ہیں کہ آپریشن کے بہانے مریض کے جسم سے گردوں جیسی قیمتی شئے نکال لے رہے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر عابد معز اپنے کالموں میں ڈاکٹروں کے اس غیر اخلاقی فعل کو بھی موضوع بنایا۔ جیسے ایک کالم میں ایک بیمار دوست سے گفتگو کرتے ہوئے دواخانوں اور ڈاکٹروں کی اس ناگفتہ صورت حال کو اس طرح واضح کیا ہے:

''ایک دوست کی عیادت کرنے میں ان کے گھر گیا۔ چند دن پہلے ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے موصوف کا پتا نکالا گیا تھا۔ اور اب وہ گھر پر آرام کر رہے تھے۔ میں نے ان کی صحت کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا'' آپریشن کامیاب رہا۔ الحمداللہ بعد میں بھی کوئی پیچیدگی یا مشکل نہیں ہوئی۔ طبیعت پہلے سے بہتر ہے لیکن ایک بات پریشان کئے جارہی ہے۔ میرا پیٹ کھولا گیا تھا اور پیٹ میں گردے بھی ہیں۔ کہیں بیمار پتے کے ساتھ صحت مند گردے تو نہیں نکال لیا گیا ہے۔ جب سے گردہ چوری اور گردہ کاروبار کے بارے میں پڑھا ہے ڈاکٹروں اور دواخانوں پر رہا سہا اعتماد ختم ہوتا جارہا ہے''۔ [1]

---

[1] ۔ بات سے بات صفحہ نمبر 37

[1] ۔ بات سے بات صفحہ منبر 34

عابد معز کے کالموں کے موضوعات میں ایک اہم موضوع ' آبادی' بھی ہے۔ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی پر بے شمار دانشوروں نے بڑھتی ہوئی آبادی پر روشنی ڈالی ہے۔ڈاکٹر عابد معز نے بھی اپنے کئی کالموں میں کثیر آبادی کے مسئلہ پر مختلف زاویوں سے اظہار خیال کیا ہے۔کبھی وہ ماہر مردم شمار کی طرح بڑھتی ہوئی آبادی کا محاسبہ کرتے ہیں تو کبھی دیگر ممالک کی آرا کا جائزہ لیتے ہیں۔یہی نہیں بلکہ اپنے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے وجہہ سے یہاں کے معاشرے کی صورت حال اوراس کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں۔ جیسے ایک جگہ انھوں نے ماہر مردم شمار کی طرح ماضی حال اور مستقبل کی روشنی میں ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا اس طرح محاسبہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''جولائی 2000 عیسوی میں Population clock کے مطابق ہم تعداد میں ایک ارب چودہ کروڑ ،اناسی لاکھ چھیانوے ہزار اور ایک سو چوّن تھے۔ اس عدد کو دوسرے طریقے سے پیش کیا جائے تو ہم 1149 ملین ہیں۔ آبادی گھڑی اپنی رفتار سے چل رہی ہے۔ میرے لکھنے اور آپ کے پڑھنے تک ہمارے ملک کی آبادی میں لاکھوں کا اگر نہیں تو ہزاروں کا ضرور اضافہ ہوا ہوگا۔ ہم سے آگے صرف چین ہے اور ہمارے پیچھے دنیا کے تقریباً دوسو ممالک اور ہم جس رفتار سے اضافہ ہو رہے ہیں اس سے امید ہے کہ 2030ء کے بعد چین بھی ہم سے پیچھے چلا جائے گا۔ قوی امید ہے کہ کرہ ارض پر انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ دو ارب (دو بلین) کا نشانہ چھونے والے ہم ہندستانی ہی ہوں گے'' ۔[1]

ہندوستان آبادی کے لحاظ سے دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ یہ بات کم آبادی رکھنے والے ممالک کے لوگوں کے لیے قابل تعجب ہے۔ بعض اوقات دیگر ممالک کے لوگ کثیر آبادی کی معاشرتی زندگی کو دیکھنے

---

[1] ۔بات سے بات صفحہ نمبر 64

کے لئے بھی آیا کرتے ہیں۔ یہاں لوگوں کے اجتماع کو دیکھ کر ہر گھڑی تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔اسی صورت حال کو عابد معز اپنے ایک کالم میں اپنے دوست کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے کہ ان کے دوست پچیس سال کے بعد اپنی امریکن بیوی کے ساتھ ہندوستان آتے ہیں۔ وہ امریکن عورت یہاں سیر و تفریح کے دوران لوگوں کی کثرت کو دیکھ کر ہر گھڑی تعجب کا اظہار کرتی ہے، لکھتے ہیں:

''امریکن بھابی گوری میم تھیں اور ہم دونوں بھارتی لوگ ہمیں دلچسپی اور تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ چند لوگ دو چار قدم ساتھ چل کر میم کا تفصیلی جائزہ بھی لے رہے تھے جب مانگنے والے بچے ہمارے پیچھے پڑ گئے اور بغیر ہاتھ دھوئے گوری میم کو چھونے لگے تو ہمیں پناہ حاصل کرنے لئے ایک چائے خانے میں داخل ہونا پڑا۔ چائے خانے میں ہم داخل ہو تو گئے لیکن وہاں کوئی ٹیبل خالی نہ تھی۔ تمام میز اور کرسیاں لوگوں سے پر تھیں اور دیوار سے لگ کر کچھ لوگ میز خالی ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ امریکن بھابی کی پھر حیرت سے دبی دبی چیخ نکل گئی، اف یہاں بھی لوگ!''۔ [۱]

مذکورہ اقتباس کے ذریعہ عابد معز نے قاری کی توجہ جس طرف مبذول کروائی ہے وہ یہ ہے کہ عالمی سطح پر ہندوستان کسی اور وجہہ سے رہے نہ رہے لیکن بڑھتی ہوئی آبادی سے عالمی خبرنامہ پر ہمیشہ سرفہرست رہے گا۔ اسی طرح ایک اور جگہ بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے ہندوستان کی معاشرتی زندگی جو صورت اختیار کر چکی ہے اس کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے کہتے ہیں۔

''بغیر قطار بنائے ہم ایک دوسرے پر گر پڑنے اور ایک دوسرے سے لڑنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے! معمولی سے معمولی کام جیسے کینٹین سے چائے لینے یا ضرورت سے فارغ ہونے کے لئے بھی لائن بنانا پڑتا ہے۔ اور لائن جب بنتی

۱۔ بات سے بات۔ صفحہ نمبر 63

ہے تو لوگوں کے بوجھ سے وہ سیدھی قطار نہیں ہوتی بلکہ گول مول شکل اختیار کر
جاتی ہے۔شاید اسی لئے ہم لائن کو Q کہتے ہیں‘‘۔ [1]

تعلیم:

تعلیم ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ازل سے ہی انسان نے اپنی ترجیحات میں تعلیم کو اولین ترجیح دی ہے۔ڈاکٹر عابد معز نے تعلیم پر کئی کالم لکھے ہیں جس میں تعلیم حاصل کرنے کے مقاصد کو ماضی اور حال کے تناظر میں پیش کیا ہے۔یہی نہیں بلکہ دورِ حاضر میں حصول تعلیم کی صورت حال کو دوٹوک لہجے میں بے نقاب کیا ہے۔قاری کو تعلیم کے بنیادی فرائض کو سمجھنے کی دعوت بھی دی ہے۔

عابد معز کے مطابق دورِ حاضر میں ہر سال نیا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ شہروں میں علم کا بازار لگا ہے۔ایک طرف والدین اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دینے کے لئے دوست احباب اور ماہرین تعلیم کے مشورے لینے میں مصروف ہیں۔تو دوسری جانب اسکول اور کالج والے پرمنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے اپنی تشہیر کرنے میں جٹے ہوتے ہیں۔چنانچہ عابد معز نئے تعلیمی سال کو خرید وفرخت کی شئے سے دو تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’نیا تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے۔لوگ نونہالوں کو علم کے زیور سے آراستہ اور پیراستہ کرنے کی فکر میں مبتلا ہیں۔ماں اور باپ سر جوڑے سوچ رہے ہیں۔احباب مشورہ دے رہے ہیں۔ماہرین کی رائے اپنی جگہ مسلّم ہے۔اخبارات اور رسائل اسکولوں کے اشتہارات سے بھرے پڑے ہیں۔تعلیم پر اخباروں کے اسپیشل ایڈیشن نکل رہے ہیں۔چوراہوں اور سڑکوں پر ورقئے تقسیم ہو رہے۔ٹیلی وژن پر بھی اسکولوں کی دھوم ہے۔سجھائی نہیں دیتا کے بچے کو کس اسکول میں داخل کیا جائے۔اپنی جیب میں جھانک کر دیکھنا بہت ضروری ہے۔اسکولوں کے

---

[1] ۔بات سے بات صفحہ نمبر 69

> اشتہارات سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تعلیمی سال کے آغاز پر علم کا بازار سجا ہے۔
> تعلیم بھی ایک جنس ہے جو مختلف اسکولوں پر دستیاب ہے۔ تاجر اپنے مال کی تشہیر
> کرتے ہیں اور ''گاہک حسب استطاعت، مال یعنی علم خرید تے ہیں!''[1]

عابد معز کے مطابق اس وقت کے تعلیمی اداروں کی اشتہار بازی کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ تعلیم اب کسی کمپنی میں تیار ہونے والی کوئی شئے ہے جس کی اشتہار بازی ہو رہی ہے۔ چنانچہ تعلیمی اداروں کی اس قدر تشہیر کو دیکھ کر وہ تعلیم کو کاروبار اور تجارت کا درجہ دیتے ہیں۔ لکھا ہے:

> ''تعلیمی اداروں کی اشتہار بازی کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اب تعلیم کاروبار اور تجارت کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ ہر کوئی گاہکوں کو رجھاتا نظر آتا ہے۔ میں نے اپنے احساس کا اظہار کیا تو میرے ایک دوست نے تائید کی۔ تم نے بہت صحیح اندازہ لگایا ہے۔ تعلیم ایک کاروبار بلکہ انڈسٹری ہے۔ پچھلے سال میں نے اپنے بچے کو اسکول میں داخل کرانے کے لیے تعلیمی ماہر سے مشورہ طلب کیا تو موصوف میری مالی حیثیت اور حالت کے بارے میں سوالات کرنے لگے کہ آپ کیا کام کرتے ہیں۔ آپ کی ماہانہ آمدنی کیا ہے۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ ان سے کسی اچھے اسکول کا نام اور پتہ دریافت کیا ہے۔ جہاں میرا بیٹا تعلیم حاصل کر سکے۔ موصوف نے جواب دیا میں یہی کر رہا ہوں پہلے میں آپ کی مالی حالت کا اندازہ کروں گا اور پھر اس حساب سے آپ کی پہنچ اور سکت میں موجود اسکولوں کی نشاندہی کروں گا''۔[2]

موجودہ دور کے تعلیمی اداوں سے والدین کو بہت سہولت ہوتی جا رہی ہے کہ بچوں کو قابل بنانے کے لئے انہیں اب زیادہ محنت درکار نہیں رہی بس ابتدائی دو سال بچہ کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ پھر بچہ کی دیکھ بھال اسکول والوں کی ذمہ داری ہے۔ اسکول میں داخلہ کے وقت اپنی خواہش کا اظہار کر دیجئے کہ آپ بچے کو

---

[1]۔ بات سے بات صفحہ 81 [2]۔بات سے بات صفحہ نمبر 85

کیا بنانا چاہتے ہیں۔آپ کی خواہش و استطاعت کے لحاظ سے تعلیمی ادارے ڈگریاں دلا دیتے ہیں۔فی زمانہ ہر والدین کی ڈاکٹر پہلی ترجیح ہے لیکن ماں باپ اپنی خواہش پوری کرنے کی دھن میں کبھی اپنی اولاد سے یہ تک نہیں پوچھتے کہ ان کی کیا خواہش ہے وہ کس طرح کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔بس اپنی خواہش کی تکمیل میں ہی لگے ہوئے ہیں۔رات دن تعلیم پر آنے والے خرچ کا حساب اور اپنی آمدنی کا حساب لگاتے رہتے ہیں۔عابد معز نے اپنے ایک کالم میں اپنے ایک ایسے دوست کا حال بیان کیا ہے جو اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانے کی خواہش رکھتے ہیں اور وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لئے کس قدر پریشان حال ہیں۔لکھتے ہیں۔

> ''ڈاکٹر بننے کی خواہش اور اسے پوری کرنے کی طویل اور مشکل ڈگر پر سوچ کے دوران میری نظر دوست کے پریشان حال چہرے اور ان کے اطراف میں بکھرے اور اڑتے کاغذات پر پڑی تو اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر بننے کے ساتھ ڈاکٹر بنانا بھی کچھ کم مشکل نہیں ہے۔کاغذات پر کئے گئے مختلف حسابات اور آنکڑوں کو دیکھ کر میں نے اپنے دوست سے کہا تم کو ڈاکٹر بنانا چاہتے ہو لیکن کاغذات پر حسابات دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ تمھارا ارادہ اسے انجینئر بنانے کا ہے۔یار میں ڈاکٹر بننے پر اٹھنے والے اخراجات کا تخمینہ کر رہا ہوں اور انھیں پورا کرنے کے لیئے اپنے وسائل کو ٹٹول رہا ہوں دس سے پچاس ساٹھ لاکھ روپیوں کا خرچہ بتایا جا رہا ہے''۔[1]

ڈاکٹر عابد معز اپنے کالموں میں تعلیم ،تعلیمی اداروں کے علاوہ طلبہ کی صورت حال سے بھی واقف کروایا ہے۔ان کا خیال ہے کہ آج کل کے بچوں کو پڑھانا پڑتا ہے۔وہ خود سے پڑھنے لکھنے کی طرف مائل نہیں ہوتے چنانچہ وہ کہتے ہیں:

> ''آج کل بچوں کو پڑھانا پڑ رہا ہے۔وہ خود سے لکھنے پڑھنے کی جانب کم ہی

---

[1] ۔ بات سے بات صفحہ نمبر 91

مائل ہیں۔ وہ دن ہوا ہوئے جب والدین بچوں کو لے کر مدرسہ یا پاٹھ شالہ جاتے اور استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کروا کے بےفکر ہو جاتے تھے۔شاگرد رشید تعلیم مکمل کر کے ہی علم کی چوکھٹ چھوڑتے تھے۔اب حالات مختلف ہیں۔ بچوں کو علم حصول کے لیے بٹھانا پڑتا ہے''۔[1]

عابد معز نے تعلیم کے ساتھ تعلیمی نتائج کی طرف قاری کی توجہ بھی مبذول کرائی ہے کہ ماضی میں نوے فیصد نشانات حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔کوئی بہت زیادہ محنتی اور غیر معمولی ذہانت رکھنے والے طالب علم وہاں تک پہنچ سکتے تھے۔لیکن آج کے اس دور میں نوے فیصد نشانات حاصل کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں رہی نتائج کی اس صورت حال پر عابد معز کا خیال ہے کہ صرف زاہد نشانات حاصل کرنا قابلیت کی دلیل نہیں ہو سکتی وہ لکھتے ہیں

''محسوس ہوتا ہے کہ نتیجہ کا ہر کام اب الٹ دیا گیا ہے۔ بہت سارے بچے پہلے درجہ میں آتے ہیں۔نوے فی صد سے زیادہ نشانات حاصل کرنا معمولی بلکہ معمول کی بات ہے۔ میں حیران ہوں کہ بچے اتنی آسانی سے کیسے آسمان چھورہے ہیں۔ ہمارے بچے ہیں اور ہم اپنے بچوں کو خوب جانتے ہیں۔ میں نے ایک طالب علم سے سوال کیا، بیٹا تم لوگ کیسے 95،90 فی صدی نشانات حاصل کر لیتے ہو؟ ہمارے زمانے میں 65،60 فی صد پر ہی سانس اکھڑنے لگتی تھی۔محنت اور ہوشیاری سے انکل۔نوجوان نے جواب دیا، ہم لوگ آپ سے زیادہ عقل مند، ذہن اور محنتی ہیں۔ جواب سن کر مجھے کسی دوسرے نوجوان سے یہ سوال کرنے کی ہمت نہ ہوئی اب میں انھیں کیا بتلاتا کہ ان کی تعلیم اور محنت کا نتیجہ صرف زائد اور بہت نشانات کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے جبکہ بچوں کو آگے تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان نشانات کی اہمیت نہیں ہے۔انھیں

---

[1]۔ بات سے بات صفحہ نمبر 93

مختلف انٹرنس امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے‘‘ ۔[1]

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دور کے تعلیمی ادارے، تعلیم فروخت کررہے ہیں اور لوگ اسے خریدنے پر مجبور ہیں۔

نئی نسل

عابد معز نے اپنے کالموں میں کئی بار نئی نسل کو موضوع بنایا ہے۔ یہ بات حقیقت ہے کہ پرانی نسل کا جو نقطہ وعروج تھا وہ نئی نسل کا نقطہ آغاز ہے۔اس لئے نئی نسل اور پرانی نسل کے درمیان خیالات اور طرز عمل میں خاصا اختلاف پایا جارہا ہے۔ عابد معز نے انہی اختلافات کو موضوع بنایا ہے اور نئی اور پرانی نسل کا تقابل کرتے ہوئے دونوں کے منفی اور مثبت پہلوں پر روشنی ڈالی ہے۔ جیسے ایک جگہ پرانی نسل کے پہلو بہ پہلو نئی نسل کے طرز زندگی کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ’’محسوس ہوتا ہے کہ ہماری سنتان غریب ماں باپ کے امیر بچے ہیں۔ ہم غریب بلکہ عجیب وغریب تھے۔ پانی پیتے تھے۔ ہمارے بچے ہمارے جیسے نہیں ہیں۔ وہ پانی نہیں پیتے، پیپسی اور کوک پیتے ہیں۔ ہم سے دو ہاتھ بلکہ ماں اور باپ کے چار ہاتھ ہی نہیں کئی ہاتھ آگے ہیں۔ میں نے اپنے دوست کو دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ مجھے ہاتھ پر باندھنے کے لئے گھڑی میٹرک درجہ اول پاس کرنے پر ملی تھی۔۔۔ میرا لڑکا دوسری یا تیسری جماعت میں تھا جب اسکول میں وقت دیکھنا سکھایا گیا تھا۔ وقت دیکھنا سیکھ کر اس نے گھڑی کا مطالبہ پیش کردیا ۔۔۔میری بپتا سن کر دوست نے کہا۔شکر کرو تمھارا بیٹا ابھی چھوٹا ہے تیاری کرلو دوایک سال بعد وہ ہر چھ ماہ میں نئے سیل فون کا مطالبہ کرے گا۔[2]

---

[1] ۔بات سے بات صفحہ نمبر 103

[2] ۔بات سے بات صفحہ نمبر 125

عابد معز نے نئی نسل کے شوق سے بھی قاری کو آ گاہ کیا ہے ان کے مطابق آج کی نئی نسل کو تعلیم دلانا ہے تو تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے شوق بھی پورے کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً آج کی نئی نسل کو اسکول یا کالج جانے کے لئے موٹر سائیکل کو لازمی قرار دیا جا رہا ہے جس کا بوجھ والدین پر پڑتا ہے۔ والدین نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی اولاد کی اس خواہش کو پوری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ نئی نسل کے خیالات وشوق پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''وقت بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ بات زیادہ پرانی نہیں ہے، صرف بیس پچیس سال پہلے کا ذکر ہے۔ بچے اسکول اور کالج اپنے پیروں پر جاتے تھے۔ پیدل چلنے یا سائیکل کے پیڈل مارتے ہوئے فاصلہ طئے کرتے تھے۔ اب ہمارے بچوں کو اسکول کالج جانے کے لیے کم از کم موٹر بائک چاہئے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یونیفارم کی طرح موٹر بائیک بھی ضروری ہے۔ بچے موٹر سائیکل کے کئی فائدے گناتے ہیں۔ وقت بچتا ہے اور فاضل وقت کو دوستوں کے ساتھ گزارا جا سکتا ہے۔ دماغ کو تازہ ہوا ملتی ہے۔۔۔ موٹر سائیکل سے ہونے والے نقصانات کا اندازہ ان کے غریب ماں باپ کو رہتا ہے جنہیں ہر ماہ موٹر بائیک کی قسط ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور پیٹرول کے نام پر ایک خطیر رقم لخت جگر کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔ اگر ماں باپ اتنا بھی نہ کریں تو بچوں کی تعلیم متاثر ہوتی ہے۔ مالی خسارے سے ہٹ کر اگر میں دوسرے نقصانات گنانے لگوں تو مجھ پر دقیانوسی outdatedold man کا لیبل چسپا کر دیا جائے گا۔ اسی لئے چپ رہنا بہتر ہے''۔ [1]

موٹر سائیکل کے بعد نئی نسل کا دوسرا اہم شوق سیل فون اور آئی پیڈ ہے۔ سیل فون اور آئی پیڈ کے اتنے عادی ہو چکے ہیں۔ کہ ان کے بنا یہ نئی نسل اپنے آپ کو نامکمل تصور کرتے ہیں۔ اور بے چین و پریشان

---

[1] ۔ بات سے بات۔ صفحہ: 126

سے رہنے لگتے ہیں۔ چنانچہ عابد معز نئی نسل کے اس شوق پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’سیل فون اور آئی پاڈ کے بغیر نوجوان بے چین پریشان اور گھبرائے ہوئے بھی رہتے ان سے کوئی کام نہیں ہوتا۔ کان میں اگر آئی پاڈ کے تار نہ لگے ہوں تو ان سے سیدھا چلا بھی نہیں جاتا۔ توازن نہیں رہتا، لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ نوجوانوں کا سیل فون اور آئی پاڈ پر انحصار دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تاروں سے جڑی رہنے والی نسل کی یہ پیدائشی ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اب بچے کی پیدائش کا رجسٹریشن کروانے کے ساتھ اس کے ایک سیل فون نمبر لینا بھی ضروری ہوجائے گا‘‘۔[1]

عابد معز نے نہ صرف نئی نسل کے شوق سے آگاہ کیا ہے بلکہ قارئین کی توجہ اس جانب مبذول کرائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نئی نسل سیل فون یا آئی پاڈ جیسی چیزوں میں مشغول ہوکر کتابوں سے دور ہوتی جارہی ہے وہ لکھتے ہیں:

> ’’تاروں سے جڑی نسل کتابوں سے دور بہت دور رہتی ہے۔ اس نسل کے پاس کاغذ نام کی چیز نظر نہیں آتی۔ ان سے کتابوں کا بوجھ اٹھایا نہیں جاتا۔ ان کے مطابق کاغذ اور کتابوں کا فیشن اب نہیں رہا۔ اگر کتابیں نیٹ پر ہوں تو بچوں کو ای کتابیں پڑھنے میں اعتراض نہیں ہے‘‘۔[2]

ٹیکنالوجی

عابد معز نے معاشرتی وسماجی زندگی کے ساتھ سائنس وٹکنالوجی پر بھی بے شمار کالم لکھے ہیں۔ سائنس وٹکنالوجی انسانی زندگی میں حائل مشکلات کو آسان سے آسان کرتی جارہی ہے۔ یہ ہر شعبہ حیات میں اپنا جادو دکھارہی ہے۔ کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیلی وژن یکس رے، ایم آر آئی، لیزر وغیرہ کی ٹیکنالوجی کو دیکھ کر عقل دنگ رہ

۱۔ بات سے بات صفحہ نمبر 128

۲۔ بات سے بات صفحہ نمبر 129

جاتی ہے۔اسی لئے ڈاکٹر عابد معز ہماری زندگی کو ہائی ٹیک زندگی کہتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ آج کا انسان ٹیکنالوجی سے متاثر ہوکر ہی انٹرنیٹ جیسی ٹیکنالوجی پر اپنے شب وروز کو منحصر کر رکھا ہے۔اگر انٹرنیٹ سروس متاثر ہوئی تو دنیا کا سارا کاروبار متاثر رہتا ہے۔غرض آج کا آدمی انٹرنیٹ کی ٹیکنالوجی کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ اس کے بنا اپنے شعبہ کے بھی مسائل حل کرنا گراں لگتا ہے۔عابد معز انٹرنیٹ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> انٹرنیٹ خدمات حاصل نہ ہونے سے احساس ہوا کہ ہم نیٹ کے کتنے عادی ہو چکے ہیں ۔وقفہ وقفہ سے فون کر کے دریافت کرتے رہے کہ نیٹ کب تک بحال ہونے والا ہے۔تا کہ ہم پھر سے جال میں پھنس جائیں اور ہمیں قرار آئے ۔اس بے چینی کو دیکھ کر میرے ایک جہاندیدہ دوست نے خوب تبصرہ کیا۔ ہر نئی ایجاد ہمیں عادی اور دیوانہ بنا رہی ہے۔ چند دنوں میں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم اس کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے! ۱

عابد معز کا خیال ہے کہ آج کا انسان اپنوں سے دور ہو رہا ہے۔وہ خونی اور سماجی رشتوں سے زیادہ کمپیوٹر انٹرنیٹ جیسے ہائی ٹیک ماحول سے جڑا ہوا ہے لکھتے ہیں۔

> ''اب ہر پڑھے لکھے شخص کے گلے میں کمپیوٹر لٹکتا اور ہر کس و نا کس کے ہاتھوں میں فون دکھائی دیتا ہے۔لوگ خونی سماجی رشتوں سے زیادہ فون اور کیبل سے جڑے ہوئے ہیں۔ایسے ہائی ٹیک ماحول میں ای میل سروس ہر کسی کی پسند بھی ہے اور ضرورت بھی''۔ ۲

آج کا انسان کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ سیل فون کا بھی اتنا ہی عادی ہو چکا ہے۔کہ ہر دم سیل فون سے لگا رہتا ہے۔بعض آدمی ایک نہیں دو دو فون رکھتے ہیں۔ عابد معز اپنے ایک کالم میں سیل فون کے استعمال پر

---

۱ بات سے بات صفحہ نمبر 206

۲ بات سے بات ص:145

اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ موبائل فون بجنا دورِ حاضر کی محفلوں کی شان ہے لکھتے ہیں۔

> ''وقفہ وقفہ سے موبائل فون بجنا دورِ حاضر کی محفلوں کی شان ہے۔ ماضی کی محفلوں میں باتوں کی آوازیں اور درمیان میں کھانسنے، چھینکنے یا کھنکھارنے کی آوازیں عجیب سی کیفیت پیدا کرتی تھیں لیکن اب سیل فون بج اُٹھنے سے محفلیں مترنم ہوگئی ہیں۔ وقفہ وقفہ سے گونجنے والی موبائل فون کی موسیقی ہمیں محظوظ کرتی رہتی ہے۔ [1]

عابد معز نے موبائل فون کی خصوصیات کے علاوہ اس کے نقصانات سے بھی قاری کو واقف کروایا ہے۔ جیسے ایک جگہ موبائیل فون کے نقصانات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''موبائیل فون کار کی چال چلن خراب کرنے، راستہ بھٹکانے اور اشارہ توڑنے کے علاوہ خطرناک حادثوں کا سبب بھی بنتا ہے۔ ماہرین نے بتایا ہے کہ گاڑی چلانا خود ایک خطرہ مول لینا ہے۔ اس پر موبائل فون پر بات کرتے ہوئے گاڑی چلانا دوہرا خطرہ ہے۔ اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ فون پر بات کرتے ڈرائیونگ کرنے سے حادثہ کے امکان میں چار گنا اضافہ ہوتا ہے۔ چار گنا خطرے کو کم کرنے کے لیے کئی ممالک میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے فون کرنا جرم ہے''۔ [2]

اسی طرح ٹیلی وزن کے نقصانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ٹیلی وزن کو موٹاپے کا سبب قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''لوگ گھنٹوں ٹیلی ویژن دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ ایسا کام ہے جس میں کوئی محنت درکار نہیں ہوتی اور ریاضت نہ کرنا موٹاپے کا ایک اہم سبب ہے .... ٹیلی ویژن پہلے لوگوں کو موٹا کرتا ہے۔ ان کا مذاق اڑاتا اور ان پر

---

[1] ۔ بات سے بات، ص: 154

[2] ۔ بات سے بات، ص: 161

دوسروں کو ہنسنے کا مواقع فراہم کرتا ہے۔ یہی نہیں پھر ٹیلی ویژن دبلا کرنے کے اشتہارات بتا کر خوب پیسے بٹورتا ہے''۔[1]

غذائیں

ڈاکٹر عابد معز نے روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والی غذاؤں، ترکاریوں، پھلوں اور دیگر اجناس کو بھی اپنے کالم کا موضوع بتایا ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والے اجناس میں دال ایک اہم اناج ہے۔ جو ویجیٹیرین اور نان ویجیٹیرین دونوں میں یکساں مقبول ہے اور دونوں اعتراض کئے بغیر اسے استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز سائنسی نقطہ نظر سے دال کی اہمیت وافادیت بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں

''ڈاکٹر حضرات بھی دال کے فائدے گناتے ہیں۔ پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ دال خوری سے برڈ فلو نہیں ہوتا۔ دال میں کولیسٹرال نہیں ہوتا۔ یہ دوسرا فائدہ ہے۔ تیسرا فائدہ یہ بتایا جاتا ہے کہ دال کولسٹرال کم کرتی ہے۔ کالیسٹرال کم ہوتے سے دل مضبوط ہوتا ہے۔ دال مہنگی ہوتے ہی مجھے پتہ چلا کہ دال، مقوی قلب بھی ہوتی ہے۔ دال کھانے کا چوتھا فائدہ یہ ہے کہ لوگ دور ہوتے ہیں۔ احباب قریب بیٹھنے سے کتراتے ہیں۔ ویسے مستقل دال کھانے کی عادت پڑ جائے تو لوگ اس فائدے سے محروم ہو جاتے ہیں اور وہ آسانی سے دال ہضم کرنے لگتے ہیں۔ وہ کتنی بھی دال کھائیں لوگوں کو فرق نہیں پڑتا۔ یہ دال استعمال کرنے کا پانچواں فائدہ ہے''۔ [2]

اسی طرح ٹماٹر کے فائدوں سے اپنے قاری کو اس طرح آگاہ کراتے ہوئے اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں۔

ٹماٹر اس لئے بھی پسند ہے کہ وہ صحت کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک مرتبہ

---

[1] ۔بات سے بات، ص:141

[2] ۔''دال مرغی برابر'' پھر چھڑی بات۔اعتماد۔بتاریخ۔17/جولائی2006ء

میں نے ڈاکٹر سے ٹماٹر کو رغبت سے کھانے کے متعلق دریافت کیا تھا۔ڈاکٹر نے فرمایا تھا شوق سے ٹماٹر کھایئے۔ٹماٹر میں وٹامن اے،سی کے اور معدنیات ہوتے ہیں۔ان کے ساتھ رنگین مادے بھی پائے جاتے ہیں۔جو ہماری صحت کی حفاظت کرتے ہیں اور یہ مادے بالخصوص کینسر اور دل کے امراض کے خلاف کارگر ہوتے ہیں۔ڈاکٹر کی صحت بخش اور امید افزا باتیں سن کر اس دن میں نے دو چار ٹماٹر زیادہ کھائے تھے۔اس معاملے میں سیب غیر ضروری شہرت پا گیا ہے۔سیب سے زیادہ فائدہ مجھے ٹماٹر میں نظر آتا ہے۔اسی لئے میں ٹماٹر کو غریب آدمی کا سیب قرار دیتا اور نعرہ لگاتا ہوں کہ ہر دن ٹماٹر کھائیں اور ڈاکٹر دور بھگائیں۔[1]

انسانی فطرت:۔

عابد معز نے جہاں سماجی، معاشرتی، سائنس وٹکنالوجی وانسانی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو اپنے کالموں کا موضوع بنایا ہے وہیں انھوں نے انسانی فطرت پر بھی قلم اٹھایا ہے۔انسانی فطرت ایک وسیع موضوع ہے اس کے ان گنت پہلو ہیں،اس پر بہت کچھ لکھا گیا تحقیق کی گئی اور اب بھی جاری ہے۔پھر بھی یہ موضوع نامکمل ہی رہا ہے۔ڈاکٹر عابد معز نے اپنے کالموں میں انسانی فطرت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنے قاری کو انسان کی فطرت کو سمجھنے کی دعوت دی ہے۔جیسے غائب دماغی نیند،حرس عجلت، وغیرہ انسانی فطرت کے بارے میں غائب دماغی کو ذہین اور دانش مند لوگوں کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔عابد معز اپنے ایک کالم میں غائب دماغی فطرت کی حقیقت کو یوں عیاں کیا ہے لکھتے ہیں:

> ”کہتے ہیں کہ غائب دماغی ذہین اور دانش ور ہونے کی نشانی ہے۔خوشی ہوئی کہ چند باتیں بھول کر ذہین ہونے کا خطاب حاصل کر سکتے ہیں۔ان افراد کا

---

[1] بات سے بات صفحہ 168

دماغ علمی گتھیاں سلجھانے میں مصروف رہتا ہے۔اس لیے وہ غائب دماغ یا عرف عام میں ''بھلکڑ'' بن جاتے ہیں۔وہ کام میں اتنے محو رہتے ہیں کہ انہیں اپنی سدھ بدھ نہیں رہتی''۔[1]

عابد معز نے نہ صرف غائب دماغی کی حقیقت کو عیاں کیا ہے بلکہ غائب دماغی کی وجہ سے لوگ کس طرح فائدے اور نقصانات سے دوچار ہوتے ہیں۔اس فطرت سے بھی اپنے قاری کو آگاہ کیا ہے ملاحظہ کیجیے:

''غائب دماغی دودھاری تلوار ہے۔اس سے نفع اور نقصان دونوں ہو سکتے ہیں۔غائب دماغی سے چھتری مفت ہاتھ لگتی ہے۔زمانۂ قدیم سے اس اہم فائدے کو گنایا جاتا ہے۔غائب دماغ حضرات دوسروں کی چیز کو اپنی سمجھ کر اٹھا بھی لیتے ہیں۔بھولے سے دوچار مرتبہ کھا لیتے ہیں۔دکان سے بل دینا بھول کر اشیا اٹھا لاتے ہیں۔دوسروں کے گھر کو اپنا سمجھ کر کئی دنوں تک مہمان بنے رہتے ہیں۔ان فوائد کے برخلاف غائب دماغی سے نقصان بھی ہوسکتا ہے۔بل ادا کر کے بقیہ پیسے لینا بھول جاتے ہیں۔کرایہ ایک سے زیادہ مرتبہ ادا کرتے ہیں۔دومرتبہ ٹکٹ لے کر سفر کرتے ہیں دوائی دو تین مرتبہ لیتے ہیں''۔ [2]

انسانی فطرت میں نیند یا سونا ایک اہم فرضی حصہ ہے۔انسانی ضرورت میں نیند سب سے زیادہ طاقتور سمجھی جاتی ہے۔بہادر انسان بھی نیند سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔ویسے تو نیند کا ایک معین وقت ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار یہ ایسے مقامات پر آجاتی ہے جہاں اس کو نہیں آنا چاہئے جس کی وجہ سے کئی ایک مسائل پیدا ہوسکتے ہیں۔چنانچہ ڈاکٹر عابد معز نے اس مسئلہ پر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ماہرین کہتے ہیں کہ انسانی ضروریات میں سب سے زیادہ طاقتور اور توجہ طلب ضرورت نیند ہے۔کوئی نیند سے مقابلہ نہیں کرسکتا............ نیند کہیں بھی

---

[1] ۔بات سے بات،ص:182

[2] ۔بات سے بات،ص:182

انسان کو زیر کر سکتی ہے۔ وہ کہیں بھی آ سکتی ہے۔ بعض مرتبہ وہ ایسے مقامات اور وقت پر آتی ہے جہاں اسے نہیں آنا چاہیے۔ اہم مسئلہ پر بات ہو رہی ہے اور نیند ہے کہ اپنی آغوش میں لینا چاہتی ہے۔ بڑی خفت ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ رات تمام پڑھائی کی اور صبح امتحان ہال میں نیند نے دبوچ لیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ نیند پوری کر کے اگلے امتحان میں قسمت آزمانا پڑتا ہے۔ گاڑی چلا رہے تھے اور نیند نے آنکھیں بند اور دماغ ماؤف کر دیا۔ کچھ دیکھا اور نہ ہی کیا جا سکتا ہے کہ پھر کیا ہوا''۔ [1]

انسانی فطرت کا ایک اور پہلو 'حرص' ہے انسان چاہئے کتنی ہی اطمینان بخش زندگی گزارے لیکن اس کی 'حرص' کم نہیں ہوتی۔ فی زمانہ پیسہ کمانے کی حرص میں بڑوں کے ساتھ بچے بھی شامل ہو رہے ہیں۔ عابد معز اپنے ایک کالم میں 'حرص' پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''زندگی گزارنے کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اور صدیوں سے لوگ پیسہ کماتے اور زندگی گزارتے چلے آ رہے ہیں۔ جس طرح جیتے جیتے زندگی سے عشق ہو جاتا ہے اسی طرح کماتے کماتے لوگوں کو پیسے سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقت کے ساتھ یہ محبت اور عشق پختہ اور کہنہ ہونے لگتا ہے۔ دور حاضر میں پیسے سے عشق نہ صرف کہنہ اور پختہ بلکہ لا علاج بھی ہو گیا ہے۔ لوگ بے شمار دولت اکٹھی کرنا چاہتے ہیں۔ بچہ بچہ تک دولت مند بننے کے خواب دیکھا کرتا ہے۔ میں نے ایک لڑکے سے جس نے اسکول جانا شروع کیا تھا، پوچھا۔ بیٹا۔ بڑے ہو کر تم کیا بننا پسند کرو گے؟''۔ لڑکے نے جواب دیا۔ ''انکل۔ بڑا ہو کر میں دولت مند بننا چاہتا ہوں پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے پاس اتنے پیسے ہوں اور میرا نام دولت مند ترین لوگوں کی فہرست میں آئے''۔ [2]

---

[1] ۔ بات سے بات، ص:183　　[2] ۔ بات سے بات، ص:192

دور حاضر میں انسان کی فطرت میں سب سے زیادہ سامنے آنے والا پہلو 'عجلت پسندی' بھی ہے۔ انسان کے پاس صبر کا مادہ اب دھیرے دھیرے ختم ہوتا جا رہا ہے۔اس کی جگہ عجلت نے لے لی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عجلت پسندی انسان کی زندگی میں اکثر مسائل پیدا کرتی ہیں۔لیکن پھر بھی لوگ اپنی فطرت میں عجلت پسندی کے عنصر کو کم نہیں کرتے ۔ڈاکٹر عابد معز ایک جگہ عجلت سے ہونے نقصانات کا محاسبہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''لوگوں کو جلدی میں ہونے اور زمانے کی تیزی دیکھنا ہے تو ذرا گھر سے باہر نکل کر دیکھئے اندازہ ہوجائے گا سڑک پر ہر کوئی جلدی میں دوڑے چلا جا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کے راستے میں نہ آئے اس لیے کہ وہ جلدی میں ہے۔ اگر سامنے آتا ہے تو ہارن چیخ پڑتا ہے ہم بخوبی جانتے ہیں کہ تیز چلانا خطرناک ہے۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ جرمانہ ہوسکتا ہے۔ حادثہ ہوسکتا ہے یا بال بال بچ سکتے ہیں۔اس کے باوجود ہم تیز دوڑتے ہیں، کیونکہ ہم جلدی میں ہوتے ہیں جلدی میں رہنے اور تیز دوڑنے کا نتیجہ اس صورت میں نکلتا ہے کہ ٹریفک سست ہوجاتی ہے اور سب کو دیر بھی۔ جب دیر ہوتی ہے تو ہم اور جلد میں ہوتے ہیں''۔ [1]

الغرض عابد معز کی کالم نگاری کے مذکورہ ،موضوعات کے مطالعہ کے بعد ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عابد معز نے نہ صرف سماجی ، معاشرتی زندگی کے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے بلکہ انھوں نے سائنس و ٹیکنالوجی کی ایجادات کے علاوہ مختلف امراض، انسان کی صحت ، غذائیں، انسانی فطرت وغیرہ پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

عابد معز جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس موضوع کے ماضی، حال اور مستقبل سبھی پہلوں پر

---

[1] ۔بات سے بات،ص:195

روشنی ڈالتے ہوئے اپنے قارئین کی معلومات میں اضافہ کرتے جاتے ہیں، یہ ایک کامیاب کالم نگار کی خوبی ہے۔اس کے علاوہ جب وہ کسی موضوع کے تمام پہلو پر اس تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں کہ اس کا قاری خود اس موضوع پر اپنی رائے قائم کرتا ہے وہ کسی بھی موضوع پر کھلے ذہن سے بے باگ لب ولہجہ میں گفتگو کرتے ہیں۔

عابد معز کے کالموں کا اسلوب سادہ اور سنجیدہ ہونے کہ ساتھ ظریفانہ بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے کالموں میں ضرورت کے مطابق جب ظریفانہ اسلوب اختیار کرتے ہیں تو شائستگی کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ان کے ظریفانہ اسلوب میں پھکڑ پن کا عنصر کہیں نہیں ہوتا،ان کے کالم کی زبان نہایت پر لطف ہوتی ہے وہ اپنی بات کو سمجھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے واقعات وفرضی کردار کا استعمال کرتے ہیں۔ ایسے چٹخارے جملے استعمال کرتے ہیں کہ قاری زیر لب مسکراتے ہوئے ان کے کالم کا مطالعہ کرتا ہے یہی نہیں بلکہ باتوں باتوں میں وہ اپنے قاری کو متعلقہ موضوع پر غور وفکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔غرض عابد معز کے کالموں کی من جملہ خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر بیگ احساس لکھتے ہیں۔

> ''ڈاکٹر عابد معز ایک سنجیدہ کالم نگار ہیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے فکاہیہ کالم لکھتے ہیں۔انھوں نے اپنے کالم کا عنوان بھی مخدوم کے مصرعہ پر لکھا ہے۔عابد معز کا کالم بہت جلد ادبی وصحافتی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔اس مقبولیت کی وجہ موضوعات کا تنوع ہے۔علاقائی،قومی، بین الاقوامی مسائل سے ان کی واقفیت وباخبری انہیں دوسروں سے منفرد بناتی ہے۔وہ کسی نہ کسی واقعے یا خبر کو موضوع بنا کر ایسی ایسی معلومات فراہم کرتے ہیں جس سے اردو کا قاری اکثر بے خبر ہوتا ہے۔قاری کا منہ قہقہہ کی وجہ سے نہیں بلکہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔[1]

---

[1] ماہنامہ شگوفہ۔عابد معز نمبر نومبر 2008ء صفحہ نمبر 91

عابد معز بحیثیت افسانہ نگار

افسانے کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ اسے کم وقت میں پڑھا اور سنایا جا سکتا ہے اور اس سے خوب محظوظ ہوا جا سکتا ہے اس میں کسی نہ کسی صورت میں کوئی پیغام چھپا رہتا ہے۔ افسانے کا ایک اہم پہلو موضوع ہے۔ کائنات میں افسانہ نگار کے لیے موضوعات بکھرے پڑے ہوئے ہیں مثلاً مظاہر قدرت، خدا کی بنائی ہوئی ساری مخلوقات، انسانی جذبات واحساسات، دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات، نفسیاتی الجھنیں، تہذیبی و معاشرتی اور ثقافتی محرکات وغیرہ۔ ڈاکٹر عابد معز کے افسانے بھی مذکورہ موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کے افسانوں کے چند نمائندہ موضوعات انسانی جذبات، سماج کی خامیاں وخوبیاں، زندگی کی تلخ حقیقتیں، رشتوں کے باہمی تعلقات، محبت، نفرت، عداوت، حسد جلن، غلط فہمیاں وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے سائنسی ایجادات اور طبی مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان تمام موضوعات پر انہوں نے ظریفانہ اسلوب کے ذریعہ روشنی ڈالی ہے۔ جناب رفیق جعفر نے عابد معز کے افسانوں کے موضوعات کے تعلق سے ''عرض کیا ہے'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''ان افسانوں میں طنز بھی ہے، مزاح بھی ہے، شوخی بھی ہے، شرارت بھی ہے، دلچسپی بھی ہے اور تجسس بھی ہے، افسانوں کے فن میں جو نکات اور اصول ہوتے ہیں وہ ان افسانوں میں ملتے ہیں کم کرداروں سے افسانوں کے تانے بانے بنے گئے ہیں۔ زبان شگفتہ اور دل پذیر ہے۔ اختتام پر قاری خوشگوار احساس کا لطف لیتا ہے کتاب میں شامل افسانے مختلف رسائل واخبارات میں طنز ومزاح کے زمرے میں شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کے انتخاب میں وہی تحریریں لی گئی ہیں جو کہانی کی چاشنی رکھتی ہیں''۔ [1]

---

[1] ۔عرض کیا ہے۔ زندگی کے شگفتہ رنگوں کا افسانوی چتر کار عابد معز 10،9۔25 / جولائی 2011ء

دور حاضر کو ہم سائنسی دور بھی کہہ سکتے ہیں۔ جہاں ہر کام مشینوں سے لیا جارہا ہے، کمپیوٹر بھی ایک اہم مشین ہے۔ کمپیوٹر کی ایجاد نے انسانی زندگی میں بہت بڑا انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اس کی بدولت آج دنیا ایک گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ حیات میں اس کی ضرورت نا قابل یقین حد تک بڑھتی جارہی ہے۔ آج ہم اس کے بغیر رہ نہیں سکتے، خواہ دفتر کا معاملہ ہو کہ گھر کا کوئی معمولی کام، گویا کمپیوٹر ہمارے لیے انتہائی ضروری ہو گیا ہے جتنا کہ زندہ رہنے کے لیے سانس لینا، چنانچہ عابد معز نے اپنے ایک افسانہ ''پی سی'' کے عنوان سے کمپیوٹر کو موضوع بنایا ہے اس افسانے میں دو خواتین کے مرکزی کردار ہیں، ایک دولت مند خاتون کے پاس کمپیوٹر ہے دوسری کے پاس نہیں ہے لیکن وہ بھی اپنے شوہر کو کمپیوٹر کی ضرورت کا احساس اس طرح دلاتی ہے:

> ''وہ بتارہی تھیں کہ ان کا سسٹم ڈاؤن ہے، صبح سے ان کے گھر میں زندگی جام ہے۔ فریج۔ ٹی وی۔ فون۔ انٹرکام، اے سی، ککر، مکسر، مائکروا وون۔ گھڑی الارم۔ غرض گھر کی ہر شئے پی سی سے مربوط ہے۔ سی ڈی لے کر آئی تھیں کہ ہمارے پی سی میں ڈال کر Maintnance والو کو آن لائن اطلاع کر سکیں۔ پھر کیا آپ نے ان کی مدد کی۔ اتنا پوچھنا تھا کہ بیگم پھٹ پڑیں۔ مدد کہاں سے کرتی؟ پی سی ہے کہاں؟ شرمندہ ہونا پڑا۔ شادی کے وقت نگوڑا پی سی عام نہ تھا ورنہ جہیز میں لے آتی، کتنی مرتبہ کہا ہے کہ پی سی خریدیں گے لیکن جناب کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، مہارانی تعجب کا اظہار کر رہی تھیں کہ ہم لوگ پی سی کے بغیر کیسے جی رہے ہیں''۔ [1]

ہمارے معاشرے میں فضول خرچی ایک ایسا معمہ ہے جسے سلجھانے پر اُلجھتا ہی جاتا ہے۔ امیر لوگ مال وزر، کی بدولت ضروری اور غیر ضروری اشیاء خرید کر غریبوں کو قرون وسطیٰ کے باشندے سمجھتے ہیں۔ دور حاضر میں متوسط طبقہ کے لوگ امیروں کی ہو بہو نقل اتارنے میں پیچھے نہیں ہیں فضول خرچی کے معاملے میں

---

[1] ۔ پی سی۔ عرض کیا ہے۔ ص:14

وہ امیروں سے آگے نظر آتے ہیں، جب کہ ان کے معاشی حالات ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ سماج میں فضول خرچی اور دکھاوے کے عناصر کو عابد معز نے اپنے ایک افسانہ ''شریک زندگی'' میں کار کے حوالے سے متوسط طبقہ کی فضول خرچی کو یوں گرفت میں لیا ہے:

''عرصہ سے بیگم کا اصرار تھا کہ ہمیں بے کار سے با کار ہونا چاہیے مختلف بہانے کر کے میں ٹالتا رہا کبھی انہیں سمجھایا۔ ہمیں کار کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ بچوں کا اسکول قریب ہے وہ کھیلتے کودتے اسکول جاتے اور آتے ہیں۔ میں دفتر بس میں جاتا ہوں۔ کہیں باہر جانے کے لیے ٹیکسی مل جاتی ہے اور پھر صاحب کار دوست احباب ہماری مدد کے لیے ہر دم تیار رہتے ہیں۔ خدا انہیں حادثوں سے محفوظ رکھے۔

بیگم نے تلخ لہجہ میں جواب دیا'' آمین''۔ مگر آپ کو کیا پتا! آپ کی مدد کرنے والے دوستوں کی بیویاں، کار نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں بے کار اور بے وقعت سمجھتی ہیں۔ کل ہی آپ کے ڈاکٹر دوست کی بیوی کار کے سفر کا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ انہیں بغیر کار زندگی گذارنے والے لوگ قرون وسطیٰ کے باشندے لگتے ہیں۔ جنہیں آج کی ترقی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا''۔

.... میں خاموش ہوا تو بیگم کہنے لگیں۔ کار رکھنے سے ہماری حیثیت میں اضافہ ہوگا۔ کار والوں کی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ شاندار اور نئی کار کو لوگ مرعوب ہو کر دیکھتے ہیں۔ بعض تو سلام بھی کرتے ہیں۔ بچے کار کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ لوگ کار کے قریب جانے سے ڈرتے ہیں۔ کیا پتا کب اوپر آ جائے۔ کار میں بیٹھنے والے کی عزت کی جاتی ہے۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ کار میں کون بیٹھا ہے۔ اگر یہی کار نشین پیدل چلے تو اسے کوئی پوچھتا نہیں............!''۔ [1]

لو لیٹر عابد معز کا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ جس میں ایک طرف بے تکی خواہشات ہیں تو دوسری

---

[1] ۔شریک زندگی۔عرض کیا ہے،ص:24-23

طرف بے چینی بے قراری ہے۔

افسانے کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ شادی کے دس سال بعد بیوی اپنے شوہر کو ''محبت نامہ''، ''عشقیہ خط'' لکھنے کا اصرار کر بیٹھتی ہے۔اس بے تکی فرمائش سے خوش گوار ازدواجی زندگی میں مختلف مسائل جنم لیتے ہیں۔ایک کو سلجھائے جائیں تو دوسرا جنم لیتا ہے۔عشقیہ خط نہ لکھنے پر بیوی روٹھ کر میکے چلے جاتی ہے تب شوہر اپنی اٹوٹ اور بے پناہ محبت کا یقین دلانے کے لیے مجبوراً اپنے دوست کی مدد سے عشقیہ خط تو لکھتا ہے لیکن اسے اوٹ پٹانگ بکواس سمجھ کر پوسٹ کرنے کے بجائے الماری میں رکھ دیتا ہے۔اسی شام بیگم بچوں سمیت واپس آجاتی ہے یہ ''محبت نامہ'' کچھ دنوں بعد بیگم کے ہاتھ لگتا ہے جس کے سبب خوش گوار زندگی میں غلط فہمی اور شک پیدا ہوتا ہے،اس افسانہ سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''دو چار دن آرام سے گزرے۔بیگم نے ضرورت سے زیادہ میرا خیال رکھا۔خوب کھلایا پلایا کہ ان کی غیر موجودگی میں میری صحت متاثر ہوئی ہے۔بغیر لو لیٹر انہیں میری چاہت کا یقین ہو چلا تھا۔

لیکن ایک شام جب میں دفتر سے گھر آیا تو بیگم کو غصے میں ٹہلتا ہوا پایا۔ مجھے دیکھتے ہی برس پڑیں۔مل آئے اپنی جان آرزو سے! پڑ گئی کلیجے میں چودھویں چاند کی ٹھنڈک؟ میں حیران ہوا۔یہ کیا کہہ رہی ہو۔میں کس سے مل آیا۔اسی جل ککڑی سے جو میرا گھر برباد کرنے پر تلی ہے۔جس کی وجہ سے جناب کو دن میں چین ہے اور نہ رات کو آرام ملتا ہے۔کھانے میں لطف آتا ہے نہ بھوک لگتی ہے۔ جس کی دلکشی کے آگے چاند تارے بھی ماند پڑتے ہیں اور جس کی جھیل سی گہری آنکھوں میں جناب کا ڈوب جانے کو دل چاہتا ہے۔ارے میں تو کہتی ہوں ڈوب مرو کسی اصلی جھیل یا تالاب میں یا پھر مجھے ہی جھونک آؤ۔

میں ہکلایا۔میں سمجھا نہیں۔

ناسمجھ تو میں ہوں۔کیسے بھولے بنتے ہیں۔میرے لیے چار حرف لکھے نہیں

گئے۔کبھی بھولے سے ایک مصرع بھی نہ کہا۔اس کے لیے صفحوں کے صفحے کالے ہورہے ہیں۔شاعری ہورہی ہے۔اس کی صورت چاند تاروں اور کہکشاں میں نظر آرہی ہے۔جدائی پریشان کرتی ہے۔وہ آپ کا اور آپ اس کا انتظار کررہے ہیں۔کیوں کہ انتظار محبت ہے۔مزید انتظار نہ کیجئے۔دبادیجئے میرا گلا اور بچوں کو زہر پلادیجئے۔ہم سب سے چھٹکارا مل جائے گا۔محبت کے راستے کی رکاوٹیں دور ہوجائیں گی۔پھر لے آئیے اس حرافہ کو۔بیگم باقاعدہ رونے لگیں۔

میں کچھ دیر ہنستا رہا اور پھر معاملہ کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے سلجھانے کی کوشش کی۔بیگم وہ لولیٹر میں نے تمہارے لیے اور تمہارے ہی کہنے پر لکھا تھا۔میری قسم ....!تمہاری قسم...........اپنے بچوں کی قسم...........یقین نہ کرتے ہوئے بیگم نے سوال کیا۔بتلائیے! کیا میرا قد سروجیسا ہے؟ (بیگم کا قد درمیانے سے کچھ کم ہے) کیا میرے بال گھٹاؤں کی طرح ہیں؟ (بیگم پابندی سے گیسوتر شواتی ہیں)اور میری طرف غور سے دیکھ کر بتائیے کہ مسکرانے پر کون سے گال میں گڑھا پڑتا ہے؟ کس پیڑ کے نیچے کب اور کہاں میں نے آپ کے ہاتھوں پر آنسو ٹپکائے ہیں؟ ہائے میری قسمت پھوٹ گئی بیگم کا رونا جاری رہا۔[1]

محبت نامہ دو چاہنے والوں کے درمیان تحفے سے زیادہ انمول قیمت رکھتا ہے، کیونکہ یہ عشق کو پروان چڑھاتا ہے بے چین و بے قرار دل کو قرار پہنچاتا ہے۔اس کے ذریعہ عاشق ومعشوق منزل کی جانب سفر کرتے ہیں۔دوران سفر خواب بھی دیکھتے ہیں، اپنے خوابوں کی تعبیر اپنے محبوب کے لکھے ہوئے جملوں سے معلوم کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ بیشتر اوقات عشاق کے ہاں معاشرہ وسماج کا بندھن گراں لگتا ہے۔اس لیے وہ ان کا مذاق اڑاتے ہوئے جو دل میں آئے لکھ دیا کرتے ہیں۔

عشقیہ خط ایک عاشق کے بجائے اگر کوئی عام انسان بھی اپنی بیوی کے لیے ہی لکھ دے تو بھی وہ

---

[1] ۔لولیٹر۔عرض کیا ہے۔ص:40-41

غلط فہمی اور شک کی دیوار کھڑا کرسکتا ہے۔افسانہ ’’عاشقوں کی عید‘‘ میں ایک قدامت پسند شوہر دور جدید کے کارڈ کلچر سے متاثر ہو کر شادی کے بیس سال بعد ویلنٹائین ڈے پر اپنی بیوی کو محبت نامہ لکھنے کی غلطی کر بیٹھتا ہے۔شوہر کے اس غیر متوقع اظہار کے سبب بیوی اور شوہر کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔اس سچویشن کو عابد معز نے اس طرح پیش کیا ہے:

’’کارڈ کھولتے ہی موسیقی بجنے لگی۔بیگم گھبرا گئیں۔ہاتھوں سے کارڈ چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔چند لمحے بیگم گم صم رہیں۔پھر انہوں نے اپنے کو سنبھالا۔فرش سے کارڈ اٹھا کر پڑھنے لگیں۔چہرے پر خوشی اور شرم وحیا کا رنگ چھانے کے بجائے غصہ کی سرخی ابھرنے لگی اور پھر غصہ سے لال پیلی ہوتے ہوئے انہوں نے فرمایا لفنگا............! لچا............ بدمعاش ....بیگم نے کارڈ میری جانب بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔کسی بدمعاش اور آوارہ شخص نے یہ کارڈ بھیجا ہے۔

کیا مطلب، کون بدمعاش ، کون آوارہ ۔ میں نے کارڈ کو ہاتھ نہ لگاتے ہوئے استفسار کیا۔کسی نے آپ کے نام سے مجھے محبت بھرا کارڈ بھیجا ہے ۔ معلوم کرنا پڑے گا کہ کس نے ایسی اوچھی حرکت کی ہے؟ بیگم نے وضاحت کی۔آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں، ہوسکتا ہے کہ کارڈ میں نے ہی بھیجا ہو۔میں نے حقیقت کی جانب اشارہ کیا۔

نہیں آپ ایسا نہیں کر سکتے یہ حرکت کسی پاکھنڈی نے کی ہے۔بیگم نے مجھے ایک نئے خطاب سے نوازا۔بھلا میں آپ کو کارڈ کیوں نہیں بھیج سکتا؟

اس لیے کہ آپ نے ایسا پہلے کبھی نہیں کیا۔یہ ایک آسان جواب ہے۔اس کے علاوہ کارڈ کلچر ہمارے یہاں رائج نہیں ہے۔میں آپ کو اچھی طرح سے جانتی ہوں، آپ نمائش اور نمو کے حامی نہیں ہیں‘‘۔ [1]

---

[1] ۔عاشقوں کی عید۔یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ص:25-26

عابد معز کی تحریروں میں مزاح کا تناسب طنز کی بہ نسبت زیادہ ہے اور ان کی بہت سی تحریریں معاشرتی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ افسانہ کر بہ کشتن میں زندگی کی تلخ حقیقت کو مزاح کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔

شادی کے ابتدائی چند دن نو بیاہتا جوڑے (دولہا دلھن) کے لیے ایک دوسرے کو سمجھنے میں فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ ایسے نازک موڑ پر ہمارے بعض بزرگ اور دوست احباب نو بیاہتا جوڑے کو اپنے دانشورانہ مشوروں کے ذریعہ زیادہ نفسیاتی الجھنوں سے دوچار کر دیتے ہیں۔ دولہے کے دوست احباب کے مشوروں کو موضوع بنا کر وہ لکھتے ہیں:

> ''پہلی ملاقات میں ایسا تاثر چھوڑو کہ بیوی چرن داسی بن جائے۔ بیوی کو اپنی پسند کے سانچے میں ڈھال لو۔ سلام کے جواب میں خاموش رہو یا اشارے سے جواب دو اور اطمینان سے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ جوتے نکال کر ایک اِدھر اور ایک اُدھر اُچھال دو۔ شیروانی اتار کر کرسی پر ڈال دو۔ ایک شان بے نیازی کا مظاہرہ کرو اور گفتگو کے دوران وہ جو کہے اس کا الٹا جواب دو۔ وہ کہے کہ مجھے چائے پسند ہے تو تم کہنا چائے گنوار پیتے ہیں۔ دیر سے گھر پہنچو تاکہ شروع ہی سے صبر کرنے کی عادت پڑے۔ اپنی سلیقہ مندی چھوڑ دو۔ بیوی کے سلیقہ کا امتحان لو۔ چیزیں اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے رکھو۔ بھائجو نے بھی چند مشورے دیئے۔
>
> ......یہی ابتدائی چند دن اہم اور فیصلہ کن ہیں۔ ہمت نہ ہارنا، مقابلے پر ڈٹے رہو، مخالف پارٹی ہار مان کر اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دے گی۔ پھر بچو عیش کرنا اور مجھے دعائیں دینا۔[1]

دوسری جانب دُلہن کے رشتہ دار بھی دُلہن کو کچھ اس طرح مشورے دیتے ہیں:

---

[1] کر بہ کشتن، یہ نہ تھی ہماری قسمت، ص نمبر 174-170

بھائجو نے ہمیں کھانا کھلایا اور رات دیر گئے تک اپنے پاس روکے رکھا۔ ہم گھر پہنچے تو بیوی کو انتظار میں روٹھا ہوا پایا۔ وہ ہمیں دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

............گھڑی کچھ دیر اور ٹک ٹک کرتی رہی۔ پھر بیوی ہی نے خاموشی توڑی اور بھاری آواز میں کہا۔ مجھے بھوک لگی ہے۔

ہم نے کہا۔ پھر آپ کھاتی کیوں نہیں۔؟

بیوی کے آنسو چھلک پڑے۔ آپ مناتے کیوں نہیں۔ خالہ بی نے ...... بیوی آنسو پونچھنے کے لیے رُکیں تو ہم چونک پڑے............خالہ بی......خالہ بی نے کیا کہا تھا؟۔

بیوی نے اپنی کہانی سنائی۔ خالہ بی نے مشورہ دیا کہ پہلے دن ہی سے آپ کو گانٹھ کر رکھوں۔ ڈھیلی ڈوری نہ چھوڑوں۔ آپ مرد حضرات بڑے بے بھروسے ہوتے ہیں۔ خالہ بی نے کہا کہ میں جھوٹ موٹ جھگڑا کر کے روٹھ جاؤں۔ آپ منالیں گے لیکن خالہ بی کے مشورے اثر ہی نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس خالہ بی کے مشوروں کا توڑ بھائجو جو موجود ہیں۔ ہم نے جواب دیا''۔ [1]

بیشتر افسانہ نگاروں نے خواہ مرد ہو کہ عورت اپنے فن پاروں میں عورت کو مظلوم بے کس و مجبور ہی دکھایا ہے، لیکن ڈاکٹر عابد معز کی انفرادیت ہے کہ ان کے مزاحیہ افسانوں میں مرد عورت سے زیادہ مظلوم بے بس و مجبور اور وقت و حالات کا مارا نظر آتا ہے۔ وہ خود کو مٹا کر اپنی شریک حیات کی ہزاروں بے تکی خواہشات و ارمانوں کو پورا کرنے میں مصروف ہے۔ یہ بات ان کے لو لیٹر، فرنٹ ویل ڈرائیور، داستان معرکتہ الذوجہ وغیرہ میں نظر آتی ہے۔ ان افسانوں سے چند اقتباس ملاحظہ کیجیے جن میں خواتین کی بے تکی خواہشات کو موضوع بنایا ہے لکھتے ہیں:

---

[1] ۔ گربہ کشتن۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ ص:,174-175

''ماحول کا اثر تھا یا موقع ہاتھ آ گیا۔ اچانک بیگم نے شکایت کی۔ آپ نے مجھے کبھی لو لیٹر نہیں لکھا۔

بیگم نے لو لیٹر نہ تحریر کرنے کے سبب کا الٹا نتیجہ اخذ کیا۔

صاف لفظوں میں کہیے نا۔ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ بزرگوں نے شادی کی۔ سو نباہ رہا ہوں۔

میں نے اپنا سر پیٹ لینا چاہا لیکن باز رہا۔ کہیں اس فعل کا کوئی اور مطلب نہ نکالیں۔ میں نے صفائی پیش کی۔ بیگم دس سال کے دوران ہزار مرتبہ اپنی اٹوٹ اور بے پناہ محبت کا یقین دلا چکا ہوں۔ کئی مرتبہ پتی پر کشا سے گذر چکا ہوں۔ [1]

افسانہ فرنٹ وہیل ڈرائیور میں لکھتے ہیں:

یوں راشد اپنی فرنٹ وہیل ازدواجی زندگی سے مطمئن ہے لیکن میں پریشان ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے میری بیوی راشد کی مثال پیش کر کے مجھے ورغلاتی رہتی ہے۔ ایک دن باتھ روم میں دھکیل کر کہنے لگیں۔ باتھ روم صاف کرنے سے نہ آپ کی عزت میں کمی ہوگی اور نہ آپ کی شان میں فرق آئے گا۔

بچے کو گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔ بچوں کو سنبھالنا باپ کی بھی ذمہ داری ہے۔ راشد بھائی کے بچے ماں سے زیادہ باپ سے ہلے ہوئے ہیں۔ آپ اپنے وست سے سبق حاصل کیوں نہیں کرتے؟ [2]

افسانہ آستان معرکۃ الذوجہ میں بھی خواتین کے اس فعل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، لکھتے ہیں:

''میں نے بحث کو طول دینے سے احتراز کرتے ہوئے کہا، ازدواجی زندگی میں کسی کو سکون حاصل ہے اور کون فائدے میں ہے اس بحث کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ اب یہ بتایئے کھانا ملے گا یا نہیں۔ ہوٹل میں کھانا ہر وقت تیار

---

[1] ۔لو لیٹر۔عرض کیا ہے۔ص نمبر 32,33، سن اشاعت اگست 2011ء

[2] ۔فرنٹ وہیل رائیور، یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ص نمبر 110-109

رہتا ہے۔آرڈر کیجیے اور کھانا حاضر۔
میں ہوٹل کی نہیں گھر کی بات کر رہا ہوں۔
گھر میں آج کھانا نہیں بنا ہے۔
تو پھر میں جا رہا ہوں۔
اکیلے کھایا نہیں جائے گا میں بھی ساتھ چل رہی ہوں۔
میں ہوٹل نہیں جہنم جا رہا ہوں۔
میں وہاں جانے میں دلچسپی نہیں رکھتی'' ۔ [1]

شوہر اور بیوی کو دو پہیوں والی گاڑی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔منزل تک پہنچنے کے لیے دونوں کی ضرورت ہوتی ہے اور دونوں کے فرائض بھی مختلف ہوتے ہیں۔جیسے مرد کو روٹی کا انتظام کرنا تو بیوی کو گھر کا نظام چلانا ہوتا ہے۔اگر کسی کے ہاں مجبوری کی حالت میں کوئی ایک شخص دونوں فرائض انجام دیتا یا دیتی ہے تو بہتر ہے لیکن کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو خوش گوار ازدواجی زندگی میں کئی مسائل جنم لیتے ہیں۔یہی مسائل سماج و معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

موجودہ دور کی خواتین اپنے شوہر کا نام لے کر یا مغربی تہذیب کے القاب سے مخاطب ہو رہی ہیں دراصل یہ ہمارے معاشرے کی اخلاقی قدروں کی گراوٹ ہے۔ویسے مشرقی تہذیب میں بھی شوہر کو مخاطب کرنے کے لیے کئی القاب موجود ہیں۔اس کے باوجود بھی خواتین مغربی تہذیب کی تقلید کر رہی ہیں جس کی طرف عابد معز نے ایک افسانے میں اس طرح اشارہ کیا ہے:

اگر یہ بات ہے تو میں آپ کو ڈرالنگ ،ڈیئر جانی، مائی لو جیسے القاب سے کیوں نہ پکاروں؟ بیگم نے سوال کیا۔
یہ القاب شادی سے پہلے اچھے لگتے ہیں، شادی کے بعد انھیں نکاح نامے کے ساتھ کہیں محفوظ جگہ پر چھپا دیا جاتا ہے۔

---

[1]۔آستان معرکتہ الذوجہ، یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ص نمبر 153

بچے بڑے ہو رہے ہیں اپنا نہیں تو ان کا ہی خیال کیجیے۔ میں نے جواب

دیا''۔ ۱؎

انسان کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرنا ایک مشکل فن ہے کیوں کہ اپنے ہی جذبات کا اظہار کرنا مشکل ہوتا ہے تو دوسروں کے جذبات کا لفظوں میں اظہار کرنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔اس کا صحیح اندازہ ایک فنکار اپنے قلم کے ذریعہ کاغذ پر عیاں کرسکتا ہے۔افسانہ ''نام میں کیا رکھا ہے'' میں خواتین کے جذبات و احساسات کی عکاسی کو طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں عیاں کیا ہے:

''یہ بھی تقریباً ہر بیوی کی ایک کمزوری ہے۔معمولی سی بات پر دوسری شادی تک جا پہنچتی ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ بات بات پر شوہر کی دوسری شادی کے بارے میں سوچنے لگتی ہے۔ بیوی کے بار بار کہنے پر شوہر کو دوسری شادی کی ترغیب اور تحریک ہوتی ہے اور وہ بغیر سوچے سمجھے دوسری مرتبہ بیوقوفی کر بیٹھتا ہے''۔ ۲؎

خواتین کی نفسیات اور جذبات واحساسات کی عکاسی ہمیں افسانہ ''وہ'' میں بھی نظر آتی ہے۔ڈاکٹر عابد معز نے اس کہانی کے کرار کو علامتی رنگ میں پیش کیا ہے۔اس افسانے میں رومانی کیفیت کی بہترین تصویرکشی ملتی ہے۔اس کہانی میں لفظ ''وہ'' ایک علامتی کردار ہے جو عورت کے لیے سوتن بن کر پوری کہانی پر چھائی رہتی ہے۔

اس افسانے میں خواتین کے شعور ولاشعور ظاہری و باطنی نفسیاتی واردات کا مکمل احاطہ کیا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ازدواجی زندگی کے اندر پلتا ہوا مواد اور ابھرتے ہوئے زخموں پر پٹی باندھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہر قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ حقیقتاً وہ خود اس کہانی کا مکمل کردار ہے۔ چنانچہ ایک اقتباس دیکھیئے ۔

آج صبح بھی ہماری آنکھیں کھلتے ہی بیوی کی آنکھوں سے لڑ پڑیں۔انھوں

۱؎ ۔مضمون، نام میں کیا رکھا ہے، عرض کیا ہے۔ص نمبر 65

۲؎ ۔مضمون، نام میں کیا رکھا ہے، عرض کیا ہے۔ص نمبر 60

نے ہر دن کی طرح غم روزگار کا رونا رونے کے بجائے ایک عجیب وغریب شکایت کی۔ چند دنوں سے میں محسوس کررہی ہوں کہ گھر میں آپ کی پہلے جیسی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ شام میں دوستوں کے ساتھ وقت گزار کر تھکے تھکائے گھر آتے ہیں۔ دو چار نوالے زہر مار کرتے ہیں۔ کچھ دیر منہ پھیلائے بیٹھے رہتے ہیں کہ وہ آتی ہے اور آپ اس کے پیچھے ہولیے۔ گھر والوں سے کچھ پوچھا اور نہ ہی ان سے کچھ سنا۔ پپو کا ہوم ورک دھرا کا دھرا رہ گیا۔ منی کی رپورٹ بھی نہیں دیکھی، صرف ایک مضمون میں پاس ہوئی ہے۔ ہم ہیں کہ آپ کو صبح دفتر روانہ کرنے کے بعد سے ارمان لیے بیٹھے ہیں کہ کب صاحب بہادر آئیں گے۔ انھیں پیٹ بھر کھلا کر جی بھر کر باتیں کریں گے۔ دن تمام کی تھکن اتاریں گے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کا ماتم کریں گے لیکن وہ آئی کہ آپ غائب! ہمارے ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ میں ایک بات کہنے کے لیے پندرہ دن سے سوچ رہی ہوں لیکن وہ موقع دے تب ناں......[1]

افسانے کے آخری حصہ میں نفسیاتی الجھن ختم کرنے کے لیے شک کے در و دیوار کو یوں منہدم کیا ہے:

''کیا آپ نے اندازہ لگایا ہماری ''وہ'' کون ہے اور بقول ہماری بیوی کے وہ آتے ہی ہم گول بلکہ گل ہوجاتے ہیں۔ ہماری ''وہ'' نیند ہے۔ غم روزگار کا مداوا۔ ہمارے اور آپ کے مسائل سے فرار بلکہ بیشتر مسائل کا حل نیند ہی تو ہے۔ بیوی کی شکایت بننے اور ان سے بحث میں الجھنے کے بعد ہم نے ان سے سوال کیا۔ بیگم کیوں ہم پر اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کا الزام رکھتی ہیں۔ جب وہ آپ کے پاس آتی ہے۔ کیا آپ بھی اس کے پیچھے نہیں ہوجاتیں؟''[2]

---

[1] ۔مضمون، نام میں کیا رکھا ہے، عرض کیا ہے۔ص نمبر 65

[2] ۔وہ۔عرض کیا ہے۔ص 72-71

ہر جاندار کے لیے نیند بے حد ضروری ہے اس کی آغوش میں پہنچ کر انسان دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ افسانہ ''قصہ تیمارداری کا'' میں بیوی کے اخلاص اور وفا، محبت، ہمدردی، ایثار وقربانی، حسن خدمت کی بے پناہ عکاسی جھلکتی ہے۔ شوہر کی تھوڑی سی طبیعت خراب ہونے پر وہ کس طرح بے چین و بے قرار رہتی ہے۔ دوسری جانب تیمارداری میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے شوہر سے دور نہیں رہتی۔ چنانچہ بیوی کے اس خلوص و محبت کو اس افسانے میں موضوع بنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مجھے ڈاکٹر اور رشتہ داروں کی موجودگی کی وجہ سمجھ میں آئی۔ بچوں اور احباب سے بات کر کے میں نے ان کی پریشانی دور کی۔ بیوی سے کہا کہ آدھی رات سے زائد بیت چکی ہے۔ آرام کر لیں لیکن وہ نہ مانیں اور بقیہ رات سرہانے بیٹھی تو ال بھگو کر سر پر رکھتی رہیں۔ ماتھے کو چھو کر بخار دیکھتی رہیں۔ ہر پندرہ بیس منٹ سے پانی حریرہ یا شوربہ پلاتی رہیں۔ اور ہاں ہر گھنٹہ بعد مصلّی بچھائے دونوں ہاتھ اٹھائے میری صحت کے لیے دعا بھی کرتی رہیں۔ ....پہلی مرتبہ مجھے مجازی خدا کے معنی معلوم ہوئے اور مجازی خدا ہونے کا احساس بھی ہوا۔ میں نے ممنونیت کے ساتھ بنت حوا کی جانب دیکھا اور اس کی عظمت کو سلام کیا''۔[1]

اسی طرح افسانہ ''سگ گزیدہ'' میں شوہر کے لیے بیوی کے بے مثال اخلاص اور ایثار کے جذبوں کی اس طرح تصویر کشی کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''بیوی زخم کے آگے پنکھا ہلاتے ہوئے کتّے کو کوسنے لگیں۔ خبیث کے دانت جھڑ جائیں اور موا کسی لاری کے نیچے آ کر مر جائے ....ہم نے فوراً بیوی کا منہ بند کیا۔ ایسی بدشگونی نہ کرو۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میری جان کتے میں ہے، دس دنوں کے لیے۔
>
> ہم نے انہیں ڈاکٹر کی ہدایات سمجھائیں۔ بیوی اپنے سہاگ کی خاطر کتّے کی

---

[1] قصہ تیمارداری کا، عرض کیا ہے، ص نمبر 126-125

درازیٔ عمر کی دعائیں مانگنے لگیں۔ ''کتا جگ جگ جیئے، سو برس کی عمر ہو۔ صحت اور سلامتی نصیب ہو۔ جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے یہ بھی کہا، میری عمر اس کتے کو لگ جائے''۔ [1]

برصغیر کی عورت اپنے شوہر کی خدمت کو ایک مقدس فریضہ اور اپنے لیے اعزاز سمجھتی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے کبھی روٹھتی ہے تو کبھی روٹھے ہوئے شوہر کو اپنے اخلاص اور حسن خدمت سے منانے کا ہنر بھی جانتی ہے۔ کبھی کبھار وہ اپنے عمل سے شوہر کو تکلیف پہنچاتی ہے تو کبھی اپنے حسن عمل سے سکون وراحت کا ذریعہ بنتی ہے اس کے باوجود اپنے شوہر کے دکھ درد میں ہمیشہ شامل رہتی ہے بلکہ شوہر کے لیے اپنی جان دینے کو بھی تیار ہو جاتی ہے لیکن فضول خرچی اور بے جا شاپنگ کے معاملے میں کبھی سمجھوتا نہیں کرتی، بیوی کی اس خامی کی طرف عابد معز نے اپنے ایک افسانے میں یوں اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

''کروڑوں لاکھوں میں کیوں! جب یوں ہی خیال کرنا ہے تو پھر اربوں میں کیوں نہیں۔ تصور میں تو کنجوسی نہ کیجئے۔ عادت سے مجبور بیگم نے زیادہ رقم کا مطالبہ کیا۔ چلیے مان لیا۔ آپ کے پاس اربوں ڈالر ہیں۔ آپ کیا کریں گی۔ میں نے بیگم کو اربوں ڈالر رقم دے دی۔

میں شاپنگ کروں گی۔

وہ تو اب بھی کرتی ہیں۔ میں نے بیگم کو یاد دلایا۔

اب کیا خاک شاپنگ ہوتی ہے۔ کئی اشیاء کے دام پوچھ کر رہ جاتی ہوں۔ بیگم نے شکایت کرنے کے بعد کہا۔ 'میں وہ تمام چیزیں خریدوں گی جن کی اب تک صرف قیمت دریافت کر کے صبر کیا ہے۔

شاپنگ کے علاوہ بتائیے،۔ میں نے سوال کیا۔

میں شاپنگ کے علاوہ بھی شاپنگ ہی کروں گی۔ میں ڈھیر سارے کپڑے

---

[1] ۔ سگ گزیدہ۔ عرض کیا ہے۔ ص:176

خریدوں گی زیور خریدوں گی۔ جوتے خریدوں گی۔

میں نے بیگم کو شاپنگ کی فہرست مکمل کرنے نہیں دی۔ یعنی آپ جیہ للیتا کا ریکارڈ توڑنا چاہتی ہیں جس کے پاس ہزاروں کی تعداد میں کپڑے اور کئی کلوز یور ہیں۔ بہت زیادہ جوتے خرید کر آپ فلپین کی سابق صدر کی بیوہ املڈا مارکوس کو مات دینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کس کس کا ریکارڈ توڑوں گی۔ آپ نے پوچھا تو میں نے بتایا۔ یوں بھی آپ نے کون سے حقیقی ڈالر دیئے ہیں۔ صرف خواب ہی دکھا رہے ہیں''۔ [1]

دولت آرزو خواہشات تمناؤں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ محنت سے حاصل ہوتی ہے۔ کبھی قسمت سے کھنچی چلی آتی ہے لیکن اس کی حفاظت علم و عقل سے کی جاتی ہے۔ علم و عقل ہمیشہ حقائق کی جانب سفر کرتی ہیں۔ ہمیں اپنے مال و متاع کو سنبھالنے یا محفوظ رکھنے کے لیے صحیح علم اور وسیع تجربہ درکار ہوتا ہے۔ بالفرض کسی شخص کے پاس صحیح علم نہ ہو تو وہ ہزاروں لاکھوں ڈالرس غلط جگہ استعمال کرتے یا بے جا خرچ کر دیتے ہیں۔ فضول خرچی سے قاروں کا خزانہ بھی دھیرے دھیرے ختم ہو جاتا ہے۔ افسانہ ''میں صرف بیتی ہوں''۔ ایک بہترین اصلاحی کہانی ہے اس میں ہمیں میانہ روی، قناعت پسندی اور شکر گزاری کے درس کے علاوہ، بے تکی خواہشات و تمنائیں اور بے جا شاپنگ و فضول خرچی سے گریز کرنے کا سبق ملتا ہے۔

عقل احساسات کا نمائندہ تو محبت جذبات کا نمائندہ ہوتا ہے۔ عقل و احساس ایک سرحد پر روک لگاتی ہے، لیکن جذبات کی کوئی حد لکیر نہیں ہوتی۔ افسانہ ''مام ما'' بھی ایک جذباتی کہانی ہے اس میں ماں کی ممتا کے ہزار ہا رنگ بتایے گئے ہیں اقتباس دیکھئے:

''براہ کرم منے میاں کا خیال رکھیے۔ میری قسم ایسے ڈانٹا یا اس پر ہاتھ اٹھایا ...... منے میاں فی الوقت ہماری اکلوتی سنتان ہیں۔ موصوف کی پہلی سالگرہ چند

---

[1] ۔ میں صرف پتی ہوں ۔ عرض کیا ہے ۔ ص: 170-171

ہفتے قبل منائی گئی۔ ماشاء اللہ اپنے پیروں پر نہ صرف کھڑے ہو گئے ہیں بلکہ دوڑنے بھی لگے ہیں۔ اپنی زبان میں گفتگو بھی کرتے ہیں جسے سوائے ان کی والدہ کے کوئی دوسرا نہیں سمجھتا۔ بڑوں کی دیکھا دیکھی بھی کرنے لگے ہیں۔ ہمارے نزدیک منے میاں ایک عام سا بچہ ہے۔لیکن اپنی ماں کے لیے منے میاں دنیا کا آٹھواں نہیں پہلا عجوبہ ہیں۔ان کے خیال میں منے میاں نے کم عمری میں چلنا سیکھا ہے۔ جب کہ ان کی عمر کے دوسرے بچے ابھی رینگ رہے ہیں۔ منے میاں نے باتیں کرنا بھی جلد شروع کر دی ہے جب کہ ان کے ساتھ کے بچے ابھی غوں غاں ہی کر رہے ہیں''۔ [1]

عورت بیٹی بن کر ماں باپ سے حقیقی معنوں میں پیار و محبت وصول کرتی ہے لیکن ماں بن کر اولاد پر نچھاور کر دیتی ہے۔ ماں اولاد کے لیے ایک سایہ دار رخت کی طرح ہوتی ہے۔اسی لیے بچہ اپنی ماں سے تھوڑی دیر کے لیے بھی جدائی برداشت نہیں کرتا۔ دنیا میں بچہ سے کوئی انمول بے غرض پیار و محبت اور طرفداری کر سکتی ہے۔تو خود اس کی ماں ہی ہو سکتی ہے''۔

عابد معز کا ایک افسانہ ''شکر بیتی'' ایک طبی موضوع پر مزاحیہ کہانی ہے اس افسانے میں ڈاکٹر عابد معز کے مطابق مرض ذیابیطس بڑا پیچیدہ مرض ہوتا ہے یہ اُم الامراض اور باب الامراض ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا ہی وفادار مرض بھی ہوتا ہے۔ جو زندگی کے آخری سانس تک رہتا ہے۔اس افسانہ میں انہوں نے شگفتہ انداز میں مرض کی علامت اور مریض کی گوناگوں مشکلات کو ظاہر کرتے ہوئے ان مفاد پرستوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو ہمدردی کے ساتھ مزاج پرسی کے بہانے اپنی ادویات کو فروخت کرتے ہیں اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''ایک صاحب بہترین کپڑے پہنے خوشبو اور کریم پاوڈر لگائے بالوں کو فلمی انداز میں جمائے گلے میں ٹائی لٹکائے اور ہاتھ میں مخصوص بیگ لیے ہمارے

---

[1] ۔ مام ما۔عرض کیا ہے۔ص:129

گھر آئے تو ہم نے سمجھا شاید وہ غلط فہمی میں ڈاکٹر کے مطب کے بجائے مریض کے گھر آ گئے ہیں۔ہم انہیں اپنی گلی کے ڈاکٹر کا پتا بتانا چاہتے تھے کہ انہوں نے بیگ کھولا اور شروع ہو گئے۔مرض ذیابیطس کے تعلق سے خوب صورت اور رنگین لکچر دیا''۔ ۱؎

اس طرح آگے مرض ذیابیطس کے حوالے سے انسانی فطرت اور خطرات کو یوں ظاہر کیا ہے یوں لکھتے ہیں:

''ایک دن ہم ہوٹل میں بیٹھے میٹھے پر میٹھا اڑا رہے تھے کہ اسی ہوٹل میں ہمارے خسر صاحب کی آمد ہوئی،ان سے کیا پردہ۔وہ بھی شکر کے مریض تھے اور سن رکھا تھا کہ وہ بھی چوری سے میٹھا کھاتے ہیں۔خسر صاحب ہمارے پاس آئے اور میٹھے کی پلیٹ کو اپنی جانب کھسکاتے ہوئے فرمایا۔کم بخت شکر کا مرض سیدھے پیٹ پر لات مارتا ہے۔یہ نہ کھاؤ،وہ نہ کھاؤ،تو پھر کاہے کو زندہ رہو۔میرا کیا ہے۔تمام ذمہ داریوں سے سکبدوش ہو چکا ہوں۔تمہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔بیوی اور بچوں کی ذمہ داری اٹھانی ہے۔آئندہ سے تمہارے حصہ کی مٹھائی میں کھالیا کروں گا۔اس کے بعد سے ہم جہاں بھی میٹھا کھانے جاتے ہمارے خسر وہاں پہلے سے ہمارے حصہ کی مٹھائی کھانے موجود رہتے تھے''۔ ۲؎

ترک سگریٹ نوشی ایک اصلاحی افسانہ ہے۔یہ کہانی اُن افراد کے لیے اہم ہے جو کسی عادت کے اسیر ہو چکے ہیں مثلاً شراب،سیندھی،چرس۔گانجہ،افیم۔بیڑی۔سگریٹ و دیگر منشیات وغیرہ۔انسان ان میں سے کوئی ایک چیز کا عادی ہو گیا تو اس کو یہ لت چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔کوئی مئے کش یا سگریٹ نوش جھوٹ بول کر بہانے تلاش کر کے یا اپنی جان جوکھم میں ڈال کر اپنی عادت کی تکمیل کر لیتا ہے۔چنانچہ عابد معز لکھتے ہیں:

۱؎ ۔شکر بیتی۔عرض کیا ہے۔ص:49-53

۲؎ ۔ شکر بیتی۔عرض کیا ہے۔ص:51-52

’’سگریٹ نوشی ترک کرنے کے لیے وضع کیے گئے قوانین پر عمل ہونے لگا۔ میں صبح بیدار ہونے کے بعد اپنی طلب پوری کرنے کے لیے باہر چلا جاتا۔گلی کے نکڑ کے پنساری سے ایک سگریٹ خریدتا اور سڑک پر سگریٹ پی کر گھر واپس آتا۔ایک صبح جب میں سگریٹ پینے باہر جارہا تھا تو بیوی نے پانی کا لوٹا تھماتے ہوئے طنز کیا۔سگریٹ تو چھوٹ نہیں سکتا۔کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ پانی کا لوٹا بھی ساتھ لیتے جائیں۔میں خاموش رہنے کے سوائے کیا کرسکتا تھا۔......گھر سے باہر سگریٹ پینے کی شرط میرے لیے مشکل کا باعث بنی رہی۔گھر سے باہر نکلنے کے بہانے تلاش کرنے لگا۔بازار سے سودا سلف اور دوسری چیزیں لانے لگا، جو میں پہلے کبھی نہ کرتا تھا۔عمداً کوئی شئے بھول کر آتا اور پھر بازار جاکر سگریٹ پی آتا۔دوست احباب سے بھی غیر ضروری ملنے لگا۔قصہ مختصر گھر اور باہر کے درمیان آوک جاوک ہونے لگی۔رات میں دروازہ کھٹکھٹایا جانے کا بہانے بناتا اور باہر آکر سگریٹ نوشی کرتا‘‘۔[1]

سگریٹ نوشی کی لاکھ جتن کریں مثلاً ایک عادت چھڑوانے کے لیے دوسری عادت کی ترغیب دیں۔عادت کو چھوڑنے کے لیے کسی دوسری کم نقصان دہ عادت اپنانے کا مشورہ بھی دیں یا دوست احباب رشتہ دار، بڑے بزرگوں سے نصیحت کروائیں یا ڈاکٹروں کے پاس لے جائیں وغیرہ لیکن وہ اپنی عادت سے کنارہ کش نہیں ہوگا۔ڈاکٹر عابد معز کے مطابق منشیات کا عادی شراب نوش اور سگریٹ نوش شخص تب ہی اس اسیری سے آزاد ہوگا جب کبھی اس کے آنکھوں کے سامنے کوئی بڑا بھیانک حادثہ واقعہ ہو تو وہ ہمیشہ کے لیے توبہ کردیتا ہے۔لہٰذا اپنے ایک افسانہ میں عابد معز نے خواب کے ذریعہ ترک سگریٹ نوشی کی طرف توجہ مبذول کی ہے:

’’اچانک ایک رات میری نیند ایک بھیانک خواب کے سبب بیدار ہوئی۔

---

[1] ۔ترک سگریٹ نوشی۔یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ص:147

میں نے دیکھا کہ ادھ جلے سگریٹوں کی چتا پر میں لوٹن کبوتر کی طرح لوٹ رہا ہوں
درد اور تکلیف سے چلّا رہا ہوں۔ ڈاکٹر دوائیں دے رہے ہیں لیکن کوئی افاقہ
نہیں ہوتا، احباب بے بس کھڑے آرام کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔
بیوی اور بچوں کا روتے روتے برا حال ہے۔ دیر تک میں اپنے آپ کو بہلاتا رہا۔
نیند اڑ چکی تھی۔ کوشش کے بعد دو گھڑی سویا تھا کہ پھر وہی خواب نظر آیا۔ میں
گھبرا کر اٹھ بیٹھا، سگریٹ مجھے جانی دشمن دکھائی دینے لگا۔ میں نے سگریٹ کی
ڈبیا کو اسی وقت کچرے میں پھینکا۔ ایش ٹرے کو ہٹایا اور سگریٹ نوشی سے ہمیشہ
کے لیے توبہ کی''۔ [1]

الغرض عابد معز کے شگفتہ افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں افسانہ نگاری کی تمام بنیادی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً انسانی جذبات و احساسات، نفسیاتی الجھنیں، رشتوں کے باہمی تعلقات محبت، نفرت، غلط فہمیاں۔ انہوں نے سائنسی ایجادات اور طبی مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان تمام موضوعات پر انہوں نے ظریفانہ اسلوب کے ذریعہ روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح بلاشبہ عابد معز کو ایک کامیاب شگفتہ افسانہ نگار کہہ سکتے ہیں۔

☆☆☆

---

[1] ۔ترک سگریٹ نوشی۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ ص:150

باب چہارم

اسلوب اور تکنیک

اسلوب اور تکنیک

اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنیٰ طریقہ، راستہ روش کے ہوتے ہیں، ادب میں اسلوب سے مراد کسی شاعر یا ادیب کے ادائے مطلب کا وہ انداز اور جذبات وخیالات کے اظہار و بیان کا وہ طریقہ ہے جو مصنف کی انفرادی خصوصیات سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ مصنف کی یہ انفرادی خصوصیات اس کے انتخاب و استعمال الفاظ اور جملوں کی ساخت وترتیب سے ظاہر ہوتی ہے وہیں فنکار کے مزاج، کردار، ماحول مطالعہ مشاہدہ اور انداز بیان جیسے عوامل سے بھی تشکیل پاتی ہیں غرض انفرادی خصوصیات کی اس رنگارنگی سے ہی مختلف اسالیب وجود میں آتے ہیں۔ جیسے تعقیدی اسلوب، مقفٰی و مسجع، اسلوب، سپاٹ وسادہ اسلوب، بیانیہ و توضیحی اسلوب، شگفتہ ظریفانہ اور طنز آمیز اسلوب، تاثراتی اسلوب، خطیبانہ اسلوب وغیرہ۔ ڈاکٹر عابد معز کی تحریروں کا اسلوب ظریفانہ اور طنزیہ ہے۔ اس اسلوب کی بدولت وہ ایک طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے ابھر کر آتے ہیں۔

مزاح اس شگفتہ کیفیت کا نام ہے جو زندگی اور ماحول کی ناہمواریوں اور بے قاعدگیوں کو دریافت کرتا ہے۔ انہیں ہمدردانہ شعور کے ساتھ فنکارانہ انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری خندۂ زیرلب کی کیفیت سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔ بقول اسٹیفین لی کاک کے:

> ''مزاح کیا ہے یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے۔
> جس کا فنکارانہ اظہار ہوجائے''۔ [1]

مزاح نگار مختلف حربوں سے کام لیتے ہوئے تبسم شگفتگی و تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے یہی طنزیہ و

---

[1] ۔اردو ادب میں طنز ومزاح، وزیر آغا، ص:47

مزاحیہ ادب کے حربے یا تکنیک کہلاتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا نے تخلیقی مزاح کے پانچ بنیادی حربے بیان کیے ہیں:

(۱) موازنہ۔ (۲) لفظی بازیگری۔ (۳) مزاحیہ صورت واقعہ۔ (۴) مزاحیہ کردار اور (۵) تحریف

طنز سے مراد زندگی کے تضاداس کی زیادتیوں اور بے انصافیوں پر غم وغصہ کا اظہار کرنا ہے۔

خواجہ عبدالغفور طنز کی تعریف کرتے ہوئے اس کی کئی خصوصیات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''طنز تنقید ہے صدائے احتجاج ہے، دشنام یار ہے، تازیانہ ہے، اس کا مقصد اصلاح ہے، پگڑی اچھالنا ہے، احساس برتری کا مظاہرہ کرنا ہے، بے ہودہ اشیاء اور اشخاص کا مضحکہ اڑانا ہے''۔[1]

غرض طنز میں زندگی کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو لطیف پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے کہ ہم ان کی طرف متوجہ بھی ہو جائیں اور ہمیں طنز نگار کی بات بری بھی نہ لگے۔

مزاح کی طرح طنز میں بھی موازنہ، مبالغہ، لفظی بازیگری اور تحریف اور رمز جیسے حربے استعمال ہوتے ہیں، لیکن مزاح کے برعکس طنز میں نشتریت کا پہلو زیادہ غالب رہتا ہے۔

ڈاکٹر عابد معز کے کالموں میں طنز و مزاح کی یہ بنیادی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔انہوں نے اپنی تحریروں میں طنز و مزاح کی مذکورہ تمام خصوصیات کے علاوہ دوسرے حربوں کا بھی استعمال کیا ہے۔جیسے لطیفہ گوئی، خود برداشتہ مزاح، محاوروں کا استعمال اور تحریف، ضرب الامثال اور کہاوتوں کا برمحل استعمال، تشبیہہ ،اشعار اور مصرعوں کا استعمال اور ان کی تحریف وغیرہ۔ذیل میں ان ہی حربوں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر عابد معز کے اسلوب اور تکنیک کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

---

[1] ۔طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ، ص:79

موازنہ

موازنہ طنز و مزاح کی تخلیق کا ایک اہم حربہ ہے جس میں کسی غیر معروف ہستی کا، کسی نامی گرامی ہستی سے مقابلہ کر کے ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ موازنہ دو اشیا کے مابین وہ تقابلی صورت ہے جو بیک وقت مشابہت اور تضاد کو ظاہر کرتی ہے۔ اس عمل سے ناہموار صورت حال پیدا ہوتی ہے جو ہنسی کا باعث بنتی ہے۔

ڈاکٹر عابد معز نے اپنے کالم، انشائیے اور مزاحیہ افسانوں میں جا بجا اس حربے کا استعمال کیا ہے۔ چنانچہ موازنہ کے چند نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔

ایک انسان اپنے مقام سے کسی دوسرے مقام کو جاتا ہے تو اسے وہاں کی آب و ہوا پہلے پہل سازگار نہیں آتی۔ کچھ دن کے لیے اسے آب و ہوا کی تبدیلی پر شکایت ہوتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر عابد معز شہر اور گاؤں کی آب و ہوا کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہم نے گاؤں کی ہوا کو سونگھ کر کہا۔ شہر یار اس ہوا میں پٹرول، ڈیزل اور دوسری مختلف اشیاء کے جلنے کی بو نہیں ہے۔ یہ ہوا ٹھنڈی بھی ہے۔ اس ہوا میں کتنا سکون ہے۔ ہم اور شہر یار گہری سانسیں لینے لگے جیسے گاؤں کی ہوا کو اپنے اندر بھر لینا چاہتے ہیں۔ شابو نے انتباہ کیا۔ صاحب یہ اصلی ہوا ہے۔ آپ شہر والوں کو عادت نہیں ہے۔ احتیاط کیجیے۔ شہر یار نے اصلی ہوا کچھ زیادہ ہی اپنے اندر بھر لی تھی۔ انھیں چھینکیں آنے لگی اور ناک سے پانی بہنے لگا۔ شابو نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ محسوس ہوتا ہے کہ صاحب کو اصلی ہوا راس نہیں آئی گاؤں پہنچنے کے بعد نیم کا دھواں دیں گے تو چھینکیں بند ہو جائیں گی''۔[1]

گاؤں اور شہر کی آب و ہوا کا موازنہ کرتے ہوئے، شہر کے مشروبات اور گاؤں کی دیسی شراب کے

---

[1]۔ ''گاؤں کی سیر''، سگ گزیدہ۔ ص:174

درمیان بھی کچھ اس طرح موازنہ کیا ہے:

''گاؤں میں شہر کے مشروبات نہیں ملتے۔ پانی کے علاوہ صرف دیسی شراب ملتی ہے۔ایک گلاس دیسی شراب میں دس شہری گلاس کی شراب کا نشہ ہوتا ہے'' ۔[۱]

مشرقی لباس میں شیروانی کی اہمیت مسلمہ ہے۔ یہ اردو تہذیب کی پہچان اور دین بھی ہے۔ دور حاضر میں دوقسم کی شیروانیوں کا چلن ہے۔ اردو کی شیروانی اور شادی کی شیروانی، چنانچہ عابد معز شیروانی کا موازنہ سوٹ سے اس طرح کیا ہے:

''شیروانی مغربی سوٹ کا مشرقی جواب ہے''۔ [۲]

مضمون گھورا گھاری میں مردوں اور خواتین کی فطرت کا موازنہ طنز و مزاح کے انداز میں یوں کیا ہے:

''گھورا گھاری کرنے کے ٹارگٹ مذکر اور مؤنث کے لئے مختلف ہوتے ہیں مرد حضرات مخالف جنس یعنی خواتین کو ٹارگٹ بناتے ہیں، وہ خواتین کے حسن اور خوبصورتی کو یوں تکتے ہیں جیسے انہیں ان سے محروم رہنے کا قلق ہے۔اس کے بر خلاف خواتین کا ٹارگٹ خواتین ہوتی ہیں۔ایک دوسرے کو گھورنے کے اسباب خواتین بہتر جانتی ہیں، کپڑے اور زیور سے لے کر اولاد تک مختلف وجوہات ہوتی ہیں''۔ [۳]

ڈاکٹر عابد معز کا ماننا ہے کوئی بھی شخص شاعر بن سکتا ہے۔شاعر بننے کے لیے کوئی بنیادی لیاقت درکار نہیں ہے۔صرف شاعر بننے کی جستجو اور حوصلہ چاہیے۔اس لحاظ سے شاعر، لیڈر کے مماثل ہے۔شاعر اور لیڈر کے رمیان یوں موازنہ کیا ہے:

۱۔گاؤں کی سیر۔سگ گزیدہ۔ص:171

۲۔شادی کی شیروانی۔اردو میگزین،۶ جولائی 2001ء

۳۔گھورا گھاری،اردو میگزین ۱۲/مئی ۲۰۰۰ء۔

''میدان مارنے کے لیے دونوں کوعوام کے سامنے جانا پڑتا ہے۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ عوام سے شاعر داد کا طلب گار ہوتا ہے تو لیڈر ووٹ مانگتا ہے''۔[1]

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق قدرت نے بڑی فیاضی سے ہر انسان کو ایک عدد خالی پیٹ عطا کیا ہے۔ سیر بھی گنجائش رکھنے والا پیٹ بھرنا آسان اور سہل معلوم ہوتا ہے۔ انسان اسے آسانی سے بھر بھی لیتا ہے بلکہ روز ازل سے ہی وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر پیٹ بھرنے میں سرگرداں ہے۔ لیکن بھرا پیٹ اتنی آسانی سے بہت جلد خالی بھی ہو جاتا ہے۔ انسان اسے پھر بھرتا ہے اور پیٹ پھر خالی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انسانی پیٹ کو عمرو عیار کی زنبیل سے موازنہ کیا ہے:

''محسوس ہوتا ہے کہ پیٹ سیر بھر جھولی نہیں، عمرو عیار کی زنبیل ہے۔ کون سی غذا اور کیسا پانی، اس کے اندر ہر شئے غائب ہو جاتی ہے''۔ [2]

د مزاحیہ صورت واقعہ:(Comical situation)

مزاحیہ صورت واقعہ طنز و مزاح کا ایک اہم حربہ ہے۔ اس میں کسی واقعہ کے ذریعہ مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ مزاحیہ صورت واقعہ کسی شعوری کاوش کا رہین منت نہیں ہوتا بلکہ وہ حالات، واقعات یا کردار کی مخصوص ناہمواریوں سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس میں غلطی، غلط فہمی، اور اتفاقی وقت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ وزیر آغا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مزاحیہ صورت واقعہ کی کامیابی اس بات میں ہے کہ کسی شعوری کاوش کی رہین منت نہ ہو بلکہ ازخود حالات و واقعات کی ایک مخصوص نہج یا کردار کی مخصوص ناہمواریوں سے پیدا ہوتی چلی جائے۔ چنانچہ مزاحیہ صورت واقعہ کی تعمیر میں

---

[1] ۔شاعر کی جمع مشاعرہ۔ فارغ البال۔ ص:216-217

[2] ۔توند۔ فارغ البال۔ ص:133

ایک اچھا مزاح نگار غلطی، غلط فہمی اور اتفاق وقت (Coincidene) کو عام طور سے بروئے کار لاتا ہے''۔ ۱

مزاحیہ صورت واقعہ کی کامیابی یہ ہے کہ اس میں حالات و واقعات ایک فطری بہاؤ کے تحت کسی ناہمواری کو جنم دیں۔ اس میں کسی شعوری کاوش کو دخل نہ ہو اور مزاح نگار غلطی، غلط فہمی اور اتفاق وقت کو بروئے کار لا کر مزاحیہ صورت واقعہ کی تخلیق کرتا ہے۔ یا اچھی بھلی زندگی میں ناہمواری کا پیدا ہوجاتا ہے۔ یا اچھے آدمی کا یکا یک اس طرح الجھن میں مبتلا ہوجانا ہے جو اس کے وقار کو ختم کردے۔ ڈاکٹر عابد معز کو واقعہ کے ذریعہ مزاح پیدا کرنے میں خوب کمال حاصل ہے لہٰذا اوپر جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ تمام خصوصیت ان کے یہاں ملتی ہیں۔

خواتین بڑی کنجوس ہوتی ہیں لیکن شاپنگ اور بے جا شاپنگ کرنے میں فراخ دل ہوتی ہیں۔ دوران شاپنگ وہ یہ نہیں سوچتی کہ شوہر کی ماہانہ آمدنی کیا ہے۔ اسی لیے شوہر، بیوی کی بے جا شاپنگ سے ہمیشہ ذہنی اور مالی طور پر پریشان رہتا ہے۔ بیوی کی بے جا شاپنگ سے شوہر کی حالت کو مزاحیہ صورت واقعہ کے ذریعہ اس طرح پیش کیا ہے:

''چند روز قبل ہم نے ایک جوڑے کو شاپنگ کرتے دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ شوہر کے اطراف بچوں اور تھیلیوں کا ہجوم تھا۔ بال الجھے ہوئے تھے اور پتلون بار بار نیچے ہوجاتا تھا جسے راہ گیر اوپر کردیتے تھے''۔ ۲

عابد معز کی اہم خوبی یہ ہے کہ وہ انسانی ہمدردی اور دردمندی کی مثالیں پیش کرتے ہوئے بھی مزاحیہ صورت واقعہ پیش کردیتے ہیں:

''میں ٹھیک ہوں مجھے بتاؤ تو سہی ہوا کیا تھا۔ یہ سب ہنگامہ کیوں ہوا اور آپ روئیں کیوں؟

۱۔ وزیر آغا۔ اردو ادب میں طنز و مزاح ص:55

۲۔ گھونگھٹ الٹنے سے پہلے، سگ گزیدہ۔ ص:۱۱۱ سن اشاعت جنوری 1995ء

نیند لگنے کے بعد آپ کا بخار بہت بڑھ گیا تھا اور آپ بڑبڑانے لگے تھے
بیوی نے بتایا۔ میں بڑبڑانے لگا تھا۔ مجھے تجسس ہوا کہ میں نے کیا بڑ ہانکی ہے۔
اصرار کرنے پر بیوی نے بتایا۔ آپ بار بار میرا نام لے رہے تھے۔ بیوی کی
آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میری زبان پر کوئی اور نام نہ آیا۔
''ریکھا یا نیلی کا نام بھی آ سکتا تھا''۔ ۱؎

چائے بنانا پکوان کا پہلا سبق ہے۔ مائیں اپنی بیٹوں کے لیے پکوان کا درس چائے سے شروع کرتی ہیں۔ مہمان نوازی کا کم سے کم معیار چائے ہے۔ میزبان کا چائے تک کے لئے نہ پوچھنا خلاف تہذیب ہے وہیں مہمان کا چائے نہ پینا میزبان کی ہتک کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ چائے پیاس بجھاتی، بھوک مٹاتی، نیند بھگاتی، اور تھکان، سستی، کاہلی کو دور کرتے ہوئے چاق و چوبند بناتی ہے، ذہنی الجھن اور پریشانی سے نجات بھی دلاتی ہے۔

چائے پر کئی اہم باتیں ہوتی ہیں معاہدے انجام پاتے ہیں۔ مسائل بھی حل کیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ چائے پر رشتہ بھی طئے ہوجاتے ہیں۔ چائے کے تعلق سے ایک مزاحیہ صورت واقعہ ملاحظہ فرمائیے:

''مہمان نوازی کا کم سے کم معیار چائے ہے لیکن اس چائے پر کئی اہم باتیں
ہوتی ہیں۔ معاہدے انجام پاتے ہیں۔ چائے پر مسائل بھی حل کیے جاتے
ہیں۔ حتیٰ کہ چائے پر رشتہ بھی طئے ہوتے ہیں۔ میرے ایک دوست شادی سے
پہلے چائے کے بہت شوقین تھے لیکن شادی کے بعد انہوں نے چائے پینا چھوڑ
دیا کہ ان کی بیگم کے ہاتھ کی بنی چائے پی کر ان کے بزرگوں نے دونوں کا رشتہ
طئے کیا تھا''۔ ۲؎

ماضی میں موٹاپا کو خوش حالی کی علامت گردانتے تھے آج موٹاپے کو مختلف امراض کا سبب سمجھا جا رہا

۱؎ ۔قصۂ تیمارداری کا۔ سگ گزیدہ، ص:136

۲؎ ۔''بیٹھ جاتا ہوں جہاں چائے بنی ہوتی ہے'' اردو میگزین، 30/ مارچ 2001ء

ہے۔وزن بڑھنے سے پیروں کا جوڑ جوڑ متاثر ہوتا ہے۔کمر اور گھٹنوں میں دائمی درد ہونے لگتا ہے غیر ضروری سانس پھولنے کے ساتھ بلڈ پریشر میں اضافہ اور شکر کا مرض دستک دینے لگتا ہے۔دوسری جانب موٹاپا سے جسمانی ہئیت اور شکل میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔دیکھنے والے زیر لب مسکراتے ہیں، ہمدرد وزن کم کرنے کا مشورہ دیتے تو اغیار مختلف القاب سے نوازتے ہیں۔زائد وزن کو کم کرنے کے لیے ورزش اور چہل قدمی ضروری ہے۔موٹاپا اور ورزش کے توسط سے مزاحیہ صورت واقعہ بیان کرتے ہیں:

''گھر پر ورزش کرنے کے لیے ساز وسامان اٹھالائے۔سامان کے لیے اور ورزش کے دوران دل لگا رکھنے کے لئے ساز۔ٹیپ رکارڈ پر گانا لگایا اور کتاب کی ہدایت پر ورزش شروع کی۔گانا سنتے ہوئے خیال آیا کہ کیوں نہ موسیقی کی لئے پر ناچیں۔ بریک ڈانس اور ڈسکو ڈانس خوب رہے گا۔ ورزش کے ساتھ تفریح ہوجائے گی اور اس فن میں مہارت بھی حاصل کرلیں گے۔جدید ناچ بھی ایک قسم کی ورزش ہی ہے۔ناچ کے لیے کم سے کم دو پارٹنرز ہونے چاہئیں۔دونوں کے درمیان مقابلہ سے خوب رنگ جمتا ہے۔ہم نے بیوی کو ڈانس کی دعوت دی۔انہوں نے ہماری آفر کو ٹھکرایا۔ہمیں طیش آیا۔انگریزی دھن پر خود ہی تھرکنے لگے۔فلموں میں ایسا ہی سین ہوتا ہے۔پتہ نہیں جوش میں ہمارے قدم سیدھے پڑے یا اُلٹے، پیر کا ایک پٹھا دوسرے پر چڑ گیا۔دایاں پاؤں بائیں سے دو انچ چھوٹا ہوگیا۔تکلیف سے کراہتے ہوئے ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر نے ہمیں فاسٹ باولر جان کر کہا' آپ باؤلنگ نہیں کرسکیں گے'۔

ہم نے ڈاکٹر کو بتایا' بدقسمتی سے ہم فاسٹ باولر ہیں اور نہ ڈسکو ڈانسر ایکسس بیاگیج (Excess Baggage) پریشان ہیں دواؤں اور شاؤں کی مدد سے چڑھا ہوا پٹھا اپنی جگہ واپس آیا''۔ [1]

اسی واقعے حالت یا کیفیت کی ہو بہو تصویر پیش کرنے میں ڈاکٹر صاحب کو بڑی مہارت حاصل

---

[1] ۔ہمارا موٹاپا۔سگ گزیدہ۔ص:36-35۔سن اشاعت 1995ء

ہے۔مضمون ’’گاؤں کی سیر میں‘‘ گاؤں جانے والی بس اوراس میں سوار ہونے والے مسافروں کی عادت و اطوار پر مزاحیہ صورت واقعہ اس طرح بیان کیا ہے لکھتے ہیں:

’’طویل انتظار کے بعد گرد سے اٹی ایک پرانی چھکڑا بس آئی جس کا ہر پرزہ لرزہ بہ اندام تھا۔بس میں کچھ مسافر پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ہم نے اپنے آپ کو دوسرے مسافروں کے حوالے کر دیا۔آہستہ آہستہ ہم اور شہر یار بس کے اندر ڈھکیل دیئے گئے۔شابو اپنے انداز سے کھڑکی کی راہ ہم سے پہلے بس میں آیا اور ہمارے لئے دو سیٹ پر قبضہ کر دکھایا تھا۔ہم قبضہ کردہ سیٹ پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔

بس کے اندر ہمہ اقسام کے لوگ ہمہ اقسام کی پوٹلیاں تھامے ہوئے تھے۔ چند لوگوں کی بغل میں انسانی بچے دبے پڑے تھے تو چند ایک کی بغلوں میں مرغیاں اور بکریاں اٹکی ہوئی تھیں۔چھت پر لوگوں کے بیٹھنے سے چھت اندر کی طرف جھول رہی تھی۔کچی سڑک پر اپنے اطراف دھول اڑاتے ،مختلف آوازیں نکالتے ہوئے بس اچھلتی کودتی چلی جارہی تھی۔بس رکنے کا کوئی مقام معین نہ تھا۔ جسے اترنا ہوتا وہ مختلف قسم کی آوازیں نکالتا ،بس رک جاتی اور مسافر اُتر جاتا۔اور جیسے بس میں سوار ہونا ہوتو وہ بس کے سامنے آجاتا ،بس رک جاتی۔ مسافر بس میں دوسرے مسافروں پر سوار ہو جاتا اور پھر بس چل پڑتی تھی۔بس کے سفر نے ہمیں شوکت تھانوی کی سودیسی ریل کی یاد تازہ کردی۔چار گھنٹے کی قید با مشقت کے دوران ساٹھ میل کی مسافت طئے کرنے کے بعد ہماری منزل یعنی شابو کا گاؤں آیا۔شابو نے بس روکنے کے لئے آواز نکالی۔بس رکی اور ہم بس کے باہر ڈھکیل دئے گئے۔بس چل پڑی تو ہم گرد میں کھو گئے۔چند لمحوں بعد گرد کا طوفان تھما تو ہمارے سامنے شہر یار اور شابو کے بجائے دو ریڈ انڈین قسم کے لوگ کھڑے تھے چہرے کپڑے اور بالوں میں دھول ، پلکوں اور مونچھ پر افشاں کی مانند مٹی کے زرّات منہ کھولنا چاہا تو پتا چلا کہ منہ اور حلق میں بھی مٹی رچ

بس گئی ہے۔گرد پھانکتے ہوئے ہم نے اپنا تعارف کروایا اور پوچھا۔کیا آپ

صاحبین شہر یار شابو ہیں؟''۔[1]

تحریفParody

تحریف ظرافت نگاری کا ایک بہترین حربہ ہے۔اس میں کسی سنجیدہ کلام کی غیر سنجیدہ طور پر نقالی کی جاتی ہے اور کسی تحریر کے الفاظ کے الٹ پھیر سے نئے معانی و مطالب نکالے جاتے ہیں جو ظریفانہ اور مضحک خیز ہوتے ہیں۔وزیر آغا نے تحریف کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تحریف یا پیروڈی کسی تصنیف کی اس نقل کو کہتے ہیں جس کی ہئیت تو اصل کے مطابق ہو لیکن جس میں الفاظ کی تبدیلی سے اپنے نئے معنی پیدا کیے جائیں کہ وہ مضحکہ خیز صورت اختیار کر جائے''۔ [2]

صفِ اول کے تمام مزاح نگاروں نے کسی نہ کسی سطح پر تحریف Parody کا حربہ استعمال کیا ہے۔ نثر کی پیروڈی نظم کی پیروڈی سے زیادہ مشکل اور دشوار ہوتی ہے اس لیے اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ جب کہ نظم میں یہ بہت زیادہ مقبول ہے اور قدرے آسان بھی۔پطرس کا ''اردو کی آخری کتاب''، ''لاہور کا جغرافیہ'' وغیرہ نثری تحریف کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ڈاکٹر عابد معز کی ظریفانہ تحریروں میں تحریف کے نمونے بہت کم ملتے ہیں یہاں ان کی تحریف کا ایک نمونہ ڈرامہ جس کو ہم بلاشبہ اردو ادب کی چند یادگار تحریفات میں رکھ سکتے ہیں۔

ڈرامہ انارکلی میں مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبرؔ اس کا شاہانہ محل اس کے دربار سے جڑے نورتن اوراس کا لختِ جگر نورالدین محمد سلیم معشوقہ انارکلی کا کردار ہیں۔

عابد معز کا ڈرامہ ''ڈاکٹر مغل اعظم'' میں کرداروں کے نام وہی ہیں لیکن ان کا پیشہ ڈاکٹری ہے۔

---

[1]۔گاؤں کی سیر۔سگ گزیدہ۔ص:172

[2]۔وزیر آغا۔اردو ادب میں طنز و مزاح۔ص:245

پس منظر میں مغل دربار کے بجائے اسپتال ہے۔جس میں جلال الدین محمد اکبر(جسے دنیا ''مغل اعظم'' کے نام سے یاد کرتی ہے) سپر نٹنڈنٹ کے ساتھ اپنے وارڈ کے چیف میڈیکل آفیسر بھی ہیں، اوراس مدد کے لیے دو مددگار اسسٹنٹ میڈیکل آفیسرس مہارانی جودھابائی اور راجہ مان سنگھ ہیں۔اکبراعظم کے دربار کے نورتن ایم بی بی ایس کورس مکمل کر کے ایم ڈی کر رہے ہیں۔اس کا لخت جگرنورالدین محمد سلیم ابھی ابھی ایم بی بی ایس کی تعلیم مکمل کر کے ہاوز سرجن کے عہدے پر ٹریننگ حاصل کر رہا ہے۔ جب کہ کنیزیں نرس کے عہدے پر فائز ہیں مریض اکبراعظم کی رعایا ہےجس میں انارکلی اورسنگ تراش بھی ہیں۔ڈاکٹر عابد معز مغل ہسپتال اورڈاکٹر جلال الدین محمد اکبر کا تعارف اس طرح کراتے ہیں:

> ''میں ہسپتال ہوں اشرف المخلوقات کو بیماریوں سے چھٹکارا دلانا میرا عزم ہے۔ میں انسانوں کو دکھ اور تکالیف سے نجات دلاتا ہوں۔ میرے یہاں لوگ تکالیف اور پریشانیاں لے کر آتے ہیں اور صحت یاب ہوکر خوشیاں اپنے دامن میں سمیٹ لے جاتے ہیں۔میرے کئی ایک ہمدرد وسپوت دن رات انتھک محنت کر کے انہیں بھلا چنگا کر دیتے ہیں۔انہیں میں سے ایک ڈاکٹر جلال الدین محمد اکبر ہے جو نہایت ہمدرد، مخلص اور اصولوں کو جذبات پر ترجیح دینے والا ڈاکٹر تھا''۔[1]

آگے وارڈ کا منظر کچھ اس طرح ہے۔ دائیں اور بائیں جانب مریض لیٹے یا بیٹھے ہوئے ہیں۔ نرس اور وارڈ بوائز بھی ہیں، یہیں پرڈاکٹر جلال الدین محمد اکبر کا لخت جگرڈاکٹر نورالدین محمد سلیم مستقبل کا ایک عظیم ڈاکٹر بننے کے لیے تربیت حاصل کر رہا ہے۔ وہ دوران تربیت ایک حسین کم سن مریضہ انارکلی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے چنانچہ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں ڈاکٹر سلیم مریضہ انارکلی سے اظہار عشق فرما رہا ہے:

> ''وارڈ کا منظر۔ایک بستر پر انارکلی اپنے روایتی لباس میں نیم دراز ہے۔
> پاس سلیم اپنے شاہانہ لباس پہنے گلے میں اسٹتھ سکوپ لگائے مریضہ انارکلی کو

---

[1] ۔ڈاکٹر مغل اعظم ۔اردو ہے جس کا نام ۔زیر طبع

پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

انارکلی: صاحب عالم

سلیم: ہوں انارکلی

انارکلی: مجھے کیا مرض ہے صاحب عالم؟

سلیم: تمہیں اختلاجی کیفیت ہے۔

انارکلی: یہ کیا ہوتی ہے؟

سلیم: یعنی تمہارا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے۔

انارکلی: آپ کو دیکھ کر دل ایسے ہی بے قابو ہو جاتا ہے، صاحب عالم کیا یہ کوئی خطرناک مرض ہے؟

سلیم: نہیں انارکلی یہ کوئی مرض ہی نہیں..................!

جب بڑھتی ہوئی تمنائیں محبت کا روپ دھار لیتی ہیں تو دل بے قابو ہو جاتا ہے...........انارکلی میں تمہاری آنکھوں میں محبت کا اقرار دیکھنا چاہتا ہوں۔

انارکلی: انہیں نہ دیکھیے ڈاکٹر! ان میں ایک مریضہ کی سمٹی ہوئی مسرتوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

سلیم: بھول جاؤ کہ تم ایک مریض ہو۔ سلیم کو تمہاری آنکھوں میں وہ دیکھ لینے دو جو تمہاری زبان کہنے سے ڈرتی ہے۔ کہہ دو انارکلی تم مجھ سے............!

انارکلی: صاحب عالم میری یہ آرزو نہیں کہ آپ پاؤں کی خاک کو سر کا تاج بنائیں۔

سلیم: وہ بن چکا ہے انارکلی۔

انارکلی: صاحب عالم ڈاکٹری کو رسوا نہ کیجئے۔ آپ ڈاکٹر ہیں اور میں مریض۔

سلیم: میں بلندی اور پستی کی ہر دیوار گرا دینا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں اپنا بنانا

چاہتا ہوں۔ ۱؎

ڈاکٹر جلال الدین محمد اکبر کو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس کا جانشین ڈاکٹر نورالدین محمد سلیم ایک ادنیٰ مریضہ کے عشق کا اسیر بن کر اپنے فرائض سے لا پرواہ ہو گیا ہے تب، ڈاکٹر نورالدین محمد سلیم سے اس کے فرائض سے بے توجہی اور مریضہ انارکلی کی محبت کے تعلق سے وضاحت چاہتا ہے۔ باپ بیٹے کی گفتگو کو کس خوبصورتی سے عابد معز نے تحریف میں پیش کیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

''اکبر : شیخو! ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہاری لا پرواہی بڑھتی جا رہی ہے۔ مریض شکایت کرتے ہیں تم ان میں دلچسپی نہیں لیتے۔

سلیم : ایسا تو نہیں ہے ظل الٰہی۔

اکبر : مریض غلط نہیں کہتے شیخو۔ مریض غلط نہیں کہتے۔ ہم نے بھی کئی بار دیکھا کہ تم مریضوں کا معائنہ نہیں کرتے، انہیں انجکشن نہیں چبھوتے اور کمرۂ تشخیص سے بھی اکثر غائب رہتے ہو۔ ہم سبب جاننا چاہتے ہیں۔

سلیم : کوئی خاص وجہ نہیں ظل الٰہی، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

اکبر : ہمارا تجربہ ہمیں دھوکا نہیں دے سکتا۔ شیخو تم مریض عشق ہو۔ غور کرو شیخو غور کرو۔ کیا ہم نے اس دن کے لیے تمہیں ڈاکٹر بنایا تھا کہ تم ایک ادنیٰ مریضہ کی الفت میں اپنے فرائض سے منہ موڑ لو............! شیخو انارکلی تمہارے قابل نہیں۔

سلیم : کیوں نہیں کیا وہ انسان نہیں۔ انسانیت کے ناطے سوچئے کیا وہ میرے قابل نہیں ہے۔

اکبر : بے شک وہ ایک انسان ہے لیکن شیخو تمہاری منزل ایک ادنیٰ مریضہ نہیں۔ تمہیں انسانی تکالیف کے پس پردہ محرکات کو سامنے لانا ہے۔ تم

۱؎ ۔ ڈاکٹر مغل اعظم۔ اردو ہے جس کا نام۔ زیر طبع

ڈاکٹر کے فرائض کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ تمہیں بدلنا ہوگا۔ تمہیں بدلنا ہوگا''۔ [1]

ڈاکٹر نورالدین محمد سلیم مریضہ انارکلی کے درمیان دن بہ دن پروان چڑھتی محبت کو دیکھ کر ڈاکٹر جلال الدین محمد اکبر کو اپنے وقار اور اس عظیم ہسپتال کا مستقبل اندھیروں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ سلیم اور انارکلی کی محبت کو ختم کرنے کے لیے مریضہ انارکلی کو دوسرے وارڈ میں منتقل کر دیتا ہے۔ تب سلیم اپنی ماں جودھابائی اور باپ اکبر سے اس طرح پیش آتا ہے۔ ماں باپ اور بیٹے کی گفتگو کو تحریفی انداز میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وارڈ کا منظر: بستر پر انارکلی موجود نہیں ہے۔ سلیم آتا ہے اور وارڈ میں پھر کر دیکھتا ہے اسے انارکلی نظر نہیں آتی۔

سلیم :کون ہے وہ

بازو سے مہارانی آتی ہے۔

مہارانی :کون؟

سلیم :اکبر اعظم جن کے حکم سے انارکلی سایئکاٹری (Psychiatry ward) وارڈ میں منتقل کر دی گئی۔

مہارانی :ادب سے بات کرو سلیم۔

سلیم :انارکلی سایئکاٹری وارڈ میں نہیں رکھی جائے گی۔ اُسے یہاں لانے کے لیے حکمنامہ پر ان کی مہر چاہیے۔

مہارانی :انارکلی اس وارڈ میں دوبارہ نہیں آئے گی۔

سلیم :کیوں نہیں، میں اسے لے آؤں گا۔

مہارانی :خاموش......!! ایک ڈاکٹر کو اپنا فرض نہیں بھولنا چاہیے۔

سلیم :وہ کون سا فرض ہے جو محبت کو بھی سینے میں دبا دینا چاہتا ہے۔

مہارانی :نہیں سلیم......! میرے لال تو جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سمجھ نہیں پا رہا۔

---

[1] ۔ڈاکٹر مغل اعظم ۔اردو ہے جس کا نام ۔ زیر طبع

سلیم : میں سمجھ رہا ہوں۔انارکلی مجھے بھیک میں دی جائے۔

بازو سے اکبر اسٹیج پر آتا ہے۔

اکبر :تمہیں انارکلی عطا نہیں کی جائے گی۔

سلیم : اور میں انارکلی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔انارکلی سلیم کے ارمانوں کا مرکز اوراس کی زندگی ہے۔

اکبر : معلوم ہوا۔جلیل القدر ڈاکٹر کی زندگی ایک ادنیٰ مریض ہے۔ اگر تمہارے ارمانوں کا مرکز انارکلی ہے تو تمہیں ساری زندگی تڑپنا ہوگا۔یوں ہی ضبط کرنا ہوگا۔

راجہ مان سنگھ آتا ہے۔

راجہ مان سنگھ : مہاراج مرض عشق میں مریض پر کسی قسم کی سختی مناسب نہیں ہوتی۔

اکبر :سختی مناسب نہیں تو پھر اس دیوانگی کا علاج۔

مہارانی :سلیم کو انارکلی دی جائے۔

اکبر :ناممکن ہمارا فیصلہ آپ کی اندھی محبت کا محتاج نہیں۔

مہارانی: لیکن سلیم کا محتاج ہے۔

اکبر : اس کے باوجود ہم جذبات پر اصولوں کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے''۔[1]

انارکلی کی جدائی سلیم کی دیوانگی کا سبب بننے لگتی ہے اس کی بے قراری کو دیکھتے ہوئے مجبوراً انارکلی کو ایک بار پھر اسی وارڈ منتقل کر دیا جاتا ہے۔یہاں ڈاکٹر جلال الدین محمد اکبر اور مریضہ انارکلی کے درمیان گفتگو کو تحریفی انداز میں ملاحظہ فرمائیں:

''اکبر : آخر کار تو واپس آ گئی۔اے رنگین فتنہ تو مریضہ بن کر سلیم کا دل

1۔ ڈاکٹر مغل اعظم۔اردو ہے جس کا نام۔زیر طبع

موہ لینا چاہتی ہے۔

انارکلی : ظل الٰہی مریضہ کی مجبوری کو اس کی آرزو نہ سمجھئے۔ سارے مریض گواہ ہیں کہ مجھے دل میں درد ہے۔

اکبر : بکومت، تجھے کوئی مرض نہیں ہے۔ معائنے بتلاتے ہیں کہ تیرے دل میں کوئی خرابی نہیں۔ سلیم تیرے زلف گرہ گیر کا اسیر ہو کر لاپرواہ بنتا جا رہا ہے............! مان سنگھ انارکلی کو ڈسچارج کر دیا جائے''۔ [1]

ڈاکٹر جلال الدین محمد اکبر کے فرمان پر راجہ مان سنگھ ہسپتال سے انارکلی کا ڈسچارج کر دیتے ہیں۔ وارڈ بوائے انارکلی کو ڈاکٹر سلیم کی نظروں کے سامنے گرفتار کر لیتے ہیں۔ اسی اثناء میں اکبر اعظم وارڈ میں موجود تمام سے مخاطب ہو کر تخلیہ کہہ دیتا ہے لیکن سلیم وہیں موجود رہتا ہے۔ اس حکم کی نافرمانی کے سبب دونوں کے درمیان بات تلخ کلامی تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ڈرامے کا آخری سین ہے:

''اکبر : سلیم تمہاری موجودگی نافرمانی کی دلیل ہے۔

سلیم انارکلی ڈسچارج کر دی گئی اور میں دیکھتا رہا۔

اکبر : تم کر بھی کیا سکتے ہو۔

سلیم : آج ظل الٰہی کو اپنے ظلم اور میرے ضبط کی ایک حد مقرر کرنی ہوگی۔ ظل الٰہی کیا آپ دلوں پر بھی حکومت کریں گے۔ کیا محبت کے لیے بھی آپ کا نسخہ چاہیے۔

اکبر : نسل فزیشین کی قسم۔ پیشہ طب کے مقدس عہد لینے والے سلیم تمہیں ہسپتال کی تہذیب کا پاس نہیں رہا۔ تم سزا کے مستحق ہو۔

سلیم : تو پھر ان تڑپتے ہوئے نافرمان پروانوں کو بھی سزا دینی چاہیے جو شمع پر نثار ہو جاتے ہیں۔ پھولوں پر منڈلاتے ہوئے ان بھنورے کو قید کرنا چاہیے جو محبت کے میٹھے راگ گاتا ہے۔ ندی کے مچلتے پانی کو بھی روکنا چاہیے جو

---

[1] ۔ ڈاکٹر مغل اعظم۔ اردو ہے جس کا نام۔ زیر طبع

سمندر کی آغوش میں اپنا نام ونشان مٹا دینا چاہتا ہے۔

اکبر : ہم تمہارے جذبات سے ابلتی ہوئی محبت کی دلیلیں سننا نہیں چاہتے۔

مہارانی : چندا، میرے لال تو سمجھتا کیوں نہیں۔ انارکلی کو ہم نے سوچ سمجھ کر ہی ڈسچارج کیا ہے۔

سلیم : مہارانی کیا آپ نے مجھے اسی دن کے لیے قابل بنایا تھا کہ مریض میرے ہوں اور علاج آپ کریں۔

مہارانی : سلیم تم ابھی ابھی تعلیم ختم کر کے نکلے ہو۔ امراض کو ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پاتے۔ ہم ہر دو کا بھلا چاہتے ہیں۔ ہم جو بھی کریں گے وہ ٹھیک ہی کریں گے۔

سلیم : یہی کریں گے آپ، انارکلی کے مرض کو اور پیچیدہ بنائیں گے۔

اکبر : سلیم یہ مت بھولو کہ مریضوں کو دیکھنا ہمارا بھی فرض ہے۔

سلیم : بے شک مجھے اس سے انکار نہیں۔ میں نے انارکلی کا تفصیلی معائنہ کیا ہے اور سمجھتا ہوں کہ اسے Romantic Heart Disease ہے۔

اکبر: Romantic Heart Disease! سلیم ہم تمہاری گستاخیوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر کا وقار تمہارے ہاتھوں کھلونا بن جائے، ہم مابدولت تمہیں شعبہ حادثات اتفاقی میں متعین کرتے ہیں جہاں کا ماحول تمہیں انسان بنا دے گا۔ مریضوں کی کرب اور آہیں تمہیں پھر اپنے فرض کی طرف راغب کر دیں گی ۔ ہمہ وقت مریضوں کی خدمت تمہارے دل سے انارکلی کا خیال نکال دے گی۔

تمام مریض ایک آواز ہو کر: مہابلی رحم، مہابلی رحم۔

اکبر : کوئی آج ہمارے رحم کو آواز نہ دے۔ [1]

آخر میں جلال الدین محمد اکبر اپنے جانشین ڈاکٹر نورالدین محمد سلیم کو شعبہ اتفاقی حادثات میں ڈیوٹی کا فرمان جاری کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انارکلی تمہارے ساتھ نہیں ہوگی۔ اس کی موجودگی تمہیں دیوانہ بنادیگی۔ ہسپتال کو ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ دیوانے کی............!!ڈاکٹر نورالدین سلیم اور مریضہ انارکلی کی جدائی سے مغل ہسپتال کی پرفضاء کو عشق و عاشقی کے افسانوں سے مکدر ہونے سے بچالیا گیا۔

لطیفہ گوئی

لطیفہ واقعے کی لطیف ترین صورت ہوتی ہے۔ لطیفہ کا عام تاثر یہ ہے کہ روتوں کو ہنسادے، مردہ دلوں کو زندہ دلی عطا کرے۔ لطیفہ سے مراد ایک چھوٹی حکایت یا روایت ہوتی ہے اس کہانی میں انوکھا پن ہوتا ہے۔ کچھ تعجب انگیز باتیں ہوتی ہیں اور ایسے موڑ بھی آتے ہیں جس سے سنسناہٹ سی پیدا ہوتی ہے کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی نے چٹکی لی ہو اور گدگداہٹ سارے جسم میں پھیل گئی ہو۔ اس میں کہیں طنز ہوتا ہے تو کہیں رمز و کنایا اور حاضر جوابی ہوتی ہے۔ لطیفے میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ شئے لطیف کو چھوکر ایسا احساس پیدا کرتا ہے جو سارے جسم میں تازگی اور شعور میں فرحت و انبساط کا احساس جگاتا ہے، مسکراہٹیں کھل اٹھتی ہیں اور یہ کیفیت دیر تک برقرار رہتی ہے۔ اسی لیے مزاح نگار اپنی تحریر کو دلچسپ اور شگفتہ بنانے کے لیے لطائف وظرائف کی بھی مدد لیتا ہے۔ عابد معز نے اپنے تحریروں میں لطائف کا استعمال کیا ہے ان کے ذریعہ وہ کبھی مزاح پیدا کرتے ہیں تو کبھی طنز کرتے ہیں وہ لطائف کو بروقت اور برمحل استعمال کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ حالات حاضرہ پر نظر رکھنے والے اخبار بینی کے بعد دوسروں کو خبریں سنانے اور اپنے ہمعصر دوستوں کے ساتھ خبروں پر تبصرہ کرنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ دوران گفتگو بعض جملے لطیفہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ روپئے کی قدر و قیمت ملک کی معیشت پر منحصر ہوتی ہے، کبھی بڑھتی تو کبھی کم ہوتی

---

[1] ۔ ڈاکٹر مغل اعظم ۔ اردو ہے جس کا نام ۔ زیر طبع

ہے۔ چنانچہ روپئے کی قدر و قیمت کے توسط سے ایک لطیفہ لکھتے ہیں:

''اخبار بینی کے دوران یا اخبار پڑھنے کے بعد دوسروں کو خبریں سنانے اور خبروں پر تبصرہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اخبار پڑھ کر بند کرتے ہوئے میرے ایک ساتھی نے بتایا روپیہ گر رہا ہے۔

''کہاں''۔ دوسرے ساتھی نے بے خیالی میں پوچھا۔

''جیب سے'' میں نے بتایا۔

دوسرے ساتھی اپنے جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے نیچے روپیہ تلاش کرنے لگے پھر کچھ احساس ہونے پر انہوں نے کہا۔ یہاں روپیہ کہاں ہے؟ یہاں تو ''ریال'' ہیں۔ پہلے ساتھی نے دوسرے ساتھی کو گھور کر دیکھا اور کہا، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ روپیہ کی قیمت کم ہو رہی ہے''۔

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق ذیابطیس ''اُم الامراض'' اور ''باب الامراض'' ہے یہ کئی دوسرے خطرناک امراض کو جنم دیتا ہے۔ معائنے کے بعد ہمیں بتانا پڑا کہ ہم شکر کی بیماری میں مبتلا کر دیئے گئے ہیں۔ بیماری کا نام سن کر حسب عادت بیوی سوالات کرنے لگیں۔ یہ بیماری کیسی ہوتی ہے؟ مہلک تو نہیں ہوتی؟ علامات کیا ہیں پرہیز کیا ہے؟ یہ بیماری آپ ہی کو کیوں ہوئی ہے؟ کیا یہ بیماری مجھے بھی ہوگی؟۔

سوالات کے جوابات سننے کے بعد بیوی نے حکم جاری کیا کہ اب گھر میں کوئی میٹھی چیز نہیں بنے گی، چائے پھیکی پینی پڑے گی۔ گھر میں جو شکر ہے وہ غریبوں میں تقسیم کر دی جائے گی اس واقعہ کو دلچسپ بنانے کے لیے ایک لطیفہ یوں قلم بند کیا ہے:

''بیوی کی اس فیاضی پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک راہ گیر نے کسی صاحب سے ایک سگریٹ مانگا۔ صاحب نے سگریٹ کی پوری ڈبیا اور ماچس حوالے کر دی اور راہ گیر سے اصرار کیا وہ رکھ لے۔

---

[1] ۔ ڈاکٹر مغل اعظم ۔ اردو ہے جس کا نام ۔ زیر طبع

راہ گیر متاثر ہوا۔ ''خدا نے آپ کو دولت کے ساتھ بڑا دل بھی دیا ہے۔
صاحب نے فرمایا: اس کا تو مجھے علم نہیں ہے لیکن ابھی ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ مجھے پھیپھڑوں کا کینسر ہوا ہے''۔ ۱؎

شاپنگ کرنا خواتین کی خاص فطرت ہے۔ وہ زندگی کے ہر موڑ پر شاپنگ کرنا چاہتی ہیں، بس پیسہ ہو اور موقعہ ہاتھ آ جائے۔ امریکی صدر بل کلنٹن اور ان کی شریک حیات کے سفر حیدرآباد پر ایک لطیفہ ملاحظہ فرمائیے:

''میں اس بات پر غور کر رہا ہوں کہ امریکی صدور ہمارے شہر کا رخ کیوں کر رہے ہیں۔ میں نے بیگم کو اپنی سوچ کی وجہ بتائی میں جانتی ہوں کہ امریکہ صدور ہمارے شہر کیوں آ رہے ہیں بیگم نے انکشاف کیا۔ جلدی بتائیے تاکہ میری پریشانی دور ہو سکے۔ میں نے تجسس سے کہا امریکی صدور اپنی بیگمات کو لاڈ بازار میں شاپنگ کروانے لا رہے ہیں۔ قیمتی پتھروں سے مزین حیدرآبادی چوڑیاں مشہور ہیں۔ بیگم نے وجہ بتا کر مطالبہ کیا دیکھئے میں نے آپ کا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ اب آپ بھی مجھے شاپنگ کروانے حیدرآباد لے چلیے''۔ ۲؎

ڈاکٹر عابد معز کا کہنا ہے۔ ڈاکٹر حضرات خراب تحریر کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی تحریر کو کسی طرح بھی خوش خط نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر خوش لباس، خوش اخلاق، خوش گفتار اور خوش اطوار ہو سکتے ہیں لیکن خوش نویس نہیں ہو سکتے۔ بدخطی کے معاملے میں ڈاکٹرس ایک سے بڑھ ایک ہوتے ہیں، ایسے لگتا ہے کہ ان کے درمیان خراب خط کا مقابلہ ہے، لیکن لطف کی بات ہے کہ ڈاکٹر ایک دوسرے کی تحریر بھی نہیں پڑھ سکتے صرف یہی نہیں چند برس پہلے لکھی گئی خود اپنی تحریر ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اچھا خاصا تعلیم یافتہ شخص بھی ڈاکٹروں کے خط کے سامنے اَن پڑھ دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹروں کی ہینڈ رائٹنگ پر دو لطایف ملاحظہ کیجئے۔ لکھتے ہیں:

۱؎ ۔ شکر بیتی۔ عرض کیا ہے، ص:46

۲؎ ۔ میں حیدرآباد دیکھنا چاہتا ہوں۔ کالم پھر چھڑی بات۔ شمارہ۔ 24/جولائی، 2006ء

''ایک صاحب کو ڈاکٹر نے رقعہ لکھ کر کھانے پر مدعو کیا لیکن وہ رقعہ نہ پڑھ سکے کہ دعوت کب، کہاں اور کیوں ہے۔ مدد کے لیے وہ ایک فارمیسی گئے۔ فارماسٹ رقعہ لے کر اندر گیا اور کچھ دیر بعد نمودار ہوا دو قسم کی گولیاں اور ایک شربت کی شیشی حوالے کرتے ہوئے کہا، ڈاکٹر نے آپ کے لیے یہ دوائیں تجویز کی ہیں''۔ ۱؎

ڈاکٹروں کے تعلق سے ایک اور لطیفہ بیان کرتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر کے نسخہ کی روداد یوں ہے کہ:

''میرے والد صاحب نے کسی مرض کے سلسلے میں ایک ڈاکٹر سے نسخہ لکھوایا۔ کاغذ کے اس ٹکڑے کی انہوں نے دو سال تک ریلوے پاس کے طور پر استعمال کیا۔ اس نسخہ کی بدولت ایسی محفلوں میں شریک ہوئے جہاں کسی وزیر یا گورنر کی سفارش بغیر ممکن نہ تھا۔ اس نسخے کو بطور سفارشی رقعہ انہوں نے بڑے بڑے افسروں سے کام لیے اور آخر کار یہی نسخہ انہوں نے اپنے ایک دوست کے بیٹے کو دیا جو اس کو سامنے رکھ کر ایک عرصہ سے پیانو پر موسیقی کی مشق کرتا رہا''۔ ۲؎

خود برداشتہ مزاح

طنز و مزاح کے جتنے بھی حربے ہیں ان تمام میں بالعموم کسی اور کو نشانہ ملامت بنایا جاتا ہے لیکن خود برداشتہ مزاح وہ حربہ ہے جس میں ایک مزاح نگار خود کو نشانۂ تمسخر بنا کر خود بھی ہنستا ہے اور دوسروں کو بھی ہنسنے پر آمادہ کرتا ہے، دراصل خود برداشتہ مزاح اپنے آپ کو کسی اور کی زد سے محفوظ پا کر طمانیت اور خوشی محسوس کرنے کا نام ہے۔ خود برداشتہ مزاح بلند پایہ وصاف ستھرا ہوتا ہے جس سے ایک مزاح نگار کی دماغی صحت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک مزاح نگار خو کو نشانۂ تمسخر بنا کر وسروں کو خوشی و مسرت بخشتا ہے لیکن وہ اپنی باتوں میں کہیں نہ کہیں غیر محسوس طریقے سے دوسروں کو بھی نشانہ تمسخر ضرور بناتا ہے۔

۱؎ ۔ڈاکٹر کا نسخہ، اردو میگزین، 3/جنوری 2003ء

۲؎ ۔ڈاکٹر کا نسخہ۔ اردو میگزین 3/جنوری 2003ء

ڈاکٹر عابد معز کی تحریروں میں خود پرداشتہ مزاح کے نمونے جا بجا ملتے ہیں وہ جہاں دوسروں کو طنز و مزاح کا ہدف بناتے ہیں خود کو بھی نشانۂ تمسخر بنانے سے باز نہیں آتے مندرجہ ذیل چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

عابد معز نے اُن شاعروں کو نشانہ تمسخر بنایا ہے، جو تحفے ہدیات دے کر غریب شعراء کے کلام کے حقیقی مالک بنتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ایسے شعراء کے توسط سے خود برداشتہ مزاح پیدا کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہم اپنی غزل لیے ایک شاعر دوست کے پاس پہنچے۔موصوف غیر پیدائشی شاعر اور مشہور معالج ہیں۔صرف دو سال پہلے دیار غیر میں شاعری شروع کی۔ ایک عدد مجموعہ کلام بھی چھاپ چکے ہیں۔ دوسرا تیار ہے۔ اُنہوں نے ہماری خواہش کا احترام کیا اور اردو کی خدمت کے جذبے کو سراہا اور کہا۔آپ کو میں وطن میں اپنے استاد سے رجوع کرتا ہوں۔قادر الکلام شاعر ہیں۔ میں اپنا تازہ کلام اور نذرانہ انہیں بھیجتا ہوں اور وہ اصلاح کر کے واپس کر دیتے ہیں۔بعض مرتبہ ہوا یوں کہ مصروفیت کے سبب کلام موزوں نہیں ہو پایا۔ میں نے استاد محترم کی خدمت میں صرف ہدیہ تہنیت پیش کیا اور انہوں نے جواب میں غزلیں اور نظمیں ارسال کیا۔اب یہ حال ہے کہ میں پابندی سے انہیں ہدیہ خلوص واحترام پیش کرتا ہوں اور وہ منظومات سے مجھے نوازتے ہیں''۔ [1]

عام طور پر ہر چیز کا نام اس کی خصوصیت پر رکھا جاتا ہے۔ جیسے طوطے کا پنجرہ، شیر کا پنجرہ، پاندان، اُگالدان، وغیرہ، عابد معز نے مچھردان کے توسط سے خود برداشتہ مزاح اس طرح پیدا کیا ہے لکھتے ہیں:

''ہم اپنے آپ کو مچھردان میں چھپالیتے ہیں۔طرفہ تماشہ ہے جال میں ڈر کر گھستا خود انسان ہے لیکن اسے نام مچھردان دیتا ہے''۔ [2]

---

[1] ۔عرض کیا ہے۔عرض کیا ہے۔ص:104

[2] ۔''مچھر ہم سے بازی مار گئے'' اعتماد۔7/اگسٹ 2006ء

ڈاکٹر عابد معز خود برداشتہ مزاح پیدا کرنے میں خوب مہارت رکھتے ہیں، انھوں نے خودغرض انسانوں کی فطرت کو عیاں کرنے کے لیے دوسروں کا مذاق بہت کم اُڑایا ہے۔ بلکہ اپنا ہی حلیہ سامنے رکھتے ہوئے اُن ناہمواریوں کو ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ کتّے کے مالک کے ذریعہ خودغرض انسانوں کی فطرت کو مزاحیہ صورت واقعہ کے ذریعہ یوں ظاہر کیا ہے:

''کتّے کا مالک ایک فق منش انسان ہے جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ موصوف کتے کے پیچھے بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کتے نے چار مرتبہ پیچھا چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ ثابت قدمی سے کتے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے سے پہلے ہی وہ ہمارے سر ہوگئے۔ آپ نے کتے کی عادت خراب کی ہے۔ کتا ویجیٹرین تھا۔ بچا کُچا کھالیا کرتا تھا۔ لیکن آپ نے نان ویج لقمہ پیش کر کے اس کا ذائقہ بدل دیا۔ کل سے وہ نان ویج غذا کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔

ہم نے پوچھا'' کیا اس نے پھر کسی کو کاٹا ہے؟''۔

جواب ملا'' نہیں آپ کے بعد کسی ادیب یا شاعر کا ادھر سے گذر نہیں ہوا''۔

ہم انہیں جتنا سمجھاتے کہ کتا پیدائش نان ویج مخلوق ہے اتنا ہی وہ طیش میں آ کے کہنے لگے'' میں اپنے کتے کو خوب پہچانتا ہوں۔ اس کی پرورش میرے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اسے بھونکنا اور کاٹنا میں نے ہی سکھایا ہے'' [1]

شاپنگ کر کے اپنے زیورات کی نمائش کرنا۔ خود کو دوسری خواتین سے موازنہ کرنا۔ رشک کرنا، بات بات پر شوہر سے ناراض ہونا۔ شوہر پر ہر دم حکم چلانا اور رکھ رکھاؤ وغیرہ خواتین کی فطرت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں خواتین شادی بیاہ میں شرکت کرنے سے پہلے بال سنوارنا، نت نئے کپڑے اور زیورات سے آراستہ، سج دھج کر اپنے آپ کو خوشبو سے معطر کر کے محفل میں جانا بھی پسند کرتی ہیں۔ خاص محفلوں میں وہ اپنے شوہر کو

---

[1] سگ گزیدہ۔ سگ گزیدہ۔ ص: 21-20 سن اشاعت 1995ء

اسی رنگ میں رنگنے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں لیکن مردوں کو ایسا کرنا گراں لگتا ہے۔شادی بیاہ کے موقع پر بیوی کے ساتھ شوہر کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شادی کا دن آ پہنچا، بیوی کے کہنے پر میں نے دفتر سے چُھٹی لی۔صبح سے شادی میں جانے کی تیاریاں شروع ہوگئی۔میرے لیے سوٹ نکال کر رکھ دیا گیا۔حکم ہوا کہ استری کرلوں۔سو میں نے سوٹ پر استری پھیرلی۔صبح شیو کرنے سے منع کر دیا گیا کہ شام میں ڈاڑھی بڑھی ہوئی نظر آئے گی۔دوپہر بارہ بجے حکم ہوا کہ شیو کرلوں اور چلنے کی تیاری شروع کروں۔ میں نے کہا، ابھی دوپہر ہے۔سہ پہر باقی ہے۔شام ہوگی تب چلیں گے۔بیوی نے کہا''جی نہیں ہم ابھی اور اسی وقت چل رہے ہیں۔میری سہیلی کی شادی ہے۔ہمیں دو دن قبل جانا چاہیے تھا۔ہم مہمان نہیں میزبان ہیں۔شام کی تقریب کے لیے میں نے دوپہر میں سوٹ پہنا۔سوٹ پہننے کے بعد بیوی نے آگے پیچھے گھوم کر دیکھا اور مشورہ دیا شانے سامنے جھکا کر نہ رکھئے،شانوں کو پیچھے کر کے سینہ آگے کیجیے''۔

میں نے اثبات میں گرن ہلائی تو بیوی نے ڈانٹا''گنوار کی طرح گردن مت ہلائیے گا۔لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔فنکشن میں زبان سے کام لیجئے''۔اب میں انہیں کیا بتاتا کہ نکاح کے وقت میں نے انہیں اور انہوں نے مجھے گردن ہلا کر قبول کیا تھا۔بیوی نے میرے بال سنوارے، بالوں کو نیا انداز دیا۔ٹائی کی گرہ ٹھیک کی۔ مجھے سینٹ سے معطر کیا اور اپنے شوہر کو لے کر میری بیوی شادی میں شرکت کے لیے روانہ ہوئیں۔میں بیوی کے پیچھے بوجھل قدموں سے ایسے چل رہا تھا جیسے قصائی کے پیچھے بکرا کھینچا چلا جاتا ہے''۔[1]

موٹاپا سے جسمانی ہئیت اور شکل وصورت میں تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ ہمدرد وزن کم کرنے

---

[1] ۔شریف بدمعاش۔سگ گزیدہ۔ص:48-47،سن اشاعت جنوری1995ء

کا مشورہ دیتے تو اغیار مختلف القاب سے نوازتے ہیں۔موٹاپا کے توسط سے خود برجستہ مزاح یوں بیان کیا ہے لکھتے ہیں:

''غرض ہماری شکل ایسی ہوئی کہ کوئی لڑکی ہمیں نظر بھر دیکھنا گوارا نہیں کرتی بلکہ یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ہم نظروں میں سما نہ سکتے تھے۔ ہماری بیوی خوش ہوئی کہ ان کے سر سے سوت کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل گیا۔ بدلی ہوئی ہیئت ایسی تھی کہ کوئی ہمیں دیکھ کر خاموش نہ رہ سکتا تھا۔ زیر لب مسکراتا اور کچھ نہ کچھ کہتا ضرور تھا۔ ہمدرد وزن کم کرنے کا مشورہ دیتے تو اغیار مختلف القاب سے نوازتے۔ گوشت کی دوکان۔ کنگ کانگ، جنیٹ، سفید ہاتھی، تھیلا، موٹو، پیٹو، جتنے منہ اتنے نام۔ بچے ہمیں دیکھ کر سہم جاتے، بعض بچے تجسس سے ہمیں دیکھتے اور تالیاں بجاتے ہوئے پیچھے پڑ جاتے۔ ہماری شخصیت بچوں کو ڈرانے کے کام بھی آنے لگی۔ مائیں بچوں کو ڈراتیں۔ بیٹا جلد کھالے ورنہ وہ موٹا جن تجھے کھالے جائے گا''۔[1]

محاورے اور ضرب الامثال

محاورے وضرب الامثال سے مراد وہ جملے ہیں جو زبان زد عام ہو جاتے ہیں اور ایک خاص طرح کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ان میں ردو بدل کر کے یا ان کو توڑ مروڑ کر یا ان کی ترکیب کو بدل کر مختلف معنوں کا اظہار کرنا بھی ایک طرح کی ظرافت ہے۔ایک کامیاب مزاح نگار محاوروں میں تحریف کر کے نئے معنیٰ پیدا کرتا ہے یا ان میں چند الفاظ کا اضافہ کر کے کچھ کا کچھ مطلب نکال کر حسب منشا یا موقع کے لحاظ سے استعمال کر کے کبھی طنز کرتا ہے تو کبھی مزاح پیدا کرتا ہے۔

ڈاکٹر عابد معز نے بھی اپنی تحریروں میں محاوروں اور ضرب الامثال کے ذریعہ اپنی تحریروں میں طنز و

---

[1] ۔ہمارا موٹاپا۔سگ گزیدہ۔ص:32۔1995ء

مزاح پیدا کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ مثلاً ''چار آنے کے بندر کو بارہ آنے کی رسی''۔ ''کتا جگ جگ جیئے سو برس کی عمر ہو'' آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے، چراغ تلے اندھیرا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ کھیلو کودو گے ہوگے خراب۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ محبت اور مشک چھپے نہیں چھپتے، چراغ تلے اندھیرا، وغیرہ۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ایک کامیاب مرد کے پیچھے عورت ہوتی ہے لیکن ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام، صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی جس نے ملک کے دو سب سے بڑے عہدوں پر فائز رہ کر ہمیں بتایا کہ صنف نازک کے بغیر بھی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس طرح مجرد اشخاص نے شادی شدہ مردوں کے اعتماد کو نہ صرف بحال کیا بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام صدر جمہوریہ ہند منتخب ہوئے تھے اس وقت میں نے ایک فکاہیہ کالم تحریر کیا تھا جو 26 جولائی 2002ء کو اردو میگزین جدہ سعودی عرب میں شائع ہوا تھا۔ میں نے توقع ظاہر کی کہ ہمارے ملک کے وزیر اعظم مجرد ہیں اور اب صدر بھی کنوارے آ گئے ہیں۔ 'خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے کنوارے دو' والی کیفیت سے مجھے ملک کا مستقبل بہت تابناک نظر آتا ہے''۔ [1]

شادی کے بعد میاں اور بیوی کے درمیان ہمیشہ سرد جنگ جاری رہتی ہے۔ یہ جنگ کبھی غلط فہمی سے پیدا ہوتی ہے، تو کبھی محبت سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ جس میں بیوی کم شوہر زیادہ پریشان ہوتا ہے بلکہ رہتا بھی ہے۔ شادی اور بیوی کے تعلق سے محاورہ ملاحظہ کیجئے:

> ''کسی مظلوم شوہر کا کہنا ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا غم شادی اور سب سے بڑی پریشانی بیوی ہے۔ اگر بس میں ہوتا تو ہم دنیا کے تمام مردوں کو شادی نہ

---

[1] ۔صدارت سے پھر تدرس کی طرف۔ اعتماد۔ 30/ جولائی، 2007ء

کرنے کا مشورہ دیتے لیکن یہ صلاح دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ 'سقراط کا زہر پینا'
سقراط ہی نے کہا تھا کہ ہر مرد کو شادی ضرور کرنی چاہئے۔ اچھی بیوی ملی تو زندگی
ہنسی اور خوشی گذرتی ہے۔ اور خراب بیوی شوہر کو فلسفی بنا دیتی ہے''۔ ۱

ڈاکٹر عابد معز کے خیال میں اگر کسی نوجوان کے چہرے پر ڈاڑھی اور سر پر ٹوپی ہو تو اسے کھلا نہیں چھوڑنا چاہئے:

''گرفتاری کے لیے ڈاڑھی اور ٹوپی یہی دو ثبوت کافی ہیں۔ گرفتار کرنے کے
بعد پولس دوسرے ثبوت اکٹھا کرنے لگتی ہے۔ اکثر اوقات یوں ہوتا ہے کہ
ڈاڑھی اور ٹوپی کے علاوہ کوئی تیسرا ثبوت ہاتھ نہیں لگتا اور صاحب ڈاڑھی اور ٹوپی
اندر ہی رہتا ہے۔ ڈاڑھی کی گرفتاری پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری پولس کا اس
بات پر پختہ ایمان ہے کہ 'کرتا مونچھ والا اور پکڑ جاتا ڈاڑھی والا ہے''۔ ۲

انسان کی یہ فطرت رہی ہے کہ وہ جب کبھی کسی معاملہ یا پریشانی میں مبتلا ہوا تو ان لمحات میں وہ مالک حقیقی سے پناہ کی فریاد کرتا ہے۔ چنانچہ اس تعلق سے ایک ضرب المثل ملاحظہ فرمائیں:

''لڑاکو خاں پہلوان کے وکیل ہمیں گھورتے ہوئے کٹہرے کے قریب آئے
۔ راستے میں رکھے ہوئے اسٹول کو پاؤں سے دھکیلا۔ ہم 'جل تو جلال تو آئی بلا
کوٹال تو' کے وظیفہ کا ورد کرنے لگے''۔ ۳

ایک بزنس مین اپنی ہوشیاری کڑی محنت اور جستجو سے چند سالوں میں لکھ پتی یا کروڑ پتی بن سکتا ہے ۔ لیکن ایک ملازم سرکار کڑی محنت وجستجو وغیرہ سے بزنس مین کی طرح چند سالوں میں امیر ہو نہیں سکتا، ملازم سرکار اور بزنس مین کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے محاورہ کا استعمال اس طرح کیا ہے:

---

۱ ۔ مضمون گھونگھٹ الٹنے سے پہلے، سگ گزیدہ۔ ص:111
۲ ۔ پھر چھڑی بات۔ شہر الحلیم، اعتماد، 24 ستمبر 2007ء
۳ ۔ شریف مدمعاش۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت، ص:48

''ملازمت کی دھاک پر ضروریات زندگی ماہانہ آسان اقساط پر خریدا کرتے ہیں۔ یوں بھی ایک ملازم کی زندگی اقساط میں گذرتی ہے۔ مہنگائی الاؤنس قسطوں میں بڑھتا ہے سالانہ قسط وار تنخواہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ گریجویٹی کو ملازم قسط وار جمع کرواتا ہے۔ ملازم اپنی زندگی میں صرف قرض یکمشت حاصل کرتا ہے جسے وہ قسطوں میں چکاتا ہے۔ ملازمت میں 'دن دونی رات چوگنی' ترقی کا امکان نہیں رہتا''۔ [1]

بعض ماہرین کہتے ہیں کہ جس نے عشق نہیں کیا وہ پوری غزل تو کیا ایک شعر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ محبت اور شاعری کے تعلق سے ایک محاورہ ملاحظہ کیجئے:

''محبت اور شاعری میں 'چولی دامن' کا رشتہ ہے۔ کہتے ہیں کہ عشق کے بغیر شاعری کرنا جھک مارنے کے مترادف ہے۔ محبت کرنے والے ہر حال میں شاعری کرتے ہیں۔ ناکام محبت سے تو اور اچھے نتائج نکلتے ہیں''۔ [2]

شہر حیدرآباد کی سڑکیں بے ہنگم ہیں۔ کشادہ سڑک چلتے چلتے تھوڑی دور بعد تنگ ہو جاتی ہے۔ کچھ مقامات ایسے ہیں کہ ایک گلی سے گذرنے کے بعد وسیع میدان ملتا ہے۔ اجنبی تو اجنبی خود مقامی لوگ ان گلیوں میں گذرنے سے کتراتے ہیں، چنانچہ حیدرآبادی سڑکوں اور گلیوں کے تعلق سے ایک ضرب المثل پیش کیا ہے:

''شہر حیدرآباد کی سڑکیں عجیب وغریب اور بے ہنگم ہیں۔ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ایک کشادہ سڑک چلتے چلتے پتلی بن جاتی ہے اور کبھی تنگ اور تاریک گلی میں سے ایک میدان نکل آتا ہے۔ پرانے شہر کی گلیاں تو وبال جان ہوتی ہیں اجنبی کو چھوڑیئے خود حیدرآبادی ان گلیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے 'تبھی تو صبح کا بھولا

---

[1] ۔ اٹھاون، پچپن اور تیس، تینتیس۔ واہ حیدرآباد۔ ص:96

[2] ۔ فارغ البال۔ سوز محبت۔ ص:65

شام گھر آئے تو اسے حیدر آباد کی گلیوں کا مارا' کہتے ہیں''۔ [1]

ذیابیطس کے مریضوں کی پسندیدہ غذا میٹھی چیزیں ہوتی ہیں۔لیکن میٹھی چیزیں ان کے لیے ممنوع ہو جاتی ہیں۔ پھر بھی ذیابیطس کے مریض چوری چھپے میٹھی چیزیں کھاتے رہتے ہیں۔ ذیابیطس کے مریضوں کے عادت واطوار پر ایک ضرب المثل بیان کرتے ہیں:

''ابن آدم کو ہمیشہ سے ممنوعہ چیزیں کھانے کا شوق رہا ہے۔ یہ مرض کا اصرار تھا یا انسانی فطرت کا تقاضہ، پتا نہیں کیا بات تھی کہ جب سے ہم شکر کے مرض میں مبتلا ہوئے، میٹھی اشیاء کچھ زیادہ ہی بھانے لگیں۔ ہر دن آدھا چمچہ اور کبھی کبھار میٹھا چکھنے سے طبیعت سیر نہ ہوئی تو ہم ناجائز طریقوں سے میٹھا کھانے لگے۔ موقع کی تلاش میں رہتے کہ کب بلّی کچن میں جاتی ہے، تب ہم بھی میٹھے کی بھوک مٹانے کچن کا رخ کرتے۔ پکڑے جانے پر بلی کو بھگانے کا بہانہ کرتے۔ کچھ دن بلی کا ڈرامہ چلتا رہا۔ گھر والوں نے کچن کو بلی اور ہم سے محفوظ کرنے کے اقدامات کیئے تو ہم اپنی میٹھی بھوک مٹانے ہوٹل میں میٹھا کھانے لگے۔ اب ہمیں پتا چلا کہ 'چوری کا گڑ میٹھا کیوں ہوتا ہے'۔'' [2]

انسانوں کے برخلاف کمپیوٹر آج کے کام کو کل پر نہیں ٹالتا ہر کام چند سکنڈ میں کر کے دے دیتا ہے۔ اس کی انکساری اور فرمانبرداری کی انتہا ہے کہ بٹن دبایا خدمت کے لیے ہر دم تیار چنانچہ پی سی کی خصوصیات کو الہ الدین کا چراغ سے موازنہ کرتے ہوئے محاورہ کا استعمال یوں کیا:

''مختلف کتابوں کو پڑھتے، لوگوں سے پوچھتے اور خود پی سی کی راہنمائی میں، بیگم اور بچے پی سی استعمال کرنے کے قابل ہوئے۔ خوب وقت گذرنے لگا، میں نے جب اس نئی تفریح کا ذکر اپنے ایک دوست سے کیا تو انہوں نے مشورہ دیا،

---

[1] ۔ واہ حیدر آباد۔ ہماری سڑکیں۔ سن اشاعت اگست۔ 1983ء ص:64

[2] ۔ شکر بیتی۔ سگ گزیدہ۔ ص:49-50

میاں تم اپنے پی سی کو مختلف دوسرے پی سی سے جوڑ دو۔ بہت لطف آئے گا۔
تمہارے قبضے میں ایک نہیں کئی 'الہ الدین کے چراغ ہوں گے'۔ ۱

اکثر سردیوں میں انسان جسم کی سردی کو چائے کی گرمی سے ختم کرنا چاہتا ہے آگے وہ لکھتے ہیں میں ایک دفعہ شدید سردی کی وجہ سے بار بار چائے پیتا جا رہا تھا۔ میری چائے نوشی دیکھ کر بیوی کہنے لگی، دو گھنٹوں میں چار پیالی چائے پی لی ہے۔ اب مزید چائے نہیں ملے گی۔ بیگم نے چائے بنانے سے انکار کر دیا۔ کثرت چائے نوشی پر بیوی ایک دکنی محاورے کے ذریعہ یوں تنبیہ کرتی ہیں:

''اتنی چائے پینے کے باوجود سردی کم نہیں ہوئی اس مرتبہ ذرا کڑک چائے بنائیے تاکہ ایک پیالی ہی سے میری حالت بہتر ہو جائے۔ بیگم کے انکار کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے اصرار کیا۔

''سردیوں کا موسم ہے چائے پی کر پیٹ خراب کر لینے کے بجائے سردی برداشت کیجئے'' مجھے سمجھانے کے لیے بیگم کہنے لگیں ''مثل عام ہے کہ 'اوڑھتے سواس کو سردی بڑی' جی ہاں یہ بھی مشہور ہے کہ 'کھاتے سواس کو بھوک بڑی اور سوتے سواس کو نیند بڑی' میں نے جل کر کہا'' آپ سے ایک پیالی چائے کے لیے کہا کہ آپ محاورے اور مثالیں بیان کرنے لگیں، اس سے بہتر ہے کہ میں خود چائے بنالوں''۔ ۲

کپڑا ہر انسان کی ضرورت اور زینت ہے۔ انسان اور حیوان کے درمیان ایک فرق کپڑا بھی ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے کپڑوں سے ہوتی ہے۔ کپڑوں سے مختلف لباس تیار کئے جاتے ہیں جیسے شرٹ پینٹ۔ پاجامہ کرتہ، شیروانی، سوٹ، سفاری، کوٹ وغیرہ ان میں سوٹ کوٹ سفاری مہنگے لباس سمجھے جاتے ہیں کیونکہ ان کی سلوائی کپڑے سے زیادہ مہنگی ہوتی ہے۔ سوٹ سفاری پر محاورہ ملاحظہ کیجئے:

۱۔ پی۔ سی۔ سگ گزیدہ۔ ص:10

۲۔ سردی، سردی، اردو میگزین۔ 7 رفروری، 2003ء

''سوٹ یا کوٹ مہنگا لباس ہے۔ اور اس لباس پر' چار آنے کے بندر کو بارہ آنے کی رسی' والا محاورہ صادق آتا ہے کوٹ کی سلوائی بہت مہنگی ہے۔ اور کپڑا سستا بھی ہو تو سلوائی کے دام میں فرق نہیں ہوتا''۔ [1]

خواتین اپنے شوہر سے کبھی روٹھتی ہیں تو کبھی روٹھے ہوئے شوہر کو اپنی وفا سے منانے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔ خواتین کے خیال شوہر سے میں کچھ خامیاں بھی رہتی ہیں۔ پھر بھی وہ اپنے شوہر کے دکھ درد میں ہمیشہ شامل رہتی ہے۔ بلکہ شوہر کی محبت میں اپنی جان دینے کو تیار رہتی ہے۔ جیسے شوہر کو کتے کے کاٹنے پر کتے کو کوسنے لگتی لیکن ڈاکٹر کے کہنے پر اس کتے کے لیے درازی عمر کی دعائیں مانگنے لگتی ہے۔ بیوی کے حقیقی جذبہ کو بیان کرتے ہوئے اس طرح محاورہ لکھا ہے:

بیوی زخم کے آگے پنکھا ہلاتے ہوئے کتے کو کوسنے لگیں۔ خبیث کے دانتوں میں کیڑے پڑے، دانت جھڑ جائیں، موا کسی لاری کی نیچے آ کر مر جائے.............!''
ہم نے فوراً بیوی کا منہ بند کیا۔ ایسی بدشگونی نہ کرو۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میری جان کتے میں ہے۔ دس دنوں کے لئے ہم نے انہیں ڈاکٹر کی ہدایت سمجھائیں۔
بیوی اپنے سہاگ کی خاطر کتے کی درازی عمر کی دعائیں مانگنے لگیں ''کتا جگ جگ جیئے سو برس کی عمر ہو''۔
جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے یہ بھی کہا۔ میری عمر اس کتے کو لگ جائے''۔ [2]

یہ حقیقت ہے کہ گاؤں سے ترکاریاں، اجناس، پھل، دودھ ہر روز شہر جاتی ہیں لیکن ایسی چیزیں گاؤں کے لئے ہفتہ میں ایک بار دستیاب ہوتی ہیں۔ ورنہ انہیں خریدنے کے لئے شہر کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ شہر اور گاؤں کی تہذیب مشترکہ نہیں ہوتی۔ ان میں نمایاں فرق مثلاً کھانے پینے، بات چیت، لباس، رہن سہن،

---

[1] ۔ کارٹون کارٹن لے جا رہا ہے۔ اردو میگزین، 22/مارچ 2002ء

[2] ۔ سگ گزیدہ۔ سگ گزیدہ۔ ص:14 سن اشاعت 1995ء

وغیرہ میں بھی ہوتی ہے۔اس سلسلے میں ایک محاورہ اور ایک ضرب المثل ملاحظہ کیجیے:

''رات کا کھانا پروسا گیا، ہم شابو کی تقلید کرتے ہوئے فرش پر 'آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے'۔موز کے پتّے پلیٹ بنے اور لکڑی کے چمچے سے چاول ڈالا اور اسی چمچے سے ترکاری کا سالن ڈالتے ہوئے شابو کی ماں نے کہا 'مشکل سے بیگن ملے ہیں۔گاؤں میں جتنی ترکاری پیدا ہوتی ہے اسے شہر بھیج دیا جاتا ہے۔دودھ، انڈے اور مرغیوں کو بھی شہر بھیجا جاتا ہے۔ ہمارے حصہ میں بچی کھچی چیزیں آتی ہیں۔اسی کو کہتے ہیں 'چراغ تلے اندھیرا،''۔ [1]

بعض سوالات پیچیدہ اور الجھے ہوئے ہوتے ہیں ان کا کوئی حل نظر نہیں آتا جیسے ''مرغی پہلے یا انڈا'' اس معمہ کے توسط سے مزاحیہ انداز میں اس طرح ضرب المثل کا استعمال کیا:

''لوگ صدیوں سے ان پر غور فکر کر رہے ہیں۔اور انہیں تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔اس قماش کا ایک سوال مرغی پہلے یا انڈا؟ ہے۔ یہ مرغیوں اور انڈوں سے زیادہ انسان کو روز اول سے پریشان کر رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان پریشان ہونے کے بجائے، مرغیوں اور انڈوں پر ہی ہاتھ صاف کرتا جارہا ہے۔ کسی دانا کا قول ہے کہ کسی سوال کا آسان جواب یہ ہے کہ سوال ہی کو ختم کر دیا جائے۔'نہ رہے بانس نہ بجے بانسری''۔ [2]

ماضی میں ایک عام انسان کو دولت مند بننے کے لیے علم، عمل، تجربہ، کڑی محنت درکار ہوتی تھیں۔ لیکن آج کا انسان صرف کھیل کود سے دولت مند بنتا جارہا ہے۔''کھیلو کودو گے تو ہو گے خراب'' کے ضرب المثل کو یوں پیش کیا ہے:

''دولت مند بننا اتنا آسان ہے کہ لوگ کھیل کود کر پیسہ کما لیتے ہیں۔آج

---

[1] ۔گاؤں کی سیر۔سگ گزیدہ۔ص:180

[2] ۔مرغی انڈا کیوں دیتی ہے۔اردو میگزین۔3/ستمبر 1999ء

کھیلوں میں پیسہ ہی پیسہ ہے۔ وہ دن گئے جب کہا جاتا تھا ''کھیلو کودو گے تو ہو گے خراب'' کھلاڑی بنے دولت مند بنے کے مترادف ہے۔ میرے ایک دوست اپنے لڑکے کی پڑھائی سے زیادہ اس کی ''کھیلائی'' پر توجہ دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کھیل میں اتنا پیسہ ہے کہ اب پڑھنا لکھنا فائدہ مند نہیں رہا''۔ ۱؎

انسان کے دکھ درد اور نازک حالات میں بیوی ہی واحد مددگار ہوتی ہے۔ جو ہمت دلاتی ہے، حوصلے بڑھاتی ہے، ان حوصلوں کی بدولت کبھی کبھار شوہر ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جب مرد کے ساتھ عورت ہوتی ہے تو کیا کچھ نہیں۔ بیوی کے حوصلوں پر ایک محاورہ لکھتے ہیں:

''جب مرد کے ساتھ عورت ہوتی ہے۔ تو کیا کچھ نہیں ہوتا۔ تاج محل تک بن جاتا ہے۔ اس لئے 'مرتا کیا نہ کرتا' ہم نے مکان نا بنوانے کا خیال چھوڑ دیا''۔ ۲؎

دو محبت کرنے والے عاشق اور معشوق اپنے محبت کا اظہار دنیا والوں کے سامنے ہونے نہیں دیتے، لیکن دنیا والوں کے سامنے محبت عیاں ہو جاتی ہے چنانچہ محبت کو مشک سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محبت اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، محبت عیاں ہونے لگتی ہے تو دل والے دنیا والوں سے محتاط ہو جاتے ہیں''۔ ۳؎

تراکیب

ڈاکٹر عابد معز نے اپنی تحریروں میں محاوروں وضرب الامثال اور کہاوتوں کے علاوہ ترکیبوں کا بھی برمحل استعمال کیا ہے۔ وہ تراکیبوں کا استعمال اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ تراکیبیں ایک خاص معنی و مفہوم دے جاتی ہیں اور ان تراکیبوں کے ذریعہ وہ کبھی طنز کے تیر چلاتے ہیں تو کبھی مزاح کی پھلجھڑیاں

۱؎ ۔ پیسہ کمانا آسان ہے۔ اردو میگزین 27/دسمبر 2002ء

۲؎ ہم نے مکان بنایا۔ سگ گزیدہ۔ ص:122

۳؎ ۔ سوز محبت ۔ سگ گزیدہ۔ ص:71۔ سن اشاعت 1995ء

چھوڑتے ہیں۔

ڈاکٹر عابد معز کے خیال میں مشاعرے کے اختتام پر جو شکریہ ادا کیا جاتا ہے شعراء کے بجائے پہلے سامعین کا اور بعد میں شعراء کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ سامعین کی تعداد کم سے کم ہوتی جا رہی ہے اور شعراء کی تعداد دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔ سامعین اور شعراء کے تعلق سے اس طرح کی تراکیب استعمال کی ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

''میں آپ تمام سامعین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ حضرت کا شمار 'جنس نایاب' میں ہونے لگا ہے۔ حضرات آپ کے سبب محفل میں زندگی رہے گی جس کے لئے میں سپاس گزار ہوں''۔ ۱؎

رمضان المبارک کے مہینے میں بعد افطار خوب ڈٹ کر کھایا اور پیا جاتا ہے، جیسے پھل پھلاری تلن، پکوڑے، میٹھے مٹھایاں اور اس پر روزمرہ کا کھانا معدہ میں یوں ٹھونسا جاتا ہے جیسے کسی تھیلے میں بھونسہ بھرا جاتا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں تو افطار ہضم نہیں ہوتا۔ اور افطار ہضم نہیں ہوگا، تو دو چار گھنٹوں بعد سحر کیسے کی جاسکے گی۔ اس تعلق سے ایک نئی ترکیب ملاحظہ فرمائیں:

''رمضان خرامی؟ میں نے حیرت سے پوچھا یہ کیا ہے۔ افطار کے بعد رات میں جو گھومنا گھمانا ہوتا ہے۔ اسے میں نے رمضان خرامی کا نام دیا ہے۔ موصوف نے 'رمضان خرامی' کی تعریف کی''۔ ۲؎

ڈاکٹر عابد معز کے خیال میں عام زندگی پر فلموں کا اثر اتنا گہرا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم زندگی گزار نہیں رہے ہیں بلکہ ہمہ وقت شوٹنگ میں مصروف ہیں۔ فلموں کی بدولت ''لو'' Love عام ہوگئی۔ وہ بھی محبت کرنے لگے ہیں جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔ آج کے نوجوان کے آئیڈیل بدل گئے۔ پڑھ لکھ کر سائنس داں انجینئر ڈاکٹر یا وکیل بننے کے برخلاف بن سنور اور سج دھج کر فلمی اداکار بننا چاہتے ہیں۔ فلم بینی کی لت سے دور

۱؎۔ پیشگی خطبہ صدارت۔ ماہنامہ شگوفہ عابد معز نمبر۔ نومبر 2008ء۔ ص:71

۲؎۔ رمضان خرامی۔ اردو نیوز 2002ء ص:26

رہنے کے لیے ہمیں فیملی پلاننگ کی طرح فلمی پلاننگ اپنانا چاہیے اس تعلق سے ایک نئی ترکیب یوں پیش کی ہے لکھتے ہیں:

> ''فلموں اور فلم زدہ ماحول سے پریشان ہو کر میں 'فلمی پلاننگ' کے تعلق سے سوچنے لگا جس طرح 'فیملی پلاننگ' سے خوش حالی آتی ہے، ویسے ہی میں نے قیاس کیا کہ فلمی پلاننگ کے ذریعہ کچھ ڈھنگ کی زندگی گزرے گی، میں نے دو یا ایک بس، کا نعرہ اپنایا۔ اپنے گھر میں 'فلمی پلاننگ' پر عمل کرنے کی ٹھانی، خاندان کے سبھی افراد نے ہفتہ میں دو فلموں پر اکتفا کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس فیصلہ سے بہت خوش ہوا''۔ ۱؎

کمپیوٹر ہر دم کام کے لیے تیار رہتا ہے۔ وہ اس قدر معاون ہے کہ وہ خود بتاتا جائے گا کہ اس سے کس طرح کام لیا جائے۔ بعض مرتبہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمارا محکوم نہیں بلکہ ہم اس کے غلام ہیں۔ اس کی دیگر خصوصیات کی بدولت آج ہر فرد کی ضرورت بن چکا ہے۔ چنانچہ پی سی کی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک ترکیب یوں بیان کی گئی ہے:

> ''پی سی یعنی پرسنل کمپیوٹر، موجودہ دور کا الیکٹرانک 'ہر فن مولا' خریدنے مارکیٹ گئے تو پتہ چلا کہ پی سی اکیلا خود سے کچھ بھی نہیں ہے۔ پی سی کنبہ پرور ہے اور اس کا ایک پورا خاندان ہے''۔ ۲؎

کلوننگ کے ذریعہ کسی بھی انسان یا جانور کی نقل کو وجود میں لایا جا سکتا ہے یہ اصل کی ہو بہو نقل ہوگی۔ اس کی دو مائیں ہوتی ہیں لیکن کوئی باپ نہیں ہوتا۔ انسانی قلمی کی موجودگی میں کئی مسائل کا سامنا ہوگا یہ انسانوں کی ایک نئی نسل ہوگی۔ جب اس کی الگ شناخت ہوگی تو نیا نام بھی رکھا جائے گا یا اسے ''کاپی فلاں'' کہا جائے۔ اگر نقل ایک سے زائد ہو تو نقل کے ساتھ عدد کا اضافہ کیا جائے گا، جیسے نقل فلاں نمبر ایک

۱؎ ۔ فلمی پلاننگ ۔ سگ گزیدہ ۔ ص:51

۲؎ ۔ پی ۔ سی ۔ سگ گزیدہ ۔ ص:8

نقل فلاں نمبر دو وغیرہ چنانچہ قلمی انسان کی لیے ڈاکٹر عابد معز اپنی جدّت طرازی سے ایک انوکھی ترکیب یوں پیش کرتے ہیں:

''قلمی انسان تیار کرنے کا سب سے اہم فائدہ سائنسداں یہ بتلاتے ہیں کہ وہ اپنے اصل کی ہو بہو نقل ہوگا۔کلوننگ کے ذریعہ کسی بھی شخص کی نقل کو وجود میں لایا جاسکتا ہے اور انسان کو نہ ختم ہونے والی زندگی مل سکتی ہے یہ ایک بہت بڑی سہولت ہے جو موجودہ دور کے انسان کو میسر آئی ہے۔اب کسی کے گذر جانے پر خلا پیدا نہیں ہوگا بلکہ اس جیسا ایک اور انسان پیدا کرلیا جائے گا۔ بڑے لوگوں کے مجسمے تیار کر کے نصب کرنے کی اب ضرورت نہیں ہوگی۔ان کے جیسے کئی قلمی انسانوں کو تیار کر کے زمین کے طول وارض پر پھیلا دیا جائے گا۔خواہشمند لوگ بلا شرکت غیرے خالص اپنی اولاد پیدا کر سکتے ہیں۔ان قلمی انسان کو اولاد کہنا شاید مناسب نہیں ہے۔اسے کوئی دوسرا نام دینا پڑے گا میں اسے ''قلمی شاہکار'' کہنا چاہوں گا''۔ [1]

غریبی کی جڑیں بڑی مضبوط ہوتی ہیں انہیں جڑ پیڑ سے نکالنے کے لیے بلند ارادے وعمل کی ضرورت ہوتی ہے سیاسی نعروں سے غریبی دور ہو نہیں سکتی۔غریبی میں وہ قوت ہے کہ نہ دور ہوتی ہے اور نہ ہی کم ،اپنی جگہ سے سرکتی تک نہیں دنیا کی بڑے بڑے طاقت ور ممالک نے اس کو دور کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔پھر بھی ناکام نظر آتے ہیں۔شاید دنیا کے موجوہ رائج نظام میں کسی کے پاس بھی غریبی ہٹانے کا نسخہ نہیں ہے۔روز اول سے جہاں تھی سو اب بھی وہیں ہے بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔اس کے باوجود ہمارے سیاسی رہنما الیکشن کو مدنظر رکھتے ہوئے ووٹ کے خاطر غریبی ہٹاؤ کا نعرہ بلند کرتے رہتے ہیں۔غریبی ہٹاؤ نعرے کے توسط سے سیاسی لیڈروں پر طنز کرتے ہوئے ایک ترکیب یوں بیان کی ہے:

''غریبی ہٹاؤ ایک انتخابی نعرہ ہے جسے ہر سیاسی جماعت استعمال کرتی ہے اور

---

[1] ۔خوش آمدید قلمی انسان،اردو میگزین مارچ 2003ء

جو سیاسی قائدین کا 'تکیہ کلام' بھی ہے۔ سیاسی جماعتوں کی نظریات کسی محاذ پر ملتے نہ ہوں گے اوران کا طریقہ کار بھی مختلف ہوگا لیکن ہر جماعت غریبی ہٹاؤ کا نعرہ ضرور بلند کرتی ہے۔ اس طرح ہر لیڈر خواہ وہ برسر اقتدار یا مخالف جماعت سے تعلق رکھتا یا آزاد امیدوار ہے اس نعرہ کا اتنا ورد کرتا ہے کہ غریبی ہٹاؤ اس کا 'تکیہ کلام' بن جاتا ہے''۔ [1]

تشبیہات

ڈاکٹر عابد معز اپنی تحریروں میں تشبیہات کے استعمال سے بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان تشبیہات میں ندرت اور چونکا دینے والی کیفیت مضمر ہوتی ہے۔ وہ اپنے مخصوص سیاق وسباق کے ذریعہ اکثر ہجو ملیح کا کام لیتے ہیں۔ یعنی بظاہر تعریف معلوم ہوتی ہے لیکن اصل مقصد طنز کرنا ہوتا ہے۔ جیسے ایک جگہ انہوں نے شاعر کی خواہش کو اس طرح تشبیہ دی ہے:

> ''پچھلے چند برسوں سے ہماری تحریریں مختلف اخباروں اور رسالوں میں چھپتی رہی ہیں۔ مدیران رسائل نے ہماری کاوشوں کو سراہا اور قارئین کرام کے دو چار تعریفی خطوط ہمیں وصول ہوئے۔ دو ایک محفلوں میں ہم نے مضامین بھی سنائے۔ مستند ادیب ہونے کا احساس جاگا تو صاحب کتاب بننے کی خواہش دل میں یوں کروٹیں لینے لگی، جیسے کوئی بڑی عمر والی دلہن 'گود ہری' ہونے کی تمنا کرتی ہے''۔ [2]

امیروں کے پاس بے شمار دولت ہوتی ہے لیکن وہ کثیر الاولاد نہیں ہوتے مگر ایک غریب کثیر الاولاد ہوتا ہے۔ تشبیہ کی ایک دلچسپ مثال ملاحظہ فرمائیے:

> ''بعض لوگ منہ میں چمچے لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے لیے دولت مند بننا

1۔ غریبی ہٹاؤ۔ اردو میگزین 17 ستمبر 1999ء

2۔ ہم صاحب کتاب ہیں، سگ گزیدہ۔ ص:75

اتنا ہی آسان ہوتا ہے۔ جتنا کہ غریب کے گھر بچے کی پیدائش ہوتی ہے‘‘۔ ۱؎

ٹرانسپورٹ کا دارومدار پٹرول اور ڈیزل پر ہے۔ اس کی قیمتوں میں اضافے کا اثر ٹرانسپورٹ پر پڑتا ہے، جب ٹرانسپورٹ مہنگا ہو جاتا ہے تو تمام دوسری چیزیں اپنے آپ مہنگی ہونے لگتی ہیں۔ چنانچہ عابد معز پٹرولیم مصنوعات کے قیمتوں میں اضافے کو مہنگائی سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’لیکن میاں پٹرولیم مصنوعات کے دام میں اضافہ ہونا ایسا ہی ہے جیسے مہنگائی کے بارود کے ڈھیر میں چنگاری پھینکنا ہے‘‘۔ ۲؎

فلم میں ویلن کے ذریعہ کسی کا قتل کروانا اور ہیرو سے اس کا بدلہ لینا فلم کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ ویلن اور ہیرو کے عمل و ردعمل سے پردے پر سلسلہ وار تشدد آمیز سین دکھائی دیتے ہیں۔ فلموں میں ہونے والے قتل خون کو کھٹمل کے مسلنے سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’فلمیں تشدد کی وجہ سے بھی بدنام ہیں۔ پردہ پر انسان کو یوں مارا جاتا ہے جیسے کھٹمل مسل رہا ہو‘‘۔ ۳؎

عابد معز کا خیال ہے کہ ملک کی آبادی میں اضافے سے انگلش میڈیم اسکولوں کو ترقی ملی ہے لیکن اردو میڈیم اسکولوں پر سکوت اور جمود تاری ہے۔ جس طرح جدید ٹکنالوجی کے آنے سے گھریلو صنعت بند ہو رہے ہیں۔ گھریلو صنعت سے اردو میڈیم اسکولوں کو یوں تشبیہ دی ہے:

’’آبادی میں روز افزوں اضافہ سے جہاں کئی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ وہیں اشیاء کی زیادہ کھپت سے چند صنعتوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ آبادی میں اضافہ سے تدریس کی گھریلو صنعت کو بڑھاوا ملا لیکن یہ ترقی انگلش میڈیم کے حصہ میں آئی ہے۔ دوسری زبانوں بالخصوص اردو کی تدریس گھریلو صنعت پر سکوت اور

۱؎۔ پیسہ کمانا آسان ہے۔ پھر چھڑی بات۔ ۲؎۔ پٹرول کی خوشبو۔ اردو میگزین 27/اکتوبر 2000ء
۳؎۔ فلمی پلاننگ۔ فارغ البال۔ ص:49

جمودتاری ہے، جیسا کہ اکثر دیسی گھریلو صنعتوں کا حال ہے''۔ [1]

عابد معز کا کہنا ہے کہ بارش کے پانی سے ہر جگہ ہریالی اگ آتی ہے۔ ماس کلچر سے بیوٹی پارلر اور انگلش میڈیم اسکولس کھولے جاتے ہیں، بیوٹی پارلر اور انگلش میڈیم اسکولوں کو بارش میں اگ آنے والی ہریالی سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''افزائش حسن کے مراکز بارش میں اگ آنے والی ہریالی کی طرح جگہ جگہ کھولے گئے ہیں، گلی کوچوں میں قدم قدم پر جیسے انگلش میڈیم اسکول نظر آتے ہیں''۔ [2]

مریض کے گھر جا کر اُس سے تکالیف دُکھ درد دریافت کر کے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے صحت کے بارے میں نیک تمناؤں اور چند دعائیہ کلمات کا اظہار کر کے مریض سے جلد رخصت ہو جانا چاہئے تا کہ مریض کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ کچھ لوگ مریض کے پاس صرف مشورے دینے جاتے ہیں۔ مزاج پرسی کی روایات شکنی کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

''ہم نے کسی سے مشورہ نہیں مانگا لیکن ہر کسی نے مشورہ یوں دیا جیسے عیادت کرنے کا مطلب مشورہ دینا ہے''۔ [3]

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق ذیابیطس مختلف النوع امراض کا مجموعہ مرض ہے۔ اس میں کم از کم تیس امراض پائے جاتے ہیں، زیادہ تر نادار وقوع امراض ہوتے ہیں۔ مرض ذیابیطس پر کچھ حد تک Control کرنا ہی اس کا علاج ہے۔ مکمل طور پر یہ ختم نہ ہونے والا مرض ہے۔ مریض کی آخری سانس تک ساتھ رہتا ہے۔ ڈاکٹر عابد معز مرض ذیابیطس کو یوں تشبیہ دی ہے:

''ذیابیطس جتنا وفادار ہے۔ اتنی تو شریک حیات بھی نہیں ہوتی! شریک حیات ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن ذیابطیس آپ کو ساتھ لے جاتا ہے۔ اسی لیے

---

[1]۔ انگلش میڈیم اسکول، فارغ البال۔ ص:77 [2]۔ مقابلہ حسن اور میں، آرور میگزین، 8 جون 2001ء

[3]۔ نیم حکمت۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت، ص نمبر 111، جنوری، 2012ء۔

اس مرض کی قدر کریں، اس کی عزت اور تعظیم کریں.................!!''۔ ۱؎

باتونی لوگ کسی کو سننا گوارہ نہیں کرتے صرف اپنی ہی سناتے رہتے ہیں۔ عابد معز باتونی لوگوں کو شاعروں سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بولنا برائے بولنا'' کے حامل حضرات کو بولنے کا موقع نہ ملنا یا انہیں بولنے نہ دینا غضب ڈھاتا ہے۔ ان کی حالت اس شاعر جیسی ہوتی ہے جسے کلام سنانے کا موقع نہ ملا ہو''۔ ۲؎

آپسی تعلقات کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لیے الفاظ اور جذبات کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ پھول اور تحفے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''پھول اور تحفے آپسی تعلقات کو اس طرح مضبوط کرتے ہیں جس طرح لوہے اور کنکر کو سمنٹ جکڑے رکھتی ہے''۔ ۳؎

تلمیح

ٹیلی ویژن ایک ایڈیٹ بکس یعنی مخبوط الحواس برقی ڈبہ ہے۔ اس کے پردے پر دکھائی دینے والے پروگرام کسی کو ناراض نہیں کرتے، کیونکہ ہمہ اقسام کے اس میں پروگرام آتے رہتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی خواہشات و پسند کے مطابق ٹی۔ وی دیکھتا ہے۔ علاوہ ازیں اس مخبوط الحواس ڈبے کے پردے پر ہماری عدم خواہشات کی تکمیل کی عملی صورت بھی نظر آتی ہے۔ جو حقیقی زندگی میں ہو نہیں پاتی۔ اسی لیے بیشتر افراد خواہ مرد ہو کہ عورت، بچہ ہو کہ بوڑھا، اور نوجوان، وقت ملتے ہی یا وقت نکال کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اتنا ٹی۔ وی گھورتے رہتے ہیں جتنا کہ مجنوں نے لیلیٰ کو نہیں دیکھا تھا۔ کثرت ٹیلی ویژن بینی پر ایک تلمیح کا استعمال اس طرح کیا ہے لکھتے ہیں:

۱؎ شکر بیتی۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت، جنوری 2012ء۔ ص۔

۲؎ بولنا برائے بولنا۔ اردو میگزین، 7/دسمبر 2000ء ۳؎ خوشحالی کا تکون۔ فارغ البال، ص:99

''صبح سے شام تک چوبیس گھنٹے پروگرام پیش کرتے ہیں اور لوگ آنکھیں پھاڑے ٹیلی ویژن گھورتے ہیں آپ بھی ٹیلی ویژن دیکھتے ہوں گے۔میں بھی ٹیلی ویژن تکتا ہوں۔ بلکہ ہر کوئی اتنا زیادہ ٹیلی ویژن بینی کرتا ہے جتنا کہ کوئی صنف نازک آئینہ گھورتی ہوگی۔اور نہ ہی کوئی مجنوں اپنی لیلا کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہوگا''۔ [1]

ہندوستانی فلموں میں ہیرو کے ساتھ مجرموں کا مقابلہ فلم کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔فلمی لڑائی میں ہیرو کی جیت مسلمہ ہوتی ہے۔ ہیرو پر ہر قسم کا وار خالی جاتا ہے مگر ہیرو کا کوئی وار خالی نہیں جاتا۔گولیوں کی برسات میں ہیرو بھاگتا رہتا ہے، محسوس ہوتا ہے کہ گولیاں اپنے آپ ہیرو کے راستے سے ہٹ رہی ہیں۔ ہیرو کے ایک ہاتھ سے دو دو ڈھیر ہوتے نظر آتے ہیں۔فلم کے درمیان ہیرو صرف زخمی ہوتا ہے مرتا نہیں ۔ہندوستانی فلموں کے فلمی لڑائی پر تلمیح یوں پیش کی ہے:

''ہیرو کو نہ صرف دشمنوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے بلکہ ہیروئین، ماں یا کسی مظلوم کو دشمنوں کے چنگل سے چھڑانا بھی پڑتا ہے۔

'فلمی ہیرو آب حیات پیا ہوتا ہے' اسے بہت کم موت آتی ہے فلم کے درمیان تو وہ کسی صورت نہیں مرسکتا''۔ [2]

سعودی عرب میں منی بس کو حافلہ کہتے ہیں۔اس کو مقامی باشندے ہی چلا سکتے ہیں۔اس کے چلنے کا کوئی وقت اور نظام مقرر نہیں جب چاہیں چلائیں، صاحب حافلہ کی مرضی جتنی چاہیں چکر کاٹیں، جس سڑک پر چاہیں دوڑ پڑیں۔رُکنے کے مقامات مقرر نہیں۔اس کا کوئی مخصوص رنگ و روپ نہیں ہوتا عام منی بس جیسی لگتی ہے لیکن چال سے پہچانی جاتی ہے۔ایک رفتار سے سیدھی نہیں چلتی بلکہ چلتے چلتے ٹھہرتی اور ٹھہرتے ٹھہرتے چلنے لگتی ہے۔ڈاکٹر عابد معز حاضلہ کو شوکت تھانوی کی سودیشی ریل سے تشبیہ دیتے ہوئے

---

[1] ۔ہم لیتے ہیں ایک وقفہ۔اردو میگزین۔6/دسمبر 2002ء

[2] ۔فلمی پلاننگ۔فارغ البال۔ص:48

تلمیح پیش کی ہے:

''حافلہ کو دیکھنے سے 'شوکت تھانوی کی سودیشی ریل' کی یاد تازہ ہوجاتی ہے،
اسی لیے ہم نے منی بس کو سٹر یا حافلہ کو سودیشی بس کا نام دے رکھا ہے''۔ [۱]

شہر کی غریب بستیوں میں چائے خانے، گوشت، ترکاری، دودھ یا پنکچر کی دکانیں محلّہ کے وہ مقامات ہوتے ہیں جہاں سے نہ صرف کسی کا پتہ حاصل ہوسکتا ہے بلکہ دیگر حالات بھی آسانی سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ امیر لوگ شہر کے شور شرابے سے دور اپنی الگ ایک بستی آباد کر لیتے ہیں جہاں صاف ستھری اور کشادہ سڑکیں، اور پرشکوہ عمارتیں ہوتی ہیں۔ ان محلوں کی کشادہ سڑکوں اور صاف ستھری گلیوں میں کوئی راہ گیر نظر نہیں آتا۔ چنانچہ ڈاکٹر عابد معز امیروں کی بستی کو صورت خضر کوئی راہگیر سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پتا دریافت کرنے کے روایتی مقامات نہ پا کر میں شانتی نگر کی سڑکوں پر گھومنے لگا کہ 'صورت خضر کوئی راہگیر یا مکین نظر آجائے' لیکن مایوسی ہوئی۔ لگتا تھا اس بستی میں سکون ہی سکون ہے''۔ [۲]

مصرعوں اور اشعار کا برمحل استعمال

عابد معز نے اپنی تحریروں میں محاوروں وضرب الامثال اور تراکیب کے علاوہ اشعار ومصرعوں کا برمحل استعمال کیا ہے۔ ان کے اسلوب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں موقع ومناسبت سے اشعار ومصرعوں کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی تحریر میں اشعار ومصرعوں کو موقع مناسبت سے بروئے کار لاتے ہیں جس سے ان کی تحریروں میں شگفتگی، برجستگی اور معنویت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں دی جارہی ہیں:

---

[۱] ۔ سودیشی بس۔ اردو میگزین۔ 9/جنوری 1995ء

[۲] کوٹھیوں کا شہر۔ سگ گزیدہ۔ ص: 9 سن اشاعت 1995ء

''محبت زندگی ہے اور زندگی محبت ہے۔ یہ نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا اور اسی کے دم ہی سے دنیا کی رونق ہے۔ زندگی میں دنیا کی نعمتوں کو حاصل کرنا ہوتو محبت کرنا ضروری ہے لیکن ہر کوئی محبت کے جذبہ سے سرشار نہیں ہوتا کیونکہ یہ ہوجاتی ہے کی نہیں جاتی۔ آگے لکھتے ہیں، ہم نے ایک مریض عشق سے پوچھا ''محبت کیا ہوتی ہے؟ جواب ملا:

محبت کو سمجھنا ہے تو ناداں خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازہ طوفان نہیں ہوتا [1]

ڈاکٹر عابد معز کا کہنا ہے کہ محبت کا مارا تنہائی چاہتا ہے۔ بیٹھے رہے تصور جاناں کئے ہوئے کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ عشاق بھری محفل میں بھی تنہا ہوتے ہیں۔ آس پاس سے بیگانے اور بے خبر۔ اٹھتے بیٹھتے محبت کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ بھوک مٹ جاتی ہے، نیند اڑ جاتی ہے۔ اختر شماری ہوتی ہے۔ جاگتے ہوئے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ عشاق دو کام بڑی رغبت سے انجام دیتے ہیں۔ ایک محبوب کو سامنے بٹھا کر گھورتے رہنا یا اس سے بے تکی باتیں کرنا، دوسرے محبوب کے غیاب میں اس سے محبت کا دم بھرنا یا محبوب کی یاد میں تڑپنا اور آہیں بھرنا۔ ان کاموں میں الجھے عاشق کو اپنی خبر نہیں رہتی حلیہ بگڑ جاتا ہے، انہیں پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے، تب لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہیں بچے تالیاں بجاتے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور کتے ان پر بلاوجہ بھونکنے لگتے ہیں چنانچہ عاشق کے حلیہ پر ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنادیتے ہیں [2]

ڈاکٹر عابد معز کا کہنا ہے کہ بعض افراد اپنی علمی قابلیت تجربہ کاری۔ شرافت و ایمانداری اور سخت گیری کی وجہ سے دفتر اور دوست احباب کے درمیان شیر بنے رہتے ہیں لیکن گھر میں ان کا معاملہ برعکس نظر

---

[1] سوزمحبت، فارغ البال۔ ص:61

[2] سوزمحبت، فارغ البال۔ ص:64

آتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے تعلق سے ایک مضمون میں یوں لکھا ہے:

''اکثر لوگوں کی کمزوری ان کی نصف بہتر ہوتی ہے۔ ہم ایک سرکاری عہدیدار کو جانتے ہیں جو اپنی شرافت، ایمانداری اور سخت گیری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کی طبیعت کے خلاف کام کروانا ناممکن تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک صاحب نے موصوف کی بیوی سے اپنے لیے سفارش کروائی۔ صاحب موصوف نے بیوی کو بہت سمجھایا لیکن وہ تریاہٹ پر اتر آئیں۔ میں کچھ نہیں جانتی، آپ کو میری بات ماننی ہوگی۔ اور افسر صاحب بقول اکبر آلہ آبادی کے ؎

اکبر دبے نہیں کسی سلطان کی فوج سے
لیکن شہید ہوگئے بیگم کی نوج سے [1]

اردو زبان گنگا جمنی تہذیب کی امین اور خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اردو زبان میں کسی نوجوان سے سوال کرنا ہے تو جواب دینے والا کہتا ہے کہ مجھے اردو نہیں آتی۔ بدقسمتی سے یہ نوجوان کا عام اور مقبول جواب ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ اس قسم کا جواب دینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ڈاکٹر عابد معز اپنے ایک مضمون (A Complicated Case) میں اس شعر کی مدد سے اس صورت حال کی عکاسی کی ہے ملاحظہ کیجئے:

بولتے سب ہیں اسے پڑھتا نہیں کوئی
حضرت میؔر یہ تم کیسی زبان چھوڑ گئے [2]

ڈاکٹر عابد معز کا کہنا ہے شہر حیدرآباد میں جب دو گھنٹے بارش ہوتی ہے سڑکوں پر چار دن پانی جمع رہتا ہے اور آئیندہ دس دن سڑکیں پانی اگلتی ہیں۔ ہر دو جانب کیچڑ ہی کیچڑ نظر آتا ہے چلنا پھرنا محال ہوجاتا ہے۔ راہ گیروں پر کیچڑ ایسے اُچھلتا ہے جیسے وہ کیچڑ میں گر کر اٹھے ہوں۔ ایک مرتبہ سر شام اجلے کپڑے پہن کر ہم گھر

---

[1] ۔خوش حالی کا تکون۔ فارغ البال۔ ص:100

[2] A Complicated Case۔ فارغ البال۔ ص:226

سے کچھ دور ہی چلے تھے کہ ایک کار کی مہربانی سے ہم سر سے پیر تک کیچڑ میں نہا گئے اور اس شعر کی تفسیر بن گئے ؎

آنکھوں میں اس کا چہرہ لئے میں ٹھہر گیا
کیچڑ اڑاتی کار تو اس کی گذر گئی! [1]

حیدرآبادی بسوں کے تعلق سے لکھتے ہیں یہاں کے بسوں کا نظام الاوقات صرف دیکھنے کی چیز ہے۔عمل کرنے کے لئے نہیں ہے۔بسیں اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہیں۔جب چاہیں جیسے چاہیں اور جدھر چاہیں چلتی ہیں۔گھنٹوں کوئی بس نہیں آتی اور جب آتی ہے تو ایک کے پیچھے ایک قطار بنا کر آتی ہیں۔قصہ مختصر ہمارے شہر کی بسوں پر کسی کا بس نہیں چلتا، ان کے سامنے ہر کوئی بے بس ہے۔اگر کوئی قوت برداشت کے مادے کو بڑھانا چاہتا ہے تو ایسے شہر حیدرآباد کی بسوں میں سفر کرنا چاہیے۔ یہ ہمارا صرف خیال ہی نہیں دعویٰ بھی ہے، جس نے حیدرآباد کی بسوں میں سفر کیا ہو اسے جہنم کی تکالیف برداشت کرنے میں دشواری نہیں ہوگی۔بس کا انتظار منٹوں سے گھنٹوں، گھنٹوں سے دن اور دنوں سے ایک عمر کے لیے ہوتا ہے بقول برق آشیانوی ؎

شب کو بس اسٹانڈ پر ایک نوجوان نے یہ کہا
صبح دم آیا تھا میں شب کا اندھیرا ہوگیا
ایک مرد پیر نے یہ سن کر فرمایا میاں
میں جوانی میں یہاں آیا تھا بوڑھا ہوگیا [2]

ڈاکٹر عابد معز کے پاس موقعہ مناسبت کے لحاظ سے کبھی کبھار تحریفی اشعار بھی ملتے ہیں اس کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

شاندار فرنیچر اور ڈریسنگ ٹیبل کی موجوگی سے محسوس ہوا کہ ہم کسی اور کے

---

[1] حیدرآبادی قیامت۔واہ حیدرآباد۔ص:41 سن اشاعت جنوری 1994ء

[2] ۔بس بس۔واہ حیدرآباد۔ص:86 سن اشاعت جنوری 1994ء

کمرے میں گھس آئے ہیں۔ پھر خیال آیا کہ اس کمرے میں آئی بہار اور رونق کی

وجہ ہماری شریک حیات ہیں:

آپ آئیں ہمارے کمرے میں خدا کی رحمت ہے

کبھی ہم آپ کو کبھی اپنے کمرے کو دیکھتے ہیں[۱]

ڈاکٹر عابد معز کا خیال ہے کہ موجوہ دور میں اکثر شعراء مترنم ہیں۔ ترنم ہی سے اپنا کلام سناتے اور داد پاتے ہیں۔ میرے نقاد دوست ترنم کو گانے سے تعبیر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں، موجودہ دور کے اکثر شاعر شعر نہیں کہتے، شعر گاتے ہیں اور شعر گانے کو ادب میں ترنم کا نام دیا جاتا ہے:

کہہ دو میرؔ و غالبؔ سے ہم تو شعر گاتے ہیں

وہ صدی تمہاری تھی یہ صدی ہماری ہے

ڈاکٹر عابد معز اپنی تحریر کو شگفتہ بنانے کے لیے مکمل شعر کے علاوہ موقع مناسبت سے صرف ایک مصرعے کا بھی استعمال کیا ہے، مصرع ان کی تحریر کا ایک اہم خبر بن جاتا ہے اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق بازار میں ملنے والے دل کو امریکہ کی ابیو میڈ (Abio Med) نامی کمپنی نے تیار کیا ہے اسے پلاسٹک اور ٹیٹانیم سے بنایا گیا، 2/جولائی 2001ء کو سرجن رابرٹ ڈولنگ نے پہلا مشینی، مصنوعی یا بازاری دل، کینٹکی ہسپتال میں ایک مریض کو لگایا۔ ڈاکٹروں کے مطابق مریض کے سینے میں یہ مشن کا دل اچھی طرح کام کر رہا ہے لکھتے ہیں:

''بہر حال مجھے خوشی ہے۔ آپ کو بھی خوشی ہوئی ہوگی کہ مرزا غالبؔ کی دلی مراد پوری ہوئی اور بازار میں دل دستیاب ہے جب دل چلا جائے گا، نکل جائے گا، پھسل جائیگا،، چوری ہوجائے گا، چھین جائے گا، اٹک جائے گا، لگ جائیگا، ٹوٹ جائے گا، اکھڑ جائے، بیٹھ جائے گا، ڈوب جائے گا، رک جائے گا اور جب دل چھلنی ہوگا، بیمار ہوگا یا پھر دھڑکنا بند کردے گا تو بقول مرزا غالبؔ''[۱]

۱۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت، گریہ کشتی۔ ص:171 اشاعت جنوری 2012ء

آئیں گے بازار سے جا کر دل وجاں اور''۔ ۱؎

شیر کو پکڑنا آسان ہے لیکن اسے پالنا بہت مشکل کام ہے۔ یہی کہاوت جلوس پر بھی صادق آتی ہے۔ لوگوں کو جمع کرنا اور جلوس نکالنا سہل ہے، لیکن جلوس اور جلوسیوں پر قابو رکھنا کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ جلوس کے توسط سے ایک مصرعہ اس طرح پیش کیا ہے۔

کسی زمانے میں جب جلوس نکلتا تھا تو لوگ جوق در جوق سڑک کے کنارے جمع ہو کر نظارہ کرتے تھے۔ جلوس کے ساتھ چلتی پھرتی دکانیں ہوتی تھیں۔ تماشائی جلوس سے محظوظ ہوتے ہوئے شاپنگ کرتے تھے۔ لیکن آج جلوس کا تماشہ صرف پولس دیکھتی ہے۔ عوام جلوس کے دن گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرتے۔ پولس بہتر تماشائی ثابت ہوئی ہے۔ اس کے سامنے جلوس توڑ پھوڑ مچاتے اور وہ خاموش رہتی ہیں ''ہوتا ہے شب وروز تماشہ میرے آگے''۔ ۲؎

عابد معز کے مطابق کچھ ڈاکٹرس مریض کو انجکشن اور دوائیں دینے سے پہلے ڈرانے لگتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب ہماری نادانی کا فائدہ اٹھا کر ہمیں ڈرانے لگے۔ کتا کاٹنے سے موت واقع ہوسکتی ہے۔ آپ کتے کا پتہ لگائیے۔ اس کی چال چلن اور عادات واطوار پر نظر رکھئے۔ آنے والے دس ن بہت بھاری ہیں۔ اس دوران اگر کتا مر گیا تو یقین کیجئے:

''آج وہ کل تمہاری باری ہے''۔ ۳؎

ڈاکٹر عابد معز کا کہنا ہے کہ پچھلے ہفتہ کا کالم ''شیر ختم ہو رہے ہیں'' کے جواب میں جناب علیم خاں فلکی نے مجھے ایک ای میل ارسال کیا۔ میں نے آپ کا کالم پڑھا۔ عنوان سے قیاس کیا کہ مضمون میں تان شیر سے شروع ہو کر شعر پر ٹوٹے گی، لیکن الحمدللہ آپ صرف جنگل کے شیروں تک محدود رہے۔ شہر کا رخ نہیں

۱؎ ۔ لے آئیں گے بازار سے۔ اردو میگزین، 15 را کتوبر 2001ء

۲؎۔ واہ حیدر آباد۔ چہ جولوس۔ ص: 46 سن اشاعت جنوری 1994ء ۳؎ سگ گزیدہ۔ سگ گزیدہ۔ ص:186

کیا۔ ویسے اگر آپ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ مشاعروں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور شعر کم ہو رہے ہیں۔ اس موضوع پر بھی قلم اٹھایئے............!!اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

''شاعر اور شاعری کے موضوع پر میں ''کوئی بتلاؤ کہ ہم بتائیں کیا؟''والی کیفیت میں گرفتار ہوں۔ میں نے ماضی میں اس موضوع پر کافی طبع آزمائی کی ہے۔ آٹھ دس کالم لکھ ڈالے جس کی بنا پر احباب مجھے، شاعر اور شاعری بے زار شخص گردانے لگے تو میں نے خاموش رہنے میں عافیت جانی''۔[1]

ڈاکٹر عابد معز بعض اوقات جملے کی ساخت میں بھی شاعری سے مدد لیتے ہیں جس سے تحریر میں شعریت جیسا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ چند جملے:

''اپنی معلومات اور احباب کی قابلیت کے بل بوتے پر کچھ کم دو ہفتے ہم اپنا علاج کرتے رہے۔ مایوسی ہوئی بلکہ کہنا چاہیے کہ نقصان ہوا ''مرض بڑھ گیا چٹکلوں نے کچھ کام نہ کیا''۔ ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑا''۔[2]

بیوی ڈاکٹروں سے مایوس ہوئیں اور ان کا ڈاکٹروں پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ ڈاکٹروں کے پیچھے وقت اور پیسہ برباد کرنے کی بجائے وہ دعاؤں میں مصروف رہنے لگیں۔ ہم نے بھی مصمم ارادہ کر لیا کہ اب کسی ڈاکٹر کو دیکھائیں گے اور نہ انہیں اپنا مرض بتائیں گے۔ چاہے مرض سے ہم جان بحق کیوں نہ ہو جائیں۔ ہم نے اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا:

''آخر وہی ہوا جو منظورِ خدا ہوتا ہے'' کئی دن طبیعت یوں ہی رہی پھر اپنے آپ ڈاکٹروں کی مدد اور علاج کے بغیر سنبھلنے لگی''۔ [3]

---

[1] ۔ شعر بھی ختم ہو رہے ہیں۔ پھر چھڑی بات۔ اعتماد۔24/مارچ 2008ء

[2] مریضانہ آئے۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ ص:114 ۔ سن اشاعت جنوری 2012ء

بذلہ سنجی

بذلہ سنجی مزاج کا وہ حربہ ہے جس میں خوش طبعی، حاضر جوابی شیرینی زبان اور لطافت کے ساتھ ندرتِ خیال، موضوع کی نزاکت اور زبان کی چاشنی وغیرہ ہوتی ہیں۔ اس میں کسی خاص واقعے کو ایسے زاویے سے پیش کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا ہنسنے پر مجبور ہوجائے، بذلہ سنجی میں موضوع کو بڑی چابکدستی سے بدلا جاتا ہے اور غیر متوقع طور پر خیال کو سرے سے بدل کر ایک ایسا نکتہ پیدا کیا جاتا ہے کہ جس سے مزاح کی پھلجھڑیاں جھڑتی ہیں۔ عابد معز ایک سنجیدہ مزاح نگار کے ساتھ ساتھ نہایت بذلہ سنج بھی واقع ہوئے ہیں۔ جس کا ثبوت ان کے ظریفانہ کالم اور افسانے ہیں۔ ان کالموں اور افسانوں کے ہر جملے سے ان کی بذلہ سنجی جھلکتی ہے، وہ برجستگی، اختصار اور فی البدیہہ کے ساتھ موضوع کے پس منظر، زبان کی لچک اور تفصیل کے ذریعہ اپنی تحریروں کو نہایت ہی شگفتہ بنا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر عابد معز کا کہنا ہے کہ بیوی اور کار میں چند باتیں مشترک ہوتی ہیں۔ دونوں گرم ہوتی ہیں، بے قابو ہوسکتی ہیں۔ کبھی کبھار بیوی خاموش اور کار آف ہوجاتی ہے اور دونوں ہی شوہر کی جیب پر بھاری پڑسکتی ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ’’کہنے کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ شوہر کار اور بیوی دونوں کا حاکم ہوتا ہے۔
> لیکن اکثر و بیشتر وہ دونوں کے آگے بے بس و لاچار بلکہ وقت واحد میں دونوں کا
> تابع ہوتا ہے‘‘۔ [1]

سیاسی زندگی میں خوشامدی، کاروباری دنیا میں مسکراہٹ اور آپسی تعلقات کو مضبوط رکھنے کے لیے تحفے بہت اہمیت رکھتے ہیں تحفے کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ’’تحفے محبت کی پائیداری کے لیے ضروری ہوتے ہیں یہ ایک طرح کی
> رشوت ہے جو محبت کرنے والے ایک وسرے کو دیتے اور لیتے ہیں‘‘۔ [2]

---

[1] شریک زندگی۔ سگ گزیدہ۔ ص:22 [2] ۔عاشقوں کی عید۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ ص:21 سن اشاعت جنوری 2012ء

عورت میں وفا، حیاء اور محبت کے ساتھ ضد کا عنصر بھی ہوتا ہے۔ وہ جب ضد پر اتر آتی ہے تو اس کا شوہر بھی بے بس ہو جاتا ہے۔ بعض دور اندیش شوہر کامیاب ازدواجی زندگی گذارنے کے لیے بیوی کے آگے کبھی کبھار ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ خواتین کی فطرت کو اس طرح پیش کیا ہے:

''کامیاب ازدواجی زندگی کا راز یہی ہے کہ شوہر بیوی کے آگے ہتھیار ڈالتا ہے، جب کہ بیوی کبھی ہار نہیں مانتی، اکثر کامیاب رہتی ہے لیکن بعض مرتبہ سمجھوتا بھی کر لیتی ہے''۔ ۱؎

بذلہ سنجی کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

''محکمہ پولس میں اوپر کی آمدنی سیٹی بجاتے اور ڈنڈا گھماتے ہو جاتی ہے''۔ ۲؎

''خواتین ڈرامے شوق سے دیکھتی ہیں جس میں سے انہیں خود ڈرامہ کرنے میں مدد ملتی ہے''۔ ۳؎

''مغربی سماج میں کتّے کا مقام اعلیٰ وارفع ہے''۔ ۴؎

''ایک مغرور سامع نے بتایا داد دینا ادبی سخاوت ہے۔ بیچارہ شاعر داد جو مانگتا ہے''۔ ۵؎

زبان و بیان

ڈاکٹر عابد معز کا طنزیہ و مزاحیہ اسلوب سادگی، سلاست اور روانی سے عبارت ہے۔ ان کا یہ ظریفانہ اسلوب بظاہر سادہ و آسان دکھائی دیتا ہے لیکن اس میں کمال درجے کی پرکاری بھی موجود ہے۔ عابد معز سادہ اور سلیس زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ الفاظ کے استعمال میں وہ مشکل پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ صحیح اور معیاری زبان لکھنے کے علاوہ وہ درست املا کا بھی خاص اہتمام کرتے ہیں ان کی زبان کو

۱؎ ۔ پرانی کارنیا مالک۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ ص:30 سن اشاعت جنوری 2012ء

۲؎ ۔ کاروباری لین دین۔ اردو میگزین، 12/ اگست 2001ء　　۳؎ ۔ ہم لیتے ہیں ایک وقفہ۔ اردو میگزین۔ 6/ ستمبر 2002ء

۴؎ ۔ بہترین دوست، اردو میگزین۔ 21 جون۔ 2002ء　　۵؎ داد دینا بھی ایک فن ہے۔ اردو میگزین۔ 20/ ڈسمبر 2002ء

بلاشبہ ہم خالص اردو کی ترجمان قرار دے سکتے ہیں۔ان کا اسلوب گنجلک اور پیچ دار بھی نہیں ہے۔ وضاحت اور ابلاغ ان کے انداز تحریر کے نمایاں اوصاف ہیں۔ چنانچہ ان کے اسلوب اور زبان و بیان کی اس خوبی پر روشنی ڈالتے ہوئے علیم خان فلکی لکھتے ہیں:

''عابد معز کتابوں سے زیادہ انسانوں کو پڑھتے ہیں اس لیئے ان کی نثر میں برجستگی ،نفسیات، باریک بین مشاہدہ اور چھوٹے چھوٹے جملوں کی لطافت پائی جاتی ہے۔ مرکب جملوں اور فصیح و بلیغ الفاظ کے ذریعہ قاری پر اپنی قابلیت کی دھونس جمانے کی کوشش نہیں۔ان کی یہی بات ہمیں ہی نہیں ہر قاری کو اچھی لگتی ہے کہ وہ آسان، سلیس اور شگفتہ زبان لکھتے ہیں''۔ ۱؎

عابد معز کی زبان پھکڑ پن سے عاری ہے، کبھی کبھی وہ کسی ناہموار صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے شدید غم و غصے کا اظہار ضرور کرتے ہیں لیکن کسی بھی حال میں اپنی زبان کو بگڑنے نہیں دیتے بہت ہی شائستہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے چلے جاتے ہیں چنانچہ کلیم چغتائی سابق ایڈیٹر، ماہنامہ 'رابطہ' کراچی پاکستان نے ان کے شگفتہ افسانوں کا مجموعہ ''یہ نہ تھی ہماری قسمت'' کے مقدمہ میں ان کی زبان و بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''باری تعالیٰ نے عابد معز کی شگفتہ نگاری کو بہت عمدہ صلاحیت سے نوازا ہے۔ وہ اس صلاحیت کا استعمال بڑے وقار، شائستگی، تہذیب اور سلیقے سے کرتے ہیں۔ان کی تحریروں میں جگت بازی، پھکڑ پن، سوقیانہ فقرے اور ذو معنی تراکیب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں۔ اگر ایک آدھ بار انہیں کسی قابل حجاب بات کا تذکرہ کرنا بھی پڑا تو انہوں نے اسے ظریفانہ انداز میں اس احتیاط سے نبایا ہے کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے''۔ ۲؎

۱؎ ۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ نومبر 2008ء۔ص۔165

۲؎۔ پیش لفظ۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ کلیم چغتائی ۔ص۔

ڈاکٹر عابد معز ایک طنز و مزاح نگار کے علاوہ سنجیدہ اور سائنٹیفک کالم نگار ہیں۔ وہ ظرافت برائے ظرافت کے قائل نہیں، وہ طنز و مزاح کا سہارا لیے بغیر اپنے اسلوب سے تحریروں میں دلچسپی پیدا کرتے ہیں جو معنویت اور معلومات کے بہتے ہوئے دریا ہیں۔ چنانچہ پروفیسر بیگ احساس عابد معز کے ان فکاہیہ تحریروں کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر عابد معز ایک سنجیدہ کالم نگار ہیں، وہ بڑی سنجیدگی سے فکاہیہ کالم لکھتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی واقعے یا خبر کو موضوع بنا کر ایسی ایسی معلومات فراہم کرتے ہیں جن سے اردو کا قاری اکثر بے خبر ہوتا ہے۔ قاری کا منہ قہقہہ کی وجہ سے نہیں بلکہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔

عابد معز ایک سائنٹفک کالم نگار ہیں۔ وہ لطیفوں، چٹکلوں اور مزاح کا سہارا لیے بغیر اپنے اسلوب سے کالم میں دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ سچ کہنا اور سچ کی تلخی کو مزاح کی چاشنی کے بغیر اس خوش اسلوبی سے پیش کرنا کہ پڑھنے والا اس سچ پر یقین کرے۔ یہی عابد معز کی فن کاری ہے''۔[1]

الغرض ڈاکٹر عابد معز ''مزاح برائے مزاح کے نہیں بلکہ ''مزاح برائے اصلاح'' کے قائل ہیں۔ ان کی ظرافت مصلحانہ اور مقصدی ہے جس میں دانش مندی کی روایت موجود ہے۔

☆☆☆

---

[1]۔ ماہنامہ شگوفہ۔ عابد معز نمبر۔ نومبر 2008ء۔ ص۔ 91

باب پنجم

عابد معز کی طبی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ

(الف) ذیابیطس کے ساتھ ساتھ

(ب) کولسٹرال کم کیجیے

(ج) چکنائی اور ہماری صحت

(د) غذا اور تغذیہ (زیر اشاعت)

عابد معز کی طبی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ

علم طب کی اہمیت وافادیت ہر زمانے میں رہی ہے اور دنیا کی ہر قوم ونسل نے اس کی ترقی وترویج میں حصہ لیا، خواہ آج کا ترقی یافتہ دور ہو کہ ہزار ہا سال پہلے کا دور۔ ماضی میں بھی علم طب سے وابستہ حضرات کو عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور اب بھی دیکھا جا رہا ہے۔ ماضی میں بادشاہ بھی طبیب حضرات کے قدر دان رہے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ خلافت بنوامیہ اور عباسیہ کے حکمرانوں نے طب کے تعلق سے یونانی وسریانی اور دوسری زبانوں سے عربی زبان میں ترجمہ کرنے والوں کو بیش بہا انعامات سے نوازا کرتے تھے۔ خلیفہ مامون رشید ایک ایسا حکمران گذرا ہے جس کا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ وہ سائنس اور طب کی کتب کے مترجمین کو یا لکھنے والوں کو ان کی کتاب کے ہم وزن سونا عطا کرتا تھا۔

عربوں سے سائنسی علوم وفنون یورپ پہنچے اور وہاں اس کی ترقی کے لیے اور زیادہ کوششیں ہوئیں۔ پھر یورپ سے دوبارہ مشرق میں سائنس کی روشنی طلوع ہوئی۔ یورپ میں فی الحقیقت سائنسی ترقی عربوں کی دین ہے۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ سائنس کی روشنی صرف مغرب کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔ یہ مبالغہ نہیں ہے کہ سائنس کی اولین شعاعیں مشرق سے ہی پھوٹی ہیں۔ جہاں تک قدیم ہندوستانی سائنس وفلسفہ کا تعلق ہے طب کی اولین کتابیں ’’آتریہ، سشرتا‘‘ چھٹی صدی قبل مسیح کی تخلیق ہیں۔ سائنسی اعتبار سے سشرتا بہت اہم ہے کیونکہ اس میں علم جراحت کی بحث موجود ہے۔ مشرق کی زبانوں میں اردو قدیم زبان نہیں ہے بلکہ اس کا شمار نوعمر زبانوں میں ہوتا ہے تاہم اس میں سائنسی لٹریچر اٹھارہویں صدی (بلکہ سولہویں صدی) سے مل جاتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اردو کے نثری سرمایہ میں سائنسی لٹریچر کا بھی حصہ ہے۔ یہ

دوسری بات ہے کہ اس کی قدر و قیمت انگریزی کے مقابلہ میں سب کو ہے۔جس طرح شعروشاعری کا پہلا مرکز دکن رہا ہے اسی طرح سائنس کے میدان میں بھی دکن شروع سے ہی سر بلند رہا ہے۔سولہویں صدی میں سائنس کی سب سے پہلی کتاب شہاب الدین قریشی بیدری'' نے بھوگ بل'' کے نام سے لکھی ہے جو مثنوی کی ہئیت میں ہے۔اس طویل مثنوی کا ایک حصہ جنسیات پراور دوسرا حصہ طب پر مشتمل ہے۔

اردوزبان میں سائنسی موضوعات کو منتقل کرنے کا سلسلہ کافی قدیم ہے جس کی ابتدائی منظّم کوشش شمس الامراء کبیر ثانی کے دور سے شروع ہوئی اس سے تقریباً ایک صدی بعد حیدآباد ہی کی سرزمین سے ایک اوراجتمائی منظّم کوشش نواب میر عثمان علی خان کے عہد میں ہوئی بادشاہ وقت نے جامعہ عثمانیہ قائم کر کے اعلیٰ درجات تک اردوزبان کے ذریعہ سائنسی تعلیم کا آغاز کیااور سائنسی موضوعات کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے دارالترجمہ قائم کیا۔سبھی مضامین جیسے فزکس،کیمسٹری،میڈیسن وغیرہ اردوزبان میں پڑھائے جاتے تھے اس جامعہ نے یہ ثابت کردیا کہ اردوحسن وعشق اور گل وبلبل کی قصیدہ خوانی اورشعرونغمہ کی شاعرانہ زبان ہی نہیں ہے بلکہ اس میں سائنسی مضامین کو احاطہ کرنے کی صلاحیت و وسعت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔شمس الامراء کبیر ثانی کی طرح سرزمین دکن کے کئی سپوت اپنی قابلیت کے ذریعہ سائنسی علوم سے اردوزبان کا دامن وسیع کررہے ہیں۔ان میں ایک ڈاکٹر سید خواجہ معزالدین بھی ہیں جوادبی دنیا میں ڈاکٹر عابدمعز کے نام سے مشہور ہیں۔ڈاکٹر ابولفضل سید محمدی علی،ڈاکٹر عابدمعز کی ادبی وطبی خدمات کواس طرح سراہاہے:

''اللہ تعالیٰ کی دین ہے جس کوانھوں نے بہت خوب نبھایا۔ادب اورمزاح کی دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن میں ان دوخصوصیات کاامتزاج ہوتا ہے بلکہ میرے محدود تجربے میں کوئی ایسی شخصیت نہیں گذری جن میں طبی ادب اورمزاح کی خصوصیات ایک ساتھ اتر آئیں۔واقعی میں معز صاحب بہت ہی قابلیت کے حامل ہیں جن کوضرورسراہاجانا چاہئے''۔ [1]

---

[1] ڈاکٹر ابولفضل سید محمدی علی،بذریعہ ای میل۔

ڈاکٹر عابد معز کی شخصیت کا ادبی پہلو جس قدر روشن ہے اسی طرح ان کے سائنسی علوم کی خدمات بھی قابل تعریف ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ ڈاکٹر عابد معز صحت، طب، اور تغذیہ، کے موضوعات پر اردو زبان میں بے شمار مضامین اور کالم لکھے ہیں، جو مختلف اخبارات اور رسائل جیسے سائنس کی دنیا، کتاب نما، اردو نیوز، سیاست، منصف، اور اعتماد وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ روزنامہ منصف میں صحت وطب کے عنوان سے ایک کالم 1981ء سے 1987ء تک لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ ''غذائیات'' کے عنوان سے روزنامہ اعتماد میں ہر بدھ کے دن تغذیہ کے موضوع پر مختصر معلومات 5/ڈسمبر 2012ء سے لکھ رہے ہیں۔ اور اسی رزنامہ میں ''شکر ریزے'' کے عنوان سے مرض ذیابیطس کے متعلق اختصار سے ہر اتوار کو لکھ رہے ہیں۔ یہ سلسلہ 2/ڈسمبر 2012ء سے جاری ہے۔

صحت، وتغذیہ کے موضوعات پر عابد معز کی اردو زبان میں اب تک چھ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، ایک کتاب زیر اشاعت ہے۔

۱)۔ ذیابطیس کے ساتھ ساتھ

۲)۔ چکنائی اور ہماری صحت

۳)۔ کولیسٹرال کم کیجئے

۴)۔ رمضان اور ہماری صحت

۵)۔ حج وعمرہ اور ہماری صحت

۶)۔ فاسٹ فوڈ اور سافٹ ڈرنکس

۷) غذا اور تغذیہ (زیر اشاعت)

ان تصانیف کا تفصیل سے تعارف پچھلے باب میں آچکا ہے۔ چنانچہ یہاں ان تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔

ذیابیطس کے ساتھ ساتھ

ذیابیطس کے ساتھ ساتھ، ڈاکٹر عابد معز کی پہلی سائنسی طبی تصنیف ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن مئی 2010ء میں شگوفہ پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن جنوری 2011ء میں اضافہ اور ترمیم کے ساتھ ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس سے شائع ہوا تیسرا ایڈیشن بھی ھدیٰ پبلی کیشنز نے مارچ 2012ء میں شائع کیا۔ اس میں جملہ ترپن (53) مضامین ہیں، یہ کتاب کل چار سو بتیس (432) صفحات پر مشتمل ہے۔ صفحہ 391 سے 412 تک طبی فرہنگ اور تشریحات لکھی گئی ہے۔ اس کا مقدمہ ڈاکٹر ماجد قاضی ایم ڈی ایف اے سی سی (امریکہ) طبیب خاص شاہ فہد بن عبدالعزیز مرحوم ریاض سعودی عرب نے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ملک و بیرونی ممالک کے مختلف ماہرین امراض اور دانشوروں نے اپنی قیمتی آراء سے اس کتاب کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر عابد معز کی خدمات کو خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ طبی مضامین کے تعلق سے طبع اول کے پیش لفظ میں ڈاکٹر عابد معز لکھتے ہیں:

> ''میں پچھلے تین برسوں سے طبی مضامین لکھ رہا ہوں جو مختلف رسالوں اور اخباروں بشمول سہ ماہی سائنس کی دنیا ماہنامہ سائنس کتاب نما۔ روزنامہ سیاست، منصف، اعتماد اردو نیوز اورہفت روزہ اردو میگزین میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ تغذیہ اور ذیابیطس نہ صرف میرے پسندیدہ موضوعات ہیں بلکہ میرا اختصاص بھی ان ہی مضامین میں ہے...... میں نے سائنسی اور طبی معلومات کو عام فہم بنانے اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے اور بعض طبی اصطلاحات کو اردو میں ڈھالا ہے۔ بعض اصطلاحوں کا اردو متبادل دریافت کرنے یا بنانے میں

مشکل پیش آئی تو میں نے جوں کے توں انگریزی الفاظ کا استعمال مناسب سمجھا ہے۔ میں اپنے مقصد میں کس حدتک کامیاب ہوا ہوں۔ اس بات کا فیصلہ ناقد اور قاری کریں گے"۔ [۱]

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق ذیابیطس دور حاضر کا ایک عام مرض ضرور ہے لیکن اس کے وقوع ہونے کا ثبوت صدیوں پہلے یونان، روم، ہندوستان اور پندرہ سو سال قبل مسیح اہرام مصر (Pyramids) سے ملتا ہے۔اس مرض کے تعلق سے 1862ء میں جارج ایبرس نے (George ebers) قدیم کاغذات دریافت کیا تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں یونان کے ایک طبیب اریٹس (Aretaeus) نے اس مرض کو (Diabetes) ذیابیطس کا نام دیا یہ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی سائفن یعنی کہ جسم سے کثیر مقدار میں پانی کا اخراج یا پانی پیشاب کی نالی سے بہہ جانا ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح قدیم ہندوستانی طریقہ طب ایورویدا میں اس مرض کو مدھومیھا یعنی شہدی پیشاب بتایا گیا ہے۔ نویں اور گیارہویں صدی میں بوعلی سینا (Avicenna) نے ذیابیطس کی شکایات اور علامات اور اس مرض سے ہونے والی اہم پیچیدگیوں کی نشاندہی کی اور اس کے تعلق سے تفصیل سے لکھا ہے۔ سترھویں صدی میں تھامس ولس (Thomas Willis) نے بھی ذیابیطس کے مریضوں کے پیشاب کو میٹھا بتایا بلکہ 1674ء میں لفظ ذیابیطس (Diabetes) کے ساتھ ملائٹس (Mellitus) کا اضافہ کیا ملائٹس ایک لاطینی لفظ ہے جس کے معنی شہد ہے۔

یوں اس مرض کا نام یونانی اور لاطینی زبانوں کے الفاظ سے (Diabets Mellitus) مخفف DM، اردو میں ہم اسے ذیابیطس شکری کہتے ہیں۔ یعنی میٹھے پیشاب کا کثیر مقدار میں بہنا ہے۔

1889ء میں جوزف وان میرنگ (Joseph Von Mering) اور اوسکار مسکوسکی (Oscar Miskowski) نے کتوں میں لبلبہ کو نکال کر مرض ذیابیطس پیدا کیا اس تجربے کے بعد لبلبہ

---

۱ پیش لفظ۔ ذیابیطس کے ساتھ ساتھ، طبع اول، ص ۱۱

کوذیابیطس کا اصل محرک بتایا گیا۔

1922ء میں لیونارڈ تھامسن (Lionard Thompson) نے لبلبہ سے کشید کردہ مواد ایک 14 سالہ ذیابیطس مریض کو دیا پہلی مرتبہ تعجب خیز نتائج برآمد ہوئے طب کی دنیا میں انقلاب برپا ہوا اور ذیابیطس کے مریضوں کو نئی زندگی ملنے لگی۔

ڈاکٹر عابد معز ذیابیطس کی تعریف آسان انداز میں اس طرح کرتے ہیں:

''اس سوال کا مختصر اور آسان جواب یہ ہے کہ ذیابیطس خون میں حد سے بڑھی ہوئی گلوکوز سے پیدا ہونے والی شکایات اور پیچیدگیوں کا مرض ہے ذیابیطس شکر میں مختلف النوع امراض کا مجموعہ ہے جن کی متفقہ خرابی خون گلوکوز / شکر کی اعتدال سے تجاوز کرنے پر ہونے والی بے قاعدگیاں ہے۔ ذیابیطس میں کئی امراض کی شمولیت کی بنا پر ذیابیطس کو ایک مرض کے بجائے امراض ذیابیطس کہنا زیادہ مناسب ہے لیکن ذیابیطس کا چلن عام ہو چکا ہے اسی لیے اسے یوں ہی برقرار رکھا گیا ہے۔ کچھ کم تیس امراض ذیابیطس شکری میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان میں چار چھ عام ہیں جب کہ اکثریت نادرالوقوع کی ہے''۔ [1]

ڈاکٹر عابد معز نے ذیابیطس کی چند دیگر وجوہات بھی بتائی ہیں:

''ذیابیطس شکری میں شامل امراض کے لیے موروثی اور ماحولیاتی عوامل کارفرما ہیں اور ان کی وجوہات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ وجوہات مختلف ہونے کے باوجود ذیابیطس شکری کا بنیادی انسولین ہارمون کی ناکامی ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔

☆......پہلی وجہ میں لبلبہ یا بانقراس انسولین تیار کرنے سے قاصر رہتا ہے یا کم مقدار میں بنا پاتا ہے۔ دوسری وجہ بہت عام ہے۔ جسم میں انسولین کو ناکارہ

---

[1] ذیابیطس کیا ہے۔ ذیابیطس کے ساتھ ساتھ ۔ ص:29,33,34۔ اشاعت مئی 2009ء۔

بنادیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر موٹاپے کے سبب خلیے انسولین کے پیام یا احکامات پر عمل نہیں کرتے۔ بیشتر مرتبہ لبلبہ انسولین زیادہ تیار بھی کرتا ہے لیکن انسولین اپنے فرائض انجام دینے میں ناکام رہتا ہے''۔ [1]

مرض ذیابیطس کو سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے گلوکوز کے بارے میں جاننا بے حد ضروری ہے ڈاکٹر صاحب نے گلوکوز کے تعلق سے اس طرح لکھا ہے:

''انسانی جسم ایک مشین کی طرح ہے۔ اس مشین کو کام کرنے کے لیے ایندھن کی ضرورت پڑتی ہے۔ جسم کا ایندھن گلوکوز (Glucouse) ہے جو غذا کے ذریعہ فراہم ہوتا ہے۔ جسم کو ایندھن یا گلوکوز کی فراہمی کے لیے غذا میں تین اجزاء ہوتے ہیں : کاربوہائیڈریٹس (Carbohydrates) لحمیات (Proteins) اور چربی یا چکنائی (Fats)۔ ہضم نظام (Digestive System) میں کاربوہائیڈریٹس ہضم ہوکر گلوکوز میں تبدیل ہوتے ہیں۔ اسی طرح لحمیات اور چربی ہضم ہوکر بالترتیب امینو ترشے (Amino Acids) اور چکنے ترشے (Fatty Acids) بنتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر جگر میں امینو اور چکنے ترشوں سے گلوکوز تیار کی جاتی ہے۔ گلوکوز ایک قسم کی شکر (Sugar) ہے۔ اسی لیے خون شکر (Blood Sugar) خون گلوکوز کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے''۔ [2]

مرض ذیابیطس کے تعلق سے لبلبہ نالی غدود کی اہمیت وافادیت اور اس کی کارکردگی پر یوں روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''غذا حاصل کرنے کے بعد خون گلوکوز کی مقدار بڑھنے لگتی ہے تو لبلبہ نامی غدود (Pancreas) حرکت میں آتا ہے اور انسولین خارج کرتا ہے۔

---

[1] ۔ ذیابیطس کے ساتھ ساتھ۔ ذیابیطس کے ساتھ ساتھ۔ ص:34۔

[2] ۔ ذیابیطس کیا ہے۔ ذیابیطس کے ساتھ ساتھ۔ ص:29,30

انسولین کے زیر اثر جسم کے خلیے گلوکوز کو توانائی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ خلیے میں گلوکوز کے استعمال کے داخل ہونے کے دروازہ پر تالا پڑا رہتا ہے۔اور اس قفل کی چابی انسولین ہے۔انسولین دروازہ کھولتا ہے تو گلوکوز خلیے میں داخل ہوتی ہے''۔ ۱

ایک اور مضمون ''انسولین خون گلوکوز کم کرتا ہے''۔ میں لبلبہ کی کارکردگی کو یوں بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:

''لبلبہ ایسا غدود ہے جو بیک وقت ہارمون بنانے کے ساتھ لبلبی رس (Pancreatic Juice) بھی تیار کرتا ہے جسے آنت میں خارج کیا جاتا ہے۔لبلبہ انسولین تیار کر کے خون میں خارج کرتا ہے یا انسولین کو مستقبل میں استعمال کرنے کے لیے انسولین دانوں (Insulin Granules) میں جمع کر لیتا ہے''۔ ۲

جب جسم میں انسولین کم بنتا ہے یا غیر کارکرد ہوتا ہے تو ذیابیطس وقوع پذیر ہوتا ہے۔انسولین پیدا کرنے والے غدود لبلبہ کے بارے میں ڈاکٹر عابد معز اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''انسانی جسم میں گلابی رنگ اور مچھلی کی شکل کا ایک غدود معدہ کے نیچے پچھلی دیوار پر افقی جانب پایا جاتا ہے۔اس غدود کو لبلبہ یا بانقراس (Pancreas) کہتے ہیں اور یہی غدود ذیابیطس کا سبب بنتا ہے۔لبلبہ کے سر اور گردن کو آنت (Duodenum) گھیرے رہتی ہے۔لبلبہ 33 سینٹی میٹر لمبا ہوتا ہے اور اس کا وزن 85 تا 100 گرام ہے۔نعلی اعتبار سے لبلبہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ہاضمے سے متعلق حصہ (Digestive Part) اور ہارمون تیار کرنے والا حصہ (Hormonal Part) لبلبہ کا تقریباً 99 فیصد حصہ ہاضمے

۱۔ مضمون، ذیابیطس کیا ہے، ذیابیطس کے ساتھ ساتھ۔ص:33

۲۔ مضمون، انسولین خون گلوکوز کم کرتا ہے۔ ذیابیطس کے ساتھ ساتھ۔ص:39, 40

سے تعلق رکھتا ہے جب کہ صرف ایک تا دو فیصد حصہ ہارمون بناتا ہے۔ ہر دن ایک لیٹر لبلبی رس تیار کیا جاتا ہے جو غذا ہضم کرنے میں معاون ہوتا ہے اور معدہ کے ترشہ (Acidity) کو زائل بھی کرتا ہے۔ لبلبہ میں ایک ملین کے قریب خلیوں کے مجموعے بکھرے ہوتے ہیں ان مجموعوں کو جزیرات لینگر نہیں کہتے ہیں جزیرات لینگر چار قسم کے خلیے پائے جاتے ہیں جنہیں الفا (Alpha) بٹا (Beta) ڈیلٹا (Delta) اور ایف (F) خلیے کا نام دیا گیا ہے ان خلیوں میں ہارمونس بنتے ہیں"۔[1]

ذیابطیس کی اقسام اور وجوہات:

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق ذیابیطس کی حتمی وجہ یا وجوہات کا ہمیں علم نہیں ہے۔ اب تک اکٹھا ہوئی معلومات کے مطابق مرض ذیابیطس کا کوئی ایک سبب نہیں بلکہ کئی اسباب مل کر خون گلوکوز میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس بنا پر ذیابیطس کو ہمہ عوامل مرض یعنی Multifactorial Disease کہا جاتا ہے۔ ذیابیطس کسی بھی عمر میں ہوسکتا ہے لیکن مریضوں کی اکثریت ادھیڑ عمر والوں کی ہوتی ہے۔ ذیابیطس دو قسم کی ہوتی ہے قسم۔1 لبلبہ کے بٹا خلیے تباہ ہونے سے انسولین کی تیاری متاثر ہوتی ہے۔ موروثی عنصر (Hereditary Factor) سے قسم۔1 ذیابیطس ہونے کے امکانات عام لوگوں کے مقابلے میں سات سے چودہ گنا بڑھ جاتے ہیں۔ (Immunological Factor) سے جسم کے مدافعتی نظام میں خرابی پیدا ہوتی ہے تب جسم اپنے اور پرائے میں فرق کرنے کی تمیز کھو بیٹھتا ہے جسم میں اپنے ہی بافتوں اور اعضاء کے خلاف نقصان دہ عمل شروع ہوتا ہے۔ ماحولیاتی عوامل (Environmental Factors) وائرس سرایت یا چھوت (Viral infection) سے بٹا خلیوں کی بربادی کا عمل شروع ہوتا ہے۔ بعض کیمیائی مادوں (Chemical) کو بٹا خلیوں کی تباہی کا ذمہ دار بھی بتایا گیا ہے۔

---

[1] ۔ذیابطیس کی شکایات اور علامات۔ ذیابطیس کے ساتھ ساتھ۔ ص:36,37

قسم۔1 کے وجوہات کا خاکہ اس طرح پیش کیا ہے:

موروثی ذیابیطس حسیت

تمہیدی واقعہ (ماحولی عنصر)

مدافعتی نظام میں خرابی کی ابتداء

بٹا خلیوں کی تباہی

انسولین کی تیاری متاثر

دوسرا تمہیدی واقعہ (ماحولی عنصر) وائرس چھوت

مرض کا ظاہر ہونا

[1] ۔مضمون، ذیابیطس کے ساتھ ساتھ۔ص:51

قسم 1. ذیابیطس کے مریضوں کے برخلاف قسم دوم (2) ذیابیطس شہری اور غیر متحرک طرز زندگی کے سبب بہت زیادہ عام ہے دونوں کی وجوہات میں فرق پایا جاتا ہے۔عمر اور موٹاپے کے سبب قسم دو ذیابیطس وقوع پذیر ہوتی ہے۔

ذیابیطس قسم دوم کی پہلی وجہ انسولین کی کمی سے اور عمر میں اضافے کے ساتھ انسولین بنانے والے خلیے بوڑھے ہو جاتے ہیں وہ درکار مقدار میں انسولین نہیں بنا پاتے ۔قسم دوم کے چند وجوہات کا خاکہ اس طرح ہے:

’’موروثی ذیابیطس

ماحولیاتی عوامل

زائد جسمانی وزن اور موٹاپا

توندی موٹاپا

غیر حرکیاتی طرز زندگی

تناؤ

چند غذائی عناصر

عابد معز نے ذیابیطس کی شکایات اور علامات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ان کے مطابق ذیابیطس کی شکایات اور علامات مختلف ہیں۔مثلاً بار بار پیشاب آنا۔ پیاس لگنا، زیادہ بھوک اور بسیار خوری، کمزوری اور تھکن ۔ بلاسبب وزن میں کمی، دھندلا نظر آنا، انسولین کی جلدی انفکشن ، پیرسُن ہونا، وغیرہ، لیکن ہر صورت میں عدم انسولین ہی ہے کیونکہ انسولین کی غیر موجودگی، کمی یا غیر کارکردگی سے گلوکوز خلیوں میں داخل نہیں ہو پاتا جس سے خون گلوکوز میں اضافہ (Hyperglycemin) ہوتا ہے۔عام حالات میں گلوکوز پیشاب میں نہیں آتی ۔گردے گلوکوز واپس جذب کر لیتے ہیں لیکن جب گلوکوز کی مقدار خاصی بڑھ جاتی ہے تو گردے زائد گلوکوز کو واپس جذب کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور پیشاب میں گلوکوز آنے لگتی ہے، جسے گلوکوز یا شکر بولیت (Glycosuria) کہتے ہیں۔پیشاب میں زیادتی کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ’’خون میں گلوکوز کی ایک حد سے بڑھی ہوئی مقدار گردوں کے ذریعہ جسم سے خارج ہونے لگتی ہے ۔ گلوکوز کی موجودگی سے پیشاب کے ارتکاز (Concentration) میں اضافہ ہوتا ہے۔ پیشاب کے ارتکاز کو طبعی حد میں لانے کے لیے جسم سے پانی کا اخراج عمل میں آتا ہے۔مریضوں کو زیادہ اور بار بار پیشاب آتا ہے‘‘۔ [1]

وزن میں کمی ذیابیطس کی علامت ہے۔وزن میں کمی کے تعلق سے ڈاکٹر عابد معز لکھتے ہیں:

> ’’ذیابیطس کے مریضوں کے وزن میں کمی ہوتی ہے جسمانی وزن میں کمی کی وجہ انسولین کا فقدان بتائی جاتی ہے۔انسولین کی کمی یا غیر کارکرد ہونے کے سبب گلوکوز توانائی کے لیے استعمال نہیں کی جاتی تو جسم میں گلوکوز کی مصنوعی قلت کو پورا

---

[1] ۔ذیابیطس کی شکایات اور علامات ۔ذیابیطس کے ساتھ ساتھ۔ص:59,60

کرنے کے لیے جسم پروٹین کو توڑ کر گلوکوز بناتا ہے۔ پروٹین کے ٹوٹنے سے
جسمانی وزن میں کمی ہوتی ہے''۔ ۱؎

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق خلیوں کو گلوکوز کا نہ ملنا بھوک کا احساس جگاتا ہے۔ بھوک بڑھتی ہے اور مریض زیادہ کھانے لگتا ہے:

''مرض ذیابیطس میں زیادہ بھوک اور زیادہ غذا حاصل کرنے کے باوجود وزن میں کمی ہوتی رہتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انسولین کی غیر موجودگی یا غیر کارکردگی کے سبب جسم غذا کا صحیح استعمال نہیں کر پاتا''۔ ۲؎

اسی طرح آگے ڈاکٹر عابد معز نے ذیابیطس کی شکایت کی نشاندہی کراتے ہوئے بینائی اور آنکھوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ جلدی شکایات کی جانب بھی توجہ مرکوز کرائی ہے، لکھتے ہیں:

''ذیابیطس کے اکثر مریض کھجلی (Itching) کی شکایت کرتے ہیں۔ کھجلی بالخصوص تناسلی حصوں (Genital Areas) میں زیادہ پریشان کرتی ہے۔ ذیابیطس کے مریضوں میں پھوڑے پھنسیاں اور دنبل دوسرے عام لوگوں کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔ زخم مندمل ہونے کے لیے زیادہ وقت لگتا ہے''۔ ۳؎

ان کا کہنا ہے کہ ذیابیطس کے علاج میں غذا بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر ہم غذا پر توجہ دیں تو خون گلوگوز کو قابو میں رکھ سکتے ہیں جس سے ذیابیطس مرض کنٹرول میں رہتا ہے غرض غذا کا صحیح وقت پر استعمال نہ کرنا مرض ذیابیطس پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتا ہے، لکھتے ہیں:

''ذیابیطس کا علاج ذیابیطس پر کنٹرول یا قابو پانے کا مطلب یہ ہے کہ خون گلوکوز اور انسولین میں ایسی مطابقت پیدا کرنا ہے جو خون گلوکوز کو طبعی حد میں رکھ

۱؎ ۔ ذیابیطس کی شکایات اور علامات ۔ ذیابیطس کے ساتھ ساتھ ۔ ص:60

۲؎ ۔ ذیابیطس کی شکایات اور علامات ۔ ذیابیطس کے ساتھ ساتھ ۔ ص:61

۳؎ ذیابیطس کی شکایات اور علامات ۔ ذیابیطس کے ساتھ ساتھ ۔ ص:61

سکے۔ ہم جانتے ہیں کہ ذیابیطس میں انسولین کی تیاری اور کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ اس نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسی غذا تجویز کی جائے کہ جسم میں موجود انسولین سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ غذا میں احتیاط اور مختلف تبدیلیوں سے خون تک پہنچنے والی گلوکوز پر کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ جس پر جسم میں موجود انسولین بہتر کام کرسکتا ہے یا یوں بھی ہوسکتا ہے کہ جسم میں موجود انسولین کی کارکردگی کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ موٹاپے میں وزن کم کرنے سے انسولین کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے۔ کم غذا اور ورزش سے وزن میں کمی ممکن ہوتی ہے۔ دوسری صورت میں دوائیں استعمال کی جاتی ہیں جو انسولین کی مقدار یا کارکردگی کو بہتر بناتی ہیں یا خارجی انسولین کا استعمال ہوتا ہے۔ غذا کی مقدار اور وقت کا لحاظ کرتے ہوئے انسولین اور دوائیں دی جاتی ہیں۔ متناسب غذا تجویز کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ دوائیں اور انسولین سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکے۔ ہر دو صورتوں میں غذا ذیابیطس کے علاج میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر غذا کے تعلق سے بے توجہی ہوتی گئی تو خون گلوکوز پر قابو پانا آسان بلکہ ممکن نہیں رہتا۔ غذا اور انسولین کے درمیان بگڑا ہوا توازن مزید بگڑ جاتا ہے اور مریض ذیابیطس کی پیچیدگیوں کا شکار ہوجاتا ہے''۔ [1]

ڈاکٹر صاحب کے مطابق صدیوں سے غذا کو امراض کا سبب اور علاج بھی مانا جاتا رہا ہے مرض ذیابیطس بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ عرصہ دراز تک ذیابیطس کو زیادہ شکر اور میٹھا کھانے سے ہونے والا مرض سمجھا جاتا رہا بلکہ اب بھی چند لوگوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر عابد معز زمانہ قدیم اور زمانہ جدید کی ذیابیطس اور غذا کے تعلق سے اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''غذا کے ذریعہ ذیابیطس کا علاج کا پہلا ثبوت سترہویں صدی کے اختتام پر ملتا ہے جب ذیابیطس مریضوں کو کم کاربوہائیڈریٹس

---

[1] ۔ ذیابیطس کے علاج میں غذا بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ذیابیطس کی شکایات اور علامات ص: 134,135

(Low-Corbohydrates) اور زیادہ لحمیات (High Proteins) والی غذا استعمال کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ مریضوں کی غذا دودھ پڈنگ اور گوشت پر مشتمل ہوتی تھی۔ اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی میں ذیابیطس مریضوں کو بھوکا رہنے کا مشورہ دیا جانے لگا۔ بعض معالج مریض کو ہر دوسرے دن فاقہ کروانے کے ساتھ زیادہ گوشت اور چکنائی استعمال کرواتے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں غذا کامیاب حراروں (Calories) میں رکھا جانے لگا تو ڈاکٹر کم حراروں والی غذا ذیابیطس مریضوں کو استعمال کروانے لگے۔ مریض کی حالت بہتر ہونے پر حراروں کی مقدار بڑھائی جاتی تھی .... ذیابیطس مریضوں کو دی جانے والی غذا کو ذیابیطس غذا کہا جاتا ہے۔ لیکن ذیابیطس مریضوں کی کوئی مخصوص غذا نہیں ہے۔ وہ عام صحت مند اور متوازن (Healthy balanced diet) استعمال کر سکتے ہیں جو غیر ذیابیطس لوگوں کے لیے تجویز کی جاتی ہے۔ تحقیق نے ثابت کیا ہے ذیابیطس غذا کا نام لے کر فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ عموماً شکر کے بجائے مصنوعی مٹھاس (Artificial Sweetener) اور بہتر چکنائی جیسے (Omega Fats) استعمال کر کے کھانوں کو ذیابیطس غذا کا لیبل چسپاں کر کے منہ مانگے دام وصول کئے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے لیکن بازار میں کئی غذائی اشیاء ذیابیطس کھانے (Diebetic Foods) کے عنوان سے فروخت کی جاتی ہیں۔[1]

دل کی کارکردگی کو بہتر رکھنے کے لیے ورزش ضروری ہے جس سے دل کے عضلات مضبوط ہوتے ہیں ساتھ میں بلڈ پریشر اور خون گلوکوز اور خون چکنائی میں کمی کے سبب امراض دل کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ ورزش سے توانائی یعنی حرارے (Calories) خرچ ہوتے ہیں۔ حرارے خرچ ہونے پر وزن میں

1۔ ذیابیطس میں غذا۔ ذیابیطس کے ساتھ ساتھ۔ ص: 137, 138

کمی ہوتی ہے۔اورانسولین مدافعت میں کمی اور کارکردگی میں بہتری ہوتی ہے۔اس لیے مرض ذیابیطس کے کنٹرول میں ورزش کوعلاج کےطور پراپنایا جاتا ہے، لکھتے ہیں:

''ذیابیطس مریضوں میں جسمانی حرکت یا ورزش اس لیے بھی زیادہ اہم ہوتی ہے کہ جسمانی حرکت (Physical Activity) جیسے چلنے پھرنے کام کرنے یا کھیل کود میں توانائی خرچ ہوتی ہے۔ان ارادی کام کے علاوہ غیرمحسوس طریقے اور غیرارادی طور پر جاری جسم کے مختلف افعال جیسے سانس لینا، دل کا دھڑکنا وغیرہ کے لیے بھی توانائی درکار ہوتی ہے۔ ہم درکار توانائی خون میں موجود گلوکوز جلا کر حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح جسمانی حرکت (Physical Activity) اور ورزش (Exercise) سے خون گلوکوز میں کمی ہوتی ہے۔ ورزش دوا جیسا اثر رکھتی ہے۔اس لیے مرض ذیابیطس کے کنٹرول میں ورزش کوعلاج کےطور پراپنایا جاتا ہے''۔[1]

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق شوگرس نباتات (Plant Kingdom) میں پائے جاتے ہیں۔ پھلوں، گھاس، پتوں اور جڑوں میں شوگرس موجود رہتے ہیں۔ پھلوں اور ترکاریوں میں میٹھا ذائقہ شکروز (شکر) اور فرکٹوز کی بدولت ہے۔

شکرایک سفید رنگ کا قلمی مادہ (Crystalline Substance) ہے جوفرکٹوز اور گلوکوز کے ایک ایک سالمہ (Molecule) سے مل کر بنا ہے۔ ہماری غذا میں قدرتی طور پر مختلف اشیاء میں شکر رہتی ہے۔ جب ہم پھل اور ترکاری کھاتے ہیں تو ہمیں شکر ملتی ہے اس شکر کو خلفی شکر (Intrinsic Sugar) کہتے ہیں یعنی وہ شکر جو ہمیں غذا سے ملتی ہے۔ دوسری جانب اس کی اہمیت وخصوصیات جراثیم کی افزائش کو روکتی ہے اسی لیے اس کو غذائی محافظ (Food Preservative) کےطور پر استعمال کیا جاتا ہے اس کی دوسری خوبی شکر غذائی اشیاء کی ساخت (Texture) میں تبدیلی ممکن ہے بعض اشیاء جو نرم اور ملائم

---

[1] ۔ورزش سے خون گلوکوز میں کمی ہوتی ہے۔ذیابیطس کے ساتھ ساتھ ص:103

(Soft) ہوتی ہیں۔ ان میں شکر کے اضافے سے سختی (Hardness) اور چبانے کے قابل (Crunchy) بنتی ہیں۔ اس سے ہمیں صرف توانائی ملتی ہے اس میں کوئی غذائیت جیسے پروٹین حیاتین معدنیات نہیں ہوتی۔ اس بنا پر شکر کو (Empty Calories) یعنی خالی حرارے کہا جاسکتا ہے۔ زائد شکر کے استعمال سے غذائیت متاثر ہوتی ہے اور زائد شکر والی غذاؤں میں پروٹین ریشہ اور بی کامپلکس وٹامنز اور وٹامن (سی) کی کمی دیکھی گئی ہے۔ اس کے باوجود ذیابیطس مریضوں کو شکر سے پرہیز کرنے کی تلقین کیوں کی جاتی ہے ملاحظہ فرمائیں:

> ''شکر اور میٹھی اشیاء کے پرہیز کا مشورہ اس خیال سے دیا جاتا ہے کہ شکر جلد ہضم ہو کر خون میں گلوکوز تیزی سے بڑھاتی ہے۔ شکر آسانی سے ہضم ہوتی ہے۔ شکر ہضم ہو کر گلوکوز اور فرکٹوز میں تحلیل ہوتی ہے۔ پھر جگر میں فرکٹوز میں تبدیل ہوتی ہے۔ اس طرح شکر آخر میں گلوکوز بن کر خون میں گردش کرنے لگتی ہے۔ لیکن تحقیق نے اس خیال کو غلط ثابت کیا ہے کہ شکر تیزی سے خون گلوکوز بڑھاتی ہے۔ ترقی یافتہ یا متمول سماج میں جہاں موٹاپا ذیابیطس دل کے امراض پتہ میں پتھری، چند کینسر، دانتوں کے امراض اور طرز عمل میں بے قاعدگیوں (Bchavorial Abnormalities) کی شرح زیادہ ہے وہاں فی کس شکر کا استعمال بھی زیادہ ہے اس بنا پر ان امراض کے لیے شکر کے زیادہ استعمال کو ایک اہم وجہ گردانا جاتا ہے۔ ذیابیطس کی ایک اہم وجہ درکار توانائی سے زیادہ حرارے حاصل کرنا ہے، موٹاپا ذیابیطس پیدا کرسکتا ہے۔ اگر شکر اور میٹھی اشیاء کے ذریعہ ہم فاضل حرارے حاصل کرتے ہیں اور جس کا قوی امکان رہتا ہے کہ مرض ذیابیطس وقوع پذیر ہوتا ہے'' [1]

---

[1] ذیابیطس اور شکر۔ ذیابیطس کے ساتھ ساتھ ص:195, 196۔

حفظان صحت

زندگی کا بھرپور لطف اٹھانے کے لیے صحت مند رہنا ضروری ہے اسی لیے بہتر صحت پانا اور اچھی صحت قائم رکھنا ہر انسان کا فرض ہے۔

ماہرین نے صحت بہتر کرنے اور صحت مند رہنے کے لیے چند طور طریقوں کو مفید بتایا ہے، جنہیں حفظان صحت اصول کہتے ہیں جیسے کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ دھونا، چھینکتے اور کھانستے وقت منہ پر آسرا کرنا اور دیگر چیزوں و ماحول کو پاک صاف رکھنا وغیرہ۔ ذیابیطس ایک منفرد مرض ہے جس کے علاج میں صرف دوا اور انسولین کے انجکشن کافی نہیں ہیں، بلکہ اس کے علاج کا ایک اہم پہلو طرز زندگی میں تبدیلی لانا اور حفظان صحت کے اصولوں پر عمل پیرا ہونا بھی ذیابیطس کے علاج کا حصہ ہے۔ کیونکہ گلوکوز پر صرف دوائیں اور انسولین ہی نہیں دوسرے عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں، جیسے جسمانی ریاضت چھوت یعنی انفکشن غذا کا وقت اور مقدار وغیرہ۔ عموماً دوسرے لوگوں کے ذیابیطس کی بہ نسبت ذیابیطس مریضوں کو ان اصولوں پر سختی سے عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ لاپروائی کا خمیازہ دیگر پیچیدگیوں کے امکانات بڑھا سکتا ہے۔ پیروں کی نگہداشت کے بارے میں ڈاکٹر عابد معز یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''اپنے پیروں کی حفاظت کیجئے اکثر مرتبہ یہ پہلا مشورہ ذیابیطس مریضوں کو ملتا ہے۔ ذیابیطس مرض میں پیروں کی دیکھ بھال اور نگہداشت پیچیدگیوں اور پیر یا انگوٹھے سے محروم ہونے سے بچنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ چند برسوں کے بعد ذیابیطس مریض کے پیروں میں تبدیلیاں واقع ہونے لگتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ذیابیطس مریضوں کے پیروں میں دوران خون میں کمی ہونے لگتی ہے۔ پیروں کے اعصابی ریشے (Nerves) متاثر ہونے سے درد اور پیر میں لگنے والے زخم کا احساس نہیں ہوتا۔ معمولی زخم جیسے جوتے کی رگڑ جلد کا خشک ہو کر پھٹنا بڑے انفکشن اور سڑن (Gangrene) کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے۔ ان

سے بچنے کے لیے خون شکر کو کنٹرول میں رکھنا اور پیروں کی جلد کو ثابت اور
تندرست رکھنا ضروری ہے۔مریضوں کو ہر دن اپنے پیروں کا معائنہ کرنا چاہیے
کہ کہیں چھالہ زخم یا رگڑ تو نہیں ہے۔اگر کوئی غیر معمولی بات ہو تو اس کا فوری
علاج کیا جانا چاہیے"[1]

ذیابیطس کے علاج میں جڑی بوٹیاں

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق زمانہ قدیم سے امراض کے علاج کے لیے جڑی بوٹیوں (Herbs) کا استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ یہ طریقہ علاج بہت قدیم ہے اور ہر زمین کے خطہ پر رائج ہے۔موسم اور آب وہوا کے لحاظ سے مختلف مقامات پر مختلف جڑی بوٹیاں استعمال کی جاتی ہیں اور ایک ہی مرض کے علاج کے لیے دنیا کے مختلف مقامات پر الگ الگ جڑی بوٹیوں کا استعمال ہوتا ہے۔

مرض ذیابیطس کے لیے جڑی بوٹیوں کا استعمال عام ہے۔جن کی تعداد چار سو سے زیادہ بتلائی جاتی ہے۔لیکن ان کا اثر اتنا نہیں ہے کہ انہیں بطور دوا ذیابیطس کے علاج میں استعمال کیا جاسکے۔کیونکہ انہیں ماڈرن دواؤں کے معیار پر پرکھا اور تیار نہیں کیا جاتا ہے۔دوسری جانب تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ ذیابیطس کے علاج میں استعمال ہونے والی بعض جڑی بوٹیاں جیسے (Corriander Sativum Phazya Stricta ALOVE-Vera) وغیرہ خون گلوکوز میں خاطر خواہ کمی نہیں کرتے اور دو ایک جڑی بوٹیاں مثال کے طور پر (Moringa Oleifera) ایسی ہیں جو خون گلوکوز میں اضافہ کا باعث بھی بنتی ہیں۔

ذیابیطس ایک کہنہ مرض ہے۔اسی لیے اس مرض میں جڑی بوٹیوں کا استعمال دوسرے امراض کی نسبت کچھ زیادہ ہے کیونکہ مریض مستقل دوائیں اور انجکشن لیتے ہوئے بیزار ہوجاتے ہیں ان سے چھٹکارا پانے کی آس میں جڑی بوٹیوں کو آزماتے ہیں۔ذیابیطس کے لیے مختلف ممالک میں مختلف جڑی بوٹیاں

---

[1] ۔ذیابیطس اور حفظان صحت۔ذیابیطس کے ساتھ ساتھ۔ص:210

استعمال کی جاتی ہیں، لکھتے ہیں:

’’ذیابیطس کے علاج میں چار سو سے زیادہ جڑی بوٹیوں کو فائدہ بخش سمجھا جاتا ہے۔ مختلف مقامات پر مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں ذیابیطس کے علاج میں استعمال کی جاتی ہیں۔ میکسیکو (Maxico) میں Nopal (ایک قسم کا کیکٹس پودا) اور Aloe Veral (ایک قسم کا گھیگوار) کا استعمال عام ہے۔ مراقش میں میتھی کو فوقیت حاصل ہے۔ کینڈا میں Blue Berry نیلے رنگ کی گوندنی کو آزمایا جاتا ہے۔ سعودی عرب میں Myrrh (لوبان کی طرح ایک گوند) میتھی اور دوسری جڑی بوٹیاں ذیابیطس کے علاج میں استعمال کی جاتی ہیں۔ فلپین میں زیادہ استعمال ہونے والی جڑی بوٹیاں Ampalaya اور Banaba امپالایا فلیفین زبان میں کریلے کو کہتے ہیں۔ ہندوستان میں مرض ذیابیطس کے علاج میں استعمال ہونے والی جڑی بوٹیاں یوں تو کئی ہیں لیکن میتھی جامن اور کریلے کا استعمال عام ہے‘‘۔[1]

میتھی کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب یوں فرماتے ہیں:

’’تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ میتھی کے بیج خون گلوکوز میں کمی کا باعث ہیں۔ ذیابیطس کی دواؤں کے ساتھ میتھی کے استعمال سے دواؤں کے اثر میں تیزی بھی دیکھی گئی ہے۔ میتھی کے بیج خون میں چکنائی (Blood Lipids) بھی کم کرتے ہیں۔ سالم بیجوں کے بجائے اگر ان کا کشید (Extract) یا عرق پیا جائے تو خون گلوکوز خون چکنائی پر میتھی کا اثر نہیں ہوتا‘‘۔[2]

جامن اور کریلے کے مطابق لکھتے ہیں:

’’جامن (Jambu Fruit) ایک پھل ہے جو ہندوستان میں پایا

---

[1]۔ ذیابیطس کے علاج میں جڑی بوٹیاں۔ ذیابیطس کی شکایات اور علامات ص:225,226

[2]۔ ذیابیطس کے علاج میں جڑی بوٹیاں۔ ذیابیطس کی شکایات اور علامات۔ ص:226

جاتا ہے۔اس کا نباتی نام Syzygim Cumini ہے۔ جامن پھل کی گٹھلی اور تنے کی چھال کو دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔مرض ذیابیطس کے علاج میں جامن کا بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔جانوروں پر ہوئی تحقیق میں جامن کو خون گلوکوز کم کرنے میں مؤثر پایا گیا۔جامن پھل سے چار ایسے مرکبات بھی حاصل ہوئے جو خون گلوکوز کم کرنے میں کارآمد ثابت ہوئے ہیں'۔ [1]

کریلا

ذیابیطس کے مریضوں کو کریلے کا رس استعمال کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ کریلے کا رس ذیابیطس مریضوں کے خون میں گلوکوز کی مقدار کم کرتا ہے۔مریض کو ہر دن چار تا پانچ کریلے کا رس نہار پیٹ پینے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ کریلے کے رس میں ایک مرکب پایا جاتا ہے جو خون گلوکوز میں کمی کرتا ہے۔اس مرکب کو (Plant Insulin) یا نباتی انسولین کا نام دیا گیا ہے لیکن تحقیق نے یہ ثابت نہیں کیا ہے کہ نباتی انسولین مروجہ دواؤں سے بہتر تاثر رکھتا ہے۔اسی لیے ماہرین کا خیال ہے کہ ذیابیطس مریضوں کو دوا کے بجائے ترکاری کے طور پر کریلے کا استعمال کرنا چاہیے'۔

انسولین

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق ،انسولین ایک ہارمون ہے۔کیمیائی نقطہ نظر سے یہ ایک پروٹین ہے جو معدہ میں ہضم ہو کر امینو ترشوں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔انسولین کو کھایا نہیں جا سکتا۔اس لیے اس کو جسم کے اندر سالم شکل میں پہنچانا پڑتا ہے۔جسم میں پہنچ کر انسولین خون میں گردش کرتے ہوئے اپنا اثر دکھاتا ہے۔یعنی خون میں بڑھی ہوئی گلوکوز کو کم کرتا ہے۔

---

[1] ۔ذیابیطس کے علاج میں جڑی بوٹیاں۔ذیابیطس کی شکایات اور علامات۔ص:225,226

[1] ۔ذیابیطس کے علاج میں جڑی بوٹیاں۔ذیابیطس کے ساتھ ساتھ۔ص:227, 228

انسولین کے ہارمون خون شکر کو طبعی حد میں رکھتا ہے۔لیکن جب جسم میں انسولین کم بنتا ہے یا غیر کارگر ہوتا ہے تو ذیابیطس کی شروعات ہوتی ہے۔انسولین کی مختصر تعریف،اس کی اہمیت،افادیت اوراس کے افعال ملاحظہ کیجیے:

''انسولین (Insulin)ایک ہارمون (Hormone) ہے جسے لبلبہ (Pancreas)میں موجود جزیرات لینگسرنیس (Islets of longerhars)بٹاخلیے (Beta Cells) تیار کرتے ہیں ہارمون بغیر نالی والے غدود سے خارج ہونے والا مادہ ہے جوخون میں شامل ہوکر اثرات مرتب کرتا ہے۔غذا حاصل کرنے کے بعد خون گلوکوز میں اضافہ ہوتا ہے۔خون گلوکوز میں اضافہ انسولین ضرورت کا پیغام ہے۔لبلبہ انسولین تیار کرکے یا جمع شدہ انسولین کوخون میں خارج کرتا ہے۔خون میں انسولین گردش کرتے ہوئے خلوی دیواروں (Cell-Walls) پر موجود مخصوص انسولین اخذہ (Insulin Receptor) پر چسپاں ہوتا ہے اور انسولین کے زیراثر خلیے خون سے گلوکوز قبول کرنے لگتے میں داخل ہونے کا دروازہ ہے اور انسولین اس دروازہ کی چابی ہے۔انسولین کی موجودگی اور بہتر کارکردگی سے دروازہ کھلتا ہے اور گلوکوز خلیے کے اندر داخل ہوتی ہے۔انسولین کی غیر موجودگی اور غیر کارکردگی کے سبب دروازے کھلتے ہیں اور نہ ہی گلوکوز خلیوں کے اندر داخل ہوسکتی ہے۔

1)۔انسولین گلوکوز کوخلیوں خاص کر عضلی اور شحمی خلیوں کے اندر پہنچانے میں معاون ہوا ہے۔

2) انسولین زائد گلوکوز کو چکنائی (Fat) میں تبدیل کرکے توانائی کا ذخیرہ کرنے میں شحمی خلیوں کی مدد کرتا ہے۔

3) انسولین امینو ترشوں (Acids Amino) کوخلیوں کے اندر داخل

ہونے میں مدد کرتا ہے۔ ۱ے

لبلبہ کے بٹا خلیے انسولین تیار کر کے خون میں خارج کرتے ہیں۔ایک صحتمند انسان کا لبلبہ ایک یونٹ فی گھنٹہ کے حساب سے انسولین کو خون میں داخل کرتا ہے۔اس طرح چوبیس گھنٹوں کے دوران ایک عام انسان کے لبلبہ سے چوبیس یونٹ انسولین کا اخراج عمل میں آتا ہے۔

انسولین کو 1921 میں دریافت کیا گیا اور صرف دو سال کے اندر ہی بازار میں دستیاب ہونے لگا۔تب سے اب تک انسولین کی تیاری اور استعمال میں کئی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔اب بازار میں کئی اقسام کے انسولین دستیاب ہیں۔

انسولین صرف انجکشن کے ذریعہ لیا جاتا ہے۔یہ ایک پولی پیٹائڈ (polypeptide) ہارمون ہے جو معدہ میں ہضم ہو کر ناکارہ ہو جاتا ہے۔اسی لیے انسولین کو جسم کے اندر داخل کرنا پڑتا ہے۔انسولین تیاری کے تعلق سے ملاحظہ فرمائیے۔

> انسولین جانوروں کے تازہ منجمد (Frozen) لبلبہ سے حاصل ہونے والے انسولین کو بقری یا گاؤ انسولین (bovine insulin beef/) کہتے ہیں۔انسانی اور گاؤ انسولین کے امینو ترشوں (amino acids) میں تین امینو ترشوں میں فرق پایا جاتا ہے۔خنزیر کے لبلبہ سے تیار کیے گئے انسولین کو خنزیری انسولین (Pork/Porcine insulin) کہتے ہیں۔ جو انسانی انسولین سے صرف ایک امینو ترشے میں مختلف ہوتا ہے'' ۔۲ے

1980ء کے آس پاس پہلی مرتبہ انسانی انسولین تیار کیا گیا۔اسکی تیاری میں انسان یا اس کے لبلبہ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔اس تعلق سے ڈاکٹر عابد معز، یوں رقم طراز ہیں:

> ''انسانی انسولین کو دو طریقوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ پہلے طریقے میں

۱ے ۔ انسولین۔خون گلوکوز کم کرتا ہے۔ذیابیطس کی شکایات اور علامات۔ص39,40,41۔

۲ے۔خون گلوکز کم کرنے کے لیے انسولین،ذیابیطس کی شکایات اور علامات ص نمبر 231,232

خنزیری انسولین کو خامروں (Enzynes) کی مدد سے انسانی انسولین میں
تبدیل کیا جاتا ہے۔اس قسم کے انسولین کو ای ایم پی (Enzymatically
modified insulin) مخففEMP، انسانی انسولین کہتے ہیں۔
دوسرے طریقے میں حیاتیاتی تکنیک (Biotechnology) کی مدد
سے خوردبینی نامیات (Microrganisms) کے ڈی این اے (DNA)
میں ایسی تبدیلیاں لائی جاتی ہیں جس سے خوردبینی نامیات انسانی انسولین تیار
کرنے لگتے ہیں۔عام طور پر دوطرح کی تکنیک استعمال ہوتی ہے اور تیار ہونے
والے انسولین کو پی آر بی (Recombinant Bacteria
Proinsultin) مخفف PRB اور پی وائی آر (Yeast
Recombmeant Precursoo) مخفف PYR انسانی انسولین
کہتے ہیں۔اس طریقے سے کثیر مقدار میں انسولین تیار کیا جاتا ہے''۔ [1]

انسولین دراصل میں سادہ انسولین ہی ہوتا ہے اس کے استعمال میں کئی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جسے حیاتین اثرات (Allergic reactins) بہت ہی کم ہوگئے ہیں۔انسانی انسولین فائدوں کے پیش نظر گاؤاور خنزیری انسولین کے استعمال کو آہستہ آہستہ موقوف کیا جاتا ہے۔

عمل قلماؤ (Crystallization)

عمل قلماؤ (Crystallization) کے ذریعہ نسبتاً خالص انسولین (Purifiedinsulin) تیار ہونے لگے۔ انھیں single peak انسولین کہا جاتا ہے۔آخرکار 1970 میں خالص انسولین (Highly purified مخففHP) یا ایم سی (Monocomponent مخففMC) انسولین تیار کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔اس قسم کے انسولین میں دیگر مرکبات کا تناسب 10،PPM (دس حصے

---

[1] ۔خون گلوکوز کم کرنے کے لیے انسولین، ذیابیطس کی شکایات اور علامات۔ص نمبر232۔

فی ملین) سے کم ہوتا ہے۔ آج ایم سی MC انسولین کی دستیابی سے حیاتین مسائل میں خاص کمی ہوئی۔ دور حاضر میں انسولین میں ملاوٹ کے مسئلہ پر قابو پالیا گیا ہے اب بازار میں خالص انسولین ہی ملتے ہیں۔

ایک اور انسولین جس کو انتہائی مختصر مدتی انسولین (Ultra short acting insulin) کہتے ہیں جو حیاتیاتی تکنیک سے بیکٹریا (Bacteria) کے ذریعہ تیار کیا گیا ہے یہ جدید ترین انسولین ہے جو انسانی انسولین کے بی چین کے دو امینوترشوں کو تبدیل کرکے تیار کیا جاتا ہے۔ ایسے انسولین لیسپرو (lispro) یا اسپارٹ (Aspart) کا نام دیا گیا ہے۔ یہ انجکشن دینے کے پندرہ منٹ بعد اپنا اثر شروع کرتا ہے۔ لیکن صرف تین چار گھنٹوں کے لیے ہوتا ہے۔ دوسری جانب اس کو ایمرجنسی کی حالت میں بہت جلد اثر وکارکردگی کے لیے دیا جاتا ہے۔

انسولین کی حفاظت کے تعلق سے ڈاکٹر عابد معز کہتے ہیں کہ انسولین کو بہت زیادہ گرمی اور ٹھنڈک سے بچانا چاہیے۔ بہتر کارکردگی کے لیے 2 یا 8 ڈگری سنٹی گریڈ کے درمیان رکھنا چاہئے۔ فریج کے عام حصہ میں درجہ حرارت 4 ڈگری سنٹی گریڈ ہوتی ہے جو انسولین کے لیے مناسب ہے۔ اس درجہ حرارت پر انسولین کو تین سال کی مدت تک رکھا جاسکتا ہے۔ سفر کے دوران بوتل میں گیلے کپڑے میں لپیٹ کر سورج کی تمازت سے بچا کر رکھنا چاہئے یا پھر تھرماس میں ٹھنڈے پانی کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔

انسولین استعمال کرنے سے پہلے بغور دیکھ لینا چاہئے کہ اس میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہوئی ہے۔

انسولین مائع شکل میں ملتا ہے۔ سادہ انسولین پانی کی طرح صاف اور شفاف ہوتا ہے۔ یہ گدلا ہوجائے یا اس میں رنگ نظر آئے یا اس میں ٹھوس مادے نظر آئیں تو یہ سادہ انسولین خراب ہونے کی نشانیاں ہیں۔

وسط اور طویل مدتی اور مخلوط انسولین گدلے مبہم اور غیر شفاف ہوتے ہیں۔ اگر ان میں دھبے

لنڈے نظر آئیں یا بوتل کی دیواروں پر انسولین جمع ہوجائے یا رنگ نظر آئے تو یہ انسولین خراب ہونے کے اشارے ہیں۔ایسے انسولین کو استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

انسولین کو عام حالت میں جسم میں جلد کے نیچے چربی اور عضلات کے درمیان اور ایمرجنسی کے دوران یعنی بہت زیادہ خون گلوکوز اور کوما کی حالت میں عضلات اور وریدوں میں داخل کیا جاتا ہے۔ عام طور پر انسولین لینے کے لیے ڈاکٹر عابد معز مشورہ دیتے ہیں:

''انسولین کا انجکشن یا ٹیکہ لگانے سے پندرہ سے تیس منٹ پہلے لگایا جاتا ہے۔اگر کسی وجہ سے کھانے سے پہلے انسولین کا ٹیکہ نہ لے سکیں تو کھانے کے بعد لینا چاہئے''۔[1]

بعض لوگ انجکشن سے بہت گھبراتے ہیں۔بالخصوص وہ سوئی سے ڈرتے ہیں۔سوئی کی چبھن سے چھٹکارا دلانے کے لیے injection aids نامی آلے ملتے ہیں۔جن کی مدد سے انسولین کو جسم میں آسانی سے داخل کیا جاتا ہے۔انسولین پمپ (insulin pumps) کے ذریعہ بھی جسم میں انسولین داخل کیا جاسکتا ہے۔یہ ماچس کی ڈبی کی جسامت جتنا ہوتا ہے۔فی الحال انسولین پمپ کا استعمال عام نہیں ہے۔ انجکشن کے بدلے دیگر طریقوں سے جسم میں داخل کرنے کی کوشش جارہی ہے۔انسولین شامہ(insulin inhaler سونگھنے کے لیے انسولین کی تیاری میں ابتدائی کامیابی ملی ہے۔ابھی تحقیق جاری ہے۔ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں انسولین کو سانس کے ذریعہ جسم میں داخل کیا جاسکے گا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ انسولین کا ٹیکہ مرض ذیابیطس کا علاج نہیں ہے۔دراصل جسم میں نہ بننے والے انسولین کو ٹیکہ کے ذریعہ جسم میں بالعموم منتقل کیا جاتا ہے۔ٹیکہ لینے کے بہتر مقامات ونشاندہی کچھ اس طرح ہے۔ران کے سامنے اور بازو (front and sides of Thigh) زیرناف پیٹ lower

---

[1] جسم میں انسولین داخل کرنے کے طریقے، ذیابیطس کی شکایات اور علامات۔ص نمبر 241

abdomen ،کولہا buttocks اور بانہوں کے سامنے اور بازو (Upper arms) شامل ہیں۔
انجکشن کا مقام تبدیل کرتے رہنا چاہئے کیوں کہ جلد کے نیچے چربی انسولین کی مستقل موجودگی سے سوکھنے لگتی ہے جسے atrophy کہتے ہیں یا چربی یکجا ہوکر lump یعنی گلٹی بن جاتی ہے۔ ہر مرتبہ انجکشن لینے کا مقعد بدلنا چاہئے۔ بعض وقت انجکشن دینے کے بعد خون نکل آتا ہے۔ یا چند گھنٹوں بعد انجکشن کی جگہ نیل کند ہوجاتی ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب سوئی کوئی خون کی چھوٹی نالی جسے شریان capillary کہا جاتا ہے کو چھیدتی ہے تو خون نکل آتا ہے۔ لیکن کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق مرض ذیابیطس اکیسویں صدی میں صحت عامہ کے لیے ایک چیلنج بن کر ابھر رہا ہے۔ بعض ماہرین ذیابیطس کو دور حاضر کی ایک وبا epidemic قرار دیتے ہیں۔ وبا سے مراد وہ مرض جو بیک وقت کئی لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔

عالمی سطح پر ایک ادارہ آئی ڈی ایف (International diabetes fedration) قائم ہے جو مرض ذیابیطس کے متعلق معلومات اکٹھا کرتا ہے اور مختلف امور پر رہنمائی کرتا ہے اس کی روک تھام کے لیے پروگرام بھی وضع کرتا ہے۔ ہر سال 14 نومبر کو عالمی یوم ذیابیطس world diabetes day منایا جاتا ہے۔ آئی ڈی ایف، ڈاکٹر عابد معز 2005 کے ایک سروے کے مطابق ذیابیطس کی شرح وقوع کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آئی ڈی ایف کے اندازے کے مطابق ۲۰۰۵ء میں ذبیابیطس لوگوں کی تعداد ۱۹۴ملین کے لگ بھگ تھی۔ مرض ذیابیطس دنیا کے دو چار عام غیر متعدی امراض میں سے ایک ہے۔ پچھلے تین چار دہوں سے ذیابیطس کی شرح وقوع میں اضافہ دیکھا جارہا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں ذیابیطس لوگوں کی تعداد ۳۰ملین تھی ۲۰۰۳ء میں ۱۵۰ملین سے تجاوز کرچکی تھی۔ اب اندازہ لگایا جارہا ہے کہ ۲۰۲۵ء میں دنیا میں ۳۳۳ملین یعنی ۳۳ کروڑ سے زیادہ افراد ذیابیطس سے متاثر ہوں گے۔

مختلف مقامات پر ذیابیطس سے متاثر ہونے کی شرح میں ۴۰ سے ۷۰ فیصد
تک اضافہ دیکھا گیا ہے۔ یہ اضافہ ترقی پذیر ممالک میں زیادہ ہے"۔ ۱؎

ذیابیطس کی شرح مروجہ ترقی یافتہ ممالک میں زیادہ ہے۔ لیکن ماہرین کا خیال ہے کہ جلد ہی ترقی پذیر ممالک میں بھی ذیابیطس کی شرح زیادہ ہوجائے گی۔ آئی ڈی ایف کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ ذیابیطس مریض ہندوستانیوں کی ہے۔

۲۰۰۳ کے دوران اکٹھا کئے گئے معلومات کے بموجب ذیابیطس لوگوں کی تعداد کے لحاظ سے پہلے پانچ ممالک ہندوستان ۵۔۳۵ ملین یعنی ساڑھے تین کروڑ چین ۸ء۲۳ ملین، امریکہ ۱۶ ملین، روس ۷ء۹ ملین اور جاپان ۷ء۶ ملین تھے۔

دنیا کے ممالک جہاں سب سے زیادہ ذیابیطس لوگ بستے ہیں۔

۱۔ ہندوستان
۲۔ چین
۳۔ امریکہ
۴۔ روس
۵۔ جاپان
۶۔ انڈونیشیا
۷۔ پاکستان
۸۔ برازیل
۹۔ اٹلی
۱۰۔ بنگلہ دیش، ۲؎

۱؎ ۔جسم میں انسولین داخل کرنے کے طریقے، ذیابیطس کی شکایات اور علامات ص نمبر 21
۲؎ ۔جسم میں انسولین داخل کرنے کے طریقے، ذیابیطس کے ساتھ ساتھ۔ ص نمبر 22

دنیا بھر میں ذیابیطس لوگوں کی تعداد ۷۱ملین بتائی جاتی ہے۔اس لحاظ سے دنیا میں پائے جانے والے ہر پانچواں ذیابیطس مریض ہندوستانی ہے۔گو کہ ہندوستان کی آبادی زیادہ ہے لیکن چین سے کم ہی ہے۔۱۹۷۰ء سے پہلے کے اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ آبادی کا ایک تا دو فیصد حصہ اس مرض سے متاثر تھا۔ ڈاکٹر عابد معز ہندوستان کی بڑھتی ہوئی شرح وقوع کی جانب اس طرح اشارہ کیا ہے:

''ہندوستانیوں میں ذیابیطس سے متاثر ہونے کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہماری زندگی دوسروں کی بہ نسبت کم حرکیاتی ہے۔ ہم غیر حرکیاتی زندگی sadentry life کے عادی ہیں۔ ہم کھیل کود میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لیتے اور بیٹھ کر گپ شپ کرنے اور ٹیلی وژن دیکھنے کو حرکیاتی تفریح پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہمارے پاس دنیا میں سب سے زیادہ فلمیں بھی تیار ہوتی ہیں۔ موٹاپے کی ایک اہم وجہ غیر حرکیاتی زندگی گذارنا ہے۔ اسکولی بچوں میں موٹاپے کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بچوں کے درمیان بڑا سخت مقابلہ ہے۔ بچوں کو کھیل کود کے لیے وقت نہیں ملتا اور انھیں وہ ماحول بھی میسر نہیں ہے جس میں حرکیاتی زندگی کو اہمیت اور فوقیت دی جاتی ہے۔[۱]

ڈاکٹر عابد معز نے ہندوستان کے 6 مختلف شہروں کا اعداد وشمار بھی پیش کیا ہے۔

ہندوستان کے چھ بڑے شہروں میں کئے گئے سروے سے پتہ چلا ہے کہ 12 فیصد بالغ شہری مرض ذیابیطس سے متاثر ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کے شہروں میں یہ شرح صرف 6 فیصد ہے۔ شہر حیدرآباد سب سے آگے ہے جہاں 14.4 فیصد لوگ ذیابیطسی ہیں۔ دوسرے مقام پر چینائی (13.5 فیصد) اور تیسرے مقام پر بنگلور شہر ہے جہاں پر 12.4 فیصد لوگ ذیابیطسی ہیں''۔[۲]

۱۔ جسم میں انسولین داخل کرنے کے طریقے، ذیابیطس کے ساتھ ساتھ ص نمبر 27،

۲۔ جسم میں انسولین داخل کرنے کے طریقے، ذیابیطس کی شکایات اور علامات ص نمبر 27

اب تک کی تحقیق کے حوالے سے ذیابیطس لاعلاج اور دائمی روگ ہے بلکہ یہ ام الامراض اور باب الامراض بھی ہے جو کئی خطرناک امراض کو جنم دیتا ہے اور ہر دم تشخیص کے لیے خون پھر ہر ماہ خطیر رقم مختص کرنی پڑتی ہے اس کے باوجود یہ مرض مریض کے ساتھ شریک زندگی بن کر عمر بھر ساتھ رہتا ہے۔ مضمون شکر بیتی، تصنیف سگ گزیدہ میں ڈاکٹر عابد معز شگفتہ انداز میں مزاحیہ دعا کے ساتھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''مرض کی پیچیدگیوں کے بارے میں تحریر تھا کہ شکر کا مرض 'ام امراض' اور 'باب الامراض' ہے۔ کئی دوسرے خطرناک امراض کو جنم دیتا ہے۔ ان بیماریوں کے نام پڑھ کر ہی ہمیں پسینہ آنے لگا۔......شکر کے مرض پر کتابیں پڑھ کر ہم بہت پریشان ہوئے۔ خداوند کریم کی بارگاہ میں گڑگڑانے لگے کہ تو نے کس خطا کی سزا میں ایسا جلالی مرض عطا کیا ہے۔ تشخیص کے لیے ہر دم خون چاہئے۔ علاج کے لیے دن میں تین چار انجکشن چاہیے۔ ساتھ سخت پرہیز، شکر نہ کھاؤ، شربت نہ پیو، پھیکی چائے نوش جان کرو، کم کھاؤ، وزن نہ بڑھاؤ، ہاتھ پاؤں صاف رکھو، زخموں کو نہ کریدو، ان کا علاج جلد کراؤ اور مرلے پر سودرے یہ کہ مرض شکر دوسرے امراض کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔......خدایا ہمیں کوئی مرض دینا ہی تھا تو کسی دوسرے معصوم امراض بھی ہیں ان میں سے کسی کو بخش دیتا''۔[1]

☆☆☆

---

[1] شکر بیتی، سگ گزیدہ۔ ص نمبر 45-44

چکنائی اور ہماری صحت

''چکنائی اور ہماری صحت'' ڈاکٹر عابد معز کی طب کے تعلق سے دوسری تصنیف ہے اور یہ ہدیٰ ڈسٹری بیوٹرس سے جنوری ۲۰۱۱ء کو شائع ہوئی۔ اس میں جملہ ۲۱ مضامین ہیں۔ اور یہ ۱۴۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۲۶ سے ۱۳۸ کے درمیان طبی فرہنگ اور تشریحات پیش کی گئی ہے۔ اس کا مقدمہ ڈاکٹر محمد عبدالمعید M D ریاض سعودی نے لکھا اور اس پر محمد یوسف مڑ کی ایڈیٹر سائنس ٹیکنالوجی اور میڈیسن روز نامہ اعتماد نے اپنی رائے دی ہے۔ اس تصنیف کے شائع کرانے کے تعلق سے پیش لفظ میں ڈاکٹر عابد معز لکھتے ہیں:

> ذیابیطس کے ساتھ ساتھ کی پذیرائی سے مجھے حوصلہ ملا اور اندازہ ہوا کہ اردو زبان میں صحت اور طب کے موضوع پر معلوماتی اور مفید کتابوں کی ضرورت ہے۔ اس خیال سے میں نے ایک عام موضوع چکنائی یعنی fats پر پچھلے چند برسوں میں تحریر کردہ مضامین کو کتابی شکل دینے کا فیصلہ کیا۔۔ غرض ہماری صحت اور مختلف امراض سے بچاؤ اور روک تھام کے لیے چکنائی کا موضوع اہم اور چکنائی کے بارے میں تفصیلی معلومات درکار ہیں۔ میں نے یہ کتاب اسی مقصد سے لکھی ہے کہ قارئین چکنائی کے حصول اور انتخاب میں صحیح معلومات اور رہنمائی حاصل کرسکیں۔[1]

چکنائی کیا ہے:

چکنائی روغن یا شحم یا چربی کی کوئی واضح اور جامع تعریف نہیں ہے اور چکنائی کی تعریف مختلف طریقہ سے کی جاتی ہے۔ ایک عام تعریف یہ ہے کہ اسے چھونے سے چکناہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ چکنائی کی

---

[1] پیش لفظ، عابد معز، چکنائی اور ہماری صحت۔

دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ پانی میں حل پذیر نہیں ہے اور پانی سے کم کثافت (density) رکھتی ہے۔اس لیے چکنائی پانی پر تیرتی ہے۔ کیمیائی تعریف کے لحاظ سے چکنائی (lipids or fats) نامیاتی مادے ہیں۔ جو کاربن (corbun) ہائیڈروجن (hydrogen)اورآکسیجن (oxygen) جواہر (atoms) سے بنے ہوتے ہیں۔ان جوہروں کے درمیان مختلف طریقوں کے بندھن (bonds) سے مختلف اقسام کی چکنائی یا لیڈس وجود میں آتے ہیں۔ غذائی نقطۂ نظر سے چکنائی ہماری غذا کا ایک حصہ ہے جو نباتی اور حیوانی ذرائع سے حاصل ہوتی ہے۔ چکنائی تین مقویات یعنی (چکنائی شکریات نشاستے اور لحمیات) کلاں میں سے ایک مقوی (nutrient) ہے۔انہیں مقویات کلاں اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی ضرورت پچاس سے تین چار سو گرام میں پڑتی ہے۔ مقویات کلاں ہمیں توانائی کی فراہم کرتے ہیں۔ایک گرام چکنائی سے ہمیں ۹ کیلوری ملتے ہیں۔ جبکہ دوسرے مقویات کلاں شکریات اور لحمیات کے ایک گرام سے صرف ۴ کیلوری حاصل ہوتی ہیں۔ گو کہ چکنائی کی مختلف اقسام ہیں لیکن ان سے حاصل ہونے والی توانائی یکساں ہوتی ہے۔

غذا سے حاصل کی ہوئی چکنائی نظام ہضمی میں ہضم ہو کر مختلف روغنی ترشوں میں تبدیل ہوتی ہے۔ یعنی نظام ہضمی میں غذائی چکنائی چھوٹے چھوٹے بنیادی اجزاء میں جذب ہو کر خون میں پروٹین کے ساتھ مل کر شحمی لحمیات میں مل کر گردش کرتے ہیں ۔خون میں گردش کرنے والی چکنائی کو (blood lipids) یا خون چکنائی کہتے ہیں۔

خونی چکنائی کے علاوہ جسمانی چکنائی ایک نارمل انسان میں چکنائی جسمانی وزن کا ۱۵ سے ۱۸ فیصد ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ۶۰ کلو وزنی شخص میں ۹ کلو چکنائی ہوتی ہے۔ چکنائی توانائی کے ذخیرے کے طور پر شحمی خلیوں (fat cells) اور شحمی بافتوں (fat dissues) میں جمع ہوتی ہے۔ عموماً چار ہفتوں تک کام دے سکتی ہے۔

غذا میں چکنائی ذائقہ ابھارتی اور اسے کھانے کے قابل بناتی ہے۔ چکنائی بھوک مٹاتی اور شکم سیری کا احساس پیدا کرتی ہے، تو جسم میں چکنائی خلیوں کا حصہ بنتی ہے جہاں وہ مختلف اشیاء کی آمدورفت پر کنٹرول کرنے والے نظام میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ چونکہ جلد کے نیچے چربی کی شکل میں جمع ہوتی ہے۔ یہ چربی ہماری شکل خوب صورت بناتی اور جسمانی درجہ حرارت برقرار رکھنے میں مدد کرتی ہے۔ اعضاء کے اطراف بھی چربی جمع ہوتی ہے۔ جو اعضاء کی بیرونی چوٹوں اور صدموں (shocks) سے محفوظ رکھنے کے کام انجام دیتی ہے۔

چکنائی کی اقسام

قدرتی طور پر کئی اقسام کی چکنائیاں پائی جاتی ہیں۔ آسانی کے لیے ہم چکنائی کو مختلف زمروں میں تقسیم کرنے کے ان کی خوبیوں اور مضر اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ انسانی غذا میں چکنائی کے دو ذرائع ہیں۔ حیوانی (animal source) اور نباتی (plant source)

حیوانی چکنائی animal source

جانوروں سے حاصل ہونے والی چکنائی جیسے دودھ اور دودھ سے بنی اشیاء (مکھن گھی) گوشت مچھلی اور انڈے کا شمار حیوانی چکنائی میں ہوتا ہے۔

یہ چکنائی زیادہ تر سیر شدہ (saturated) ہوتی ہے۔ اور اس میں کولیسٹرول پایا جاتا ہے۔

نباتی چکنائی plant or vegetable fats

نباتی ذرائع جیسے مکھن، تل، سورج مکھی، مونگ پھلی، زیتون، کھوپرا، پام تیل اور کو کو خشک میوؤں کی چکنائی شامل ہے۔ یہ زیادہ تر نا سیر شدہ (فائدہ مند) (unsaturated) ہوتی ہے۔ اور اس میں کولیسٹرول نہیں ہوتا۔ ۱)۔ سیر شدہ یعنی گنجائش کے برابر ہائیڈروجن جو صحت کے لیے مضر۔ ۲)۔ نا سیر شدہ یعنی میں گنجائش سے کم ہائیڈروجن صحت کے لیے فائدہ مند ہے۔

روغنی ترشوں کے لحاظ سے چکنائی کی اقسام

چکنائی میں موجود روغنی ترشوں (fatty acids) کو بنیاد بنا کر بھی غذا کی چکنائی کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ غذائی چکنائی مختلف روغنی ترشوں کا مرکب ہوتی ہے۔ نباتی ناسیر شدہ ترشوں کو ہائیڈروجن آمیزی (hydrogenation) کے ذریعہ سیر شدہ بنایا جاتا ہے تو ٹرانس روغنی ترشے وجود میں آجاتے ہیں۔ روغنی ترشوں کے لحاظ سے غذائی چکنائی کی چار اقسام ہیں۔

سیر شدہ چکنائی (saturated fats) اس چکنائی میں موجود روغنی ترشوں کی اکثریت سیر شدہ ہوتی ہے۔ حیوانی ذرائع سے حاصل ہونے والی چکنائی زیادہ تر سیر شدہ ہوتی ہے۔ دودھ اور دودھ سے بنی اشیاء جیسے مکھن گھی، پنیر گوشت مرغی انڈے میں سیر شدہ چکنائی پائی جاتی ہے۔ سیر شدہ چکنائی سے خون میں کولیسٹرال میں اضافہ جو دل کے امراض کا ایک اہم سبب ہے۔

ناسیر شدہ چکنائی (unsaturated fats)

نباتی ذرائع سے حاصل ہونے والی چکنائی زیادہ تر ناسیر شدہ ہوتی ہے۔ اس چکنائی کے سالمہ میں کم ہائیڈروجن ہوتے ہیں۔ جو انسانی صحت کے لیے فائدہ مند ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ چکنائی خون میں کولیسٹرال کم کرتی ہے۔ ناسیر شدہ چکنائی کی دو اقسام ایک ناسیر شدہ اور کثیر ناسیر شدہ ہوتی ہیں۔

یک ناسیر شدہ چکنائی (monounsaturated fats) زیتون، مونگ پھلی، سرسوں اور canola تیل یک سیر شدہ چکنائیاں ہیں خشک میوؤں میں بھی اس قسم کی چکنائی پائی جاتی ہے۔ جو صحت بخش چکنائی ہے۔

یہ چکنائی خون کولیسٹرال میں کمی کا باعث بنتی ہے۔ آج کل بائیوٹکنالوجی bio technology کی مدد سے ایسے تیل تیار کیے جا رہے ہیں جو (high olek) ہوں یعنی ایسی چکنائی جن میں اولیک ایسڈ (oleic acid) کی زیادہ مقدار ہو۔ پامولین تیل اور ہائی اولیک سورج مکھی اور کسم یا زعفران کا زب تیل اس کی

مثالیں ہیں۔

کثیر ناسیر شدہ چکنائی (polyunsatarated fats)

کثیر ناسیر شدہ چکنائی مائع (liquid) حالت میں ہوتی ہے۔ مائع حالت میں پائی جانے والی چکنائی کو تیل یعنی oil کہتے ہیں۔ پکوان کا تیل یا نباتی تیل میں کثیر ناسیر شدہ روغنی ترشوں کی زیادہ مقدار ہوتی ہے۔ کثیر ناسیر شدہ چکنائی کسم (safflower)،سورج مکھی (sunflower) مکئی corn سویا بین (soya bean) اور بنولہ یا روئی کے بیج (cotton seed) میں پایا جاتا ہے۔ یہ چکنائی خون کولیسٹرال میں کمی کرتی اور دل کے امراض کو روکنے میں معاون بنتی ہے۔ کثیر ناسیر شدہ چکنائی کی خامی یہ ہے کہ یہ جلد خراب ہوتی ہے۔ اور آکسیجن سے تعامل کر کے کینسر پیدا کرنے والے مادے پیدا کرتی ہے اس لیے کثیر ناسیر شدہ چکنائی کو محفوظ رکھنے کے لیے ان میں مانع تکسید مادے (anti oxidants) ملائے جاتے ہیں۔ کثیر ناسیر شدہ چکنائی کے بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ اومیگا۳ چکنائی اور اومیگا٦ چکنائی ۔

اومیگا۳ چکنائی (omega 3 fats)

اومیگا۳ چکنائی دوسرے چکنائی کے بہ نسبت صحت کے لیے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس چکنائی کو دل کے امراض روکنے اور بلڈ پریشر کم کرنے میں اور اچانک موت کو ٹالنے میں معاون پائی گئی ہے۔ اومیگا۳ چکنائی سے LDL بُرے کولیسڑال میں کمی ہوتی اور HDL کولیسٹرال یعنی اچھے میں اضافہ ہوتا ہے۔

اومیگا۳ چکنائی مچھلی بالخصوص چربی دار ٹھنڈے پانی میں رہنے والی سامن (salmaon)، خار ماہی ہیرنگ (hearing) اسقمری (mackerel) سارڈین (sardines) نامی مچھلیوں میں اور روئی کے بیج (seedsCotton) السی کا تیل (flaseed oil) میں وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔

اومیگا٦ چکنائی (omega 6 fats)

اومیگا ٦ چکنائی نباتی تیل جیسے مکئی سویا بین اور بیشتر خشک میووٗں میں زیادہ مقدار میں ہوتی ہے۔غذا کے ذریعہ بھی اومیگا ٦ کی وافر مقدار مل جاتی ہے۔اس سے برا کولیسڑال کم ہوتا ہے۔ساتھ ہی اچھے کولیسٹرال میں معمولی سی کمی ہوتی ہے۔

ٹرانس چکنائی(trans fats)

ٹرانس روغنی ترشے قدرتی طور پر بہت ہی کم پائے جاتے ہیں جب مائع شکل تیل کوٹھوس شکل کی چکنائی یا چربی میں تبدیل کیا جاتا ہےتو ٹرانس چکنائی وجود میں آتی ہے۔کیمیائی عمل کے ذریعہ ناسیر شدہ چکنائی میں ہائیڈروجن شامل کیا جاتا ہے۔اس عمل کو Hydrogenation یعنی ہائڈروجن آمیزی کہتے ہیں۔جس سے مصنوعی مکھن مارجرین (margarine) اور وناسپتی گھی ،شارٹنگ (shartening) نامی چکنائی تیار کی جاتی ہیں۔اس قسم کی چکنائی کو hydrogenated fats بھی کہا جاتا ہے۔اس چکنائی کا استعمال بیکری اور فاسٹ فوڈ انڈسٹری میں عام ہے۔ٹرانس چکنائی سیر شدہ چکنائی کی طرح خون کولیسٹرال کی مقدار بڑھانے کے علاوہ اچھے کولیسٹرال میں کمی کرتی ہے جس سے دل کے امراض ہونے کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے۔اس لیے ٹرانس چکنائی کو سیر شدہ چکنائی سے زیادہ نقصان دہ سمجھا جاتا ہے۔

جمنے اور نا جمنے والی چکنائی

چکنائیوں کی تقسیم اسطرح بھی کی جاتی ہے کہ وہ عام حالات میں رکھنے پر ٹھوس یا مائع شکل (solid or liquid state) میں رہتی ہیں۔سیر شدہ روغنی ترشے ٹھوس شکل میں ہوتے ہیں۔جبکہ نا سیر شدہ روغنی ترشے مائع شکل اختیار کرتی ہیں۔نا سیر شدہ روغنی ترشوں میں ہائیڈروجن آمیزی کے ذریعہ ٹھوس شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے۔جمنے والی چکنای صحت کے لیے نقصان دہ ہوتی اور نا جمنے والی چکنائی (liquid fats) صحت کے لیے بہتر ہوتی ہے۔

کولیسٹرال cholesterol

انسان اور جانوروں کے خلیوں اور خون میں عام چکنائی (ٹرائی گلیر ائیڈس) سے مختلف ایک الگ قسم کی چکنائی پائی جاتی ہے۔ جسے کولیسٹرال کہا جاتا ہے۔

جسم میں مختلف افعال کے لیے کولیسٹرال کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہمارے خلیوں کی جھلی (cell membranus) کا حصہ ہے۔اس سے چند اہم ہارمون اور صفرا(bile salts) تیار کیے جاتے ہیں۔ کولیسٹرال صرف حیوانی غذاؤں(animal foods) میں پایا جاتا ہے۔نباتی غذاؤں میں کولیسٹرال نہیں ہوتا۔ عام طور پر دو قسم کے کولیسٹرال ہوتے ہیں۔ برا کولیسٹرال (LDL) جو خون کی شریانوں میں (alherosclerosis) نامی خرابی کا باعث بنتا ہے۔جس سے خون کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔اچھا کولیسٹرال (HDL) شریانوں میں جمع کولیسٹرال کو ہٹا کر رکاوٹ دور کرنے میں معاون ہے یہ ہماری صحت خصوصاً دل کے لیے فائدہ مند ہے۔مختلف اقسام کی چکنائیوں کا تفصیلی ذکر آگے کیا جارہا ہے۔

سیر شدہ چکنائیاں (کم صحت مند) نقصاندہ(Saturated Fats)

سیر شدہ چکنائیوں میں سیر شدہ روغنی ترشوں کی بہتات ہوتی ہے۔ یہ چکنائی زیادہ تر حیوانی ذرائع سے حاصل ہوتی ہے۔ نباتی ذرائع میں کھوپرے، تاڑ(palm) اور کوکو (coco) سے حاصل ہونے والی چکنائیاں ہیں سیر شدہ روغنی ترشوں کا زیادہ استعمال خون کولیسٹرول میں اضافہ کرتا ہے۔اس لیے سیر شدہ چکنائیوں کا استعمال کم کرنا چاہیے۔

مسکہ butter

مسکہ سیر شدہ چکنائی ہے جسے دودھ سے حاصل کیا جاتا ہے۔مسکہ حیوانی چکنائی ہے اس میں کولیسٹرال پایا جاتا ہے۔مسکہ میں ٦٦ فیصد سیر شدہ ٣٢ فیصد یک ناسیر شدہ اور صرف ٢ فیصد کثیر ناسیر شدہ روغنی ترشے پائے جاتے ہیں۔

گھی ghee

مسکہ کو گرم کر کے گھی بنایا جاتا ہے۔اس لیے گھی کو (clairified butter) بھی کہا جاتا ہے۔گھی ترکیب (composition) تقریباً مسکہ جیسی ہوتی ہے لیکن اس میں مسکہ کے برخلاف رطوبت (moisture) کم ہوتی ہے۔رطوبت کم ہونے سے گھی کو مسکہ سے زیادہ عرصہ تک رکھا جا سکتا ہے۔گھی میں بھی کولیسٹرال موجود ہوتا ہے۔

کھوپرے کا تیل coconut oil

کھوپرے یا ناریل سے نکالا گیا تیل ہے جس کا استعمال جنوبی ہندوستان، انڈونیشیا اور فلپین میں ہوتا ہے۔کھوپرے کا تیل تلنے اور غذائی اشیا پر ڈالنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ دوسرے نباتی تیلوں کے مقابلے میں سیر شدہ روغنی ترشوں کی زیادہ مقدار پائی جاتی ہے۔

اور اس کا شمار سیر شدہ چکنائی میں ہوتا ہے۔اس میں ۹۲ فیصد سیر شدہ اور صرف ۶ فیصد یک ناسیر شدہ اور ۲ فیصد کثیر ناسیر شدہ روغنی ترشوں پر مشتمل ہوتی ہے۔سیر شدہ روغنی ترشوں کی بہت زیادہ مقدار میں موجودگی کے سبب کھوپرے کا تیل عام درجہ حرارت پر ٹھوس شکل میں رہتا ہے۔لیکن دوسرے نباتی تیلوں کی طرح کھوپرے کے تیل میں کولیسٹرال نہیں پایا جاتا ہے۔

پام تیل palm oil

تاڑ کے پھلوں کے گودے سے پام تیل کشید کیا جاتا ہے۔اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ پیدا اور استعمال کیا جانے والا پام تیل ہے۔اس میں ۵۲ فیصد سیر شدہ، ۳۸ فیصد یک ناسر شدہ اور ۱۰ فیصد کثیر ناسیر شدہ روغنی ہوتے ہیں پام تیل میں سیر شدہ روغنی ترشوں کی افراط سے عام حالات میں ٹھوس یا نیم ٹھوس شکل میں ہوتا ہے۔کھوپرے کی طرح اس میں بھی کولیسٹرول نہیں پایا جاتا ہے۔ پام تیل کو مصفا (refine) کیا گیا تیل کو پاملین تیل کہتے ہیں۔اس طرح پام تیل گٹھل تیل یعنی تاڑ کے پھلوں کی گٹھلیوں سے کشید کیا گیا تیل کو پام گٹھلی

تیل یعنی kerne palm کہتے ہیں۔ پام گٹھلی تیل کا استعمال مارجرین بناتے اور کاسمیٹکس کی تیاری میں کیا جاتا ہے۔

کوکو چکنائی coco butter

اس چکنائی کو (cheobroma oil) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ہلکے زرد رنگ کی چکنائی ہوتی ہے۔ جسے کوکو کے بیجوں سے کشید کیا جاتا ہے۔ اس چکنائی کا استعمال چاکلیٹ بسکٹ و دیگر بیکری اشیا اور دوسرے مرکبات بنانے میں ہوتا ہے۔ چاکلیٹ میں بنیادی چکنائی ہی کوکو چکنائی ہوتی ہے۔ روم ٹیمپریچر پر کوکو چکنا ٹھوس شکل میں ہوتی ہے اور منہ میں رکھنے پر پگھل جاتی ہے۔ اس میں ۶۱ فیصد سیر شدہ، ۳۶ فیصد یک ناسیر شدہ اور ۳ فیصد کثیر ناسیر شدہ ترشے ہوتے ہیں۔

یک ناسیر شدہ چکنائیاں

ناسیر شدہ روغنی ترشے دو قسم کے یعنی یک monoاور کثیر poly ناسیر شدہ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ناسیر شدہ چکنائی میں دو قسم یعنی یک ناسیر شدہ چکنائی اور کثیر ناسیر شدہ چکنائی ہوتی ہے۔ یک ناسیر شدہ روغنی ترشے زیتون، سرسوں، مونگ پھلی، چاول کے بھوسے اور تل کا تیل میں خاطر خواہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔

زیتون کا تیل olive oil

زیتون کا پھل بیضوی شکل کا چھوٹا، بڑے انگور کی جسامت جتنا، گٹھلی دار میوہ ہے۔ زیتون کا تیل یک ناسیر شدہ چکنائی ہے اس تیل میں دوسرے تیلوں سے زیادہ ۷۳ فیصد یک ناسیر شدہ روغنی ترشے ہوتے ہیں۔ ۱۳ فیصد کثیر ناسیر شدہ اور ۱۴ فیصد سیر شدہ روغنی ترشے ہوتے ہیں۔ اس تیل میں چند نباتی مقویات بھی پائے جاتے ہیں جن میں anti -oxidantsاور polyphenole, flavinnts نامی مادے اور وٹامن ای اور کے (vitamin e&k) بھی پائے جاتے ہیں۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ کیمیائی مادے

بڑھاپے کے عمل (aging) کو روکنے، کینسر سے بچانے اور کولیسٹرال کی زیادتی کے سبب ہونے والی خون میں رکاوٹ پیدا کرنے والے عوامل کے خلاف کام کرتے ہیں۔ دوسرے نباتاتی روغن (vegetable fats) کی طرح زیتون کے تیل میں کولیسٹرال نہیں پایا جاتا ہے۔

سرسوں کا تیل mustard oil

زیتون کے تیل کے بعد سرسوں کے تیل میں زیادہ یک ناسیر شدہ روغنی ترشے پائے جاتے ہیں۔ سرسوں کا تیل ۶۲ فیصد یک ناسیر شدہ، ۳۲ فیصد کثیر ناشیر شدہ اور صرف ۶ فیصد سیر شدہ روغنی ترشوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ تیل اپنی مخصوص مہک اور ذائقے کی بدولت پسند کیا جاتا اور مشہور بھی ہے۔

مونگ پھلی کا تیل peanut or groundnut oil

مونگ پھلی تیل کا شمار یک ناسیر شدہ چکنائی میں ہوتا ہے۔ اس میں ۴۹ فیصد یک ناسیر شدہ، ۳۳ فیصد کثیر ناسیر شدہ اور ۱۸ فیصد سیر شدہ روغنی ترشے ہوتے ہیں۔ یک ناسیر شدہ روغنی ترشوں کی بہتات کے سبب مونگ پھلی تیل کا شمار صحت مند چکنائی میں ہوتا ہے۔ مونگ پھلی میں خون کولیسٹرال کم کرنے اور اچھا کولیسٹرال میں اضافہ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

چاول کے بھوسے کا تیل Rice Bran Oil

چاول کے چھلکے کو گرنی میں چاول سے علحیدہ کیا جاتا ہے اور دانے پر سے بھوسہ اتارا جاتا ہے۔ جس کو پالش کرنا کہتے ہیں۔ علحیدہ کردہ بھوسے سے تیل نکالا جاتا ہے۔ اس تیل کو چاول کے بھوسے کا تیل کہا جاتا ہے۔ اس میں ۴۷ فیصد یک ناسیر شدہ ۳۳ فیصد کثیر ناسیر شدہ اور ۲۰ فیصد سیر شدہ روغنی ترشے ہوتے ہیں۔ چاول کے بھوسے کے تیل میں oryzamol نامی ایک مادہ پایا جاتا ہے۔ جس کے بارے خیال کیا جارہا ہے یہ خون کولیسٹرول کم کرتا ہے۔

تل کا تیل sesame oil

تل کا تیل دنیا کے قدیم تیلوں میں سے ایک ہے۔ یہ نسبتاً مہنگا تیل ہے۔اس لیے اس کا استعمال عام نہیں ہے۔

کثیر نا سیر شدہ چکنائی (polyunsaturated fats) (فائدہ مند)

کثیر نا سیر شدہ روغنی ترشوں کی بہتات ہوتی ہے۔اس بنا پر چکنائیاں کثیر نا سیر شدہ چکنائی کہلائی جاتی ہے۔ جو صحت کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔

کسم ،زعفران کا ذب تیل (safflower oil)

سورج مکھی خاندان سے تعلق رکھنے والے کسم یا زعفران کا ذب پودے کے پھولوں کے بیجوں سے نکالے گئے تیل کو کسم تیل یا کرڈی تیل کہا جاتا ہے۔ یہ ہلکے زرد رنگ بے ذائقہ اور بے مہک تیل ہے۔اس میں دوسرے تیلوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ کثیر نا سیر شدہ روغنی ترشے پائے جاتے ہیں۔اس تیل میں ۷۷ فیصد کثیر نا سیر شدہ،۱۳ فیصد یک نا سیر شدہ ۱۰ فیصد سیر شدہ روغنی ترشے پائے جاتے ہیں اس بنا پر کسم تیل کا استعمال ہر قسم کے پکوان میں ہوتا ہے۔

انگور کے بیج کا تیل grapeseed oil

انگور کے بیجوں سے بھی تیل نکالا جاتا ہے۔ جو بے ذائقہ اور بے رنگ و بو ہوتا ہے۔ اس میں اس تیل کو دوسرے مہنگے مہک دار تیلوں میں ملایا جاتا ہے۔اس میں ۷۱ فیصد کثیر نا سیر شدہ ۱۷ فیصد یک نا سیر شدہ اور ۱۲ فیصد سیر شدہ روغنی ترشے ہوتے ہیں۔

سورج مکھی کا تیل sunflower oil

سورج مکھی کے پھلوں کے بیجوں سے کشید کیا جاتا ہے۔ ہلکے زرد رنگ کا اور ہلکی مخصوص بو رکھنے والا تیل ہے۔ یہ تیل ۶۹ فیصد کثیر نا سیر شدہ ۲۰ فیصد یک نا سیر شدہ اور ۱۱ فیصد سیر شدہ روغنی ترشوں پر مشتمل ہے۔اسکو

محفوظ رکھنے کے لیے اس میں مانع تکسید حیاتین ای (vitamin E) ملایا جاتا ہے۔ یہ پکوان میں استعمال ہونے والا عام اور مقبول تیل ہے۔

مکئی کا تیل corn oil

یہ مکئی کے دانوں سے نکالا گیا ہلکے سنہری رنگ کا بے مزا اور بے بو تیل ہوتا ہے۔اس کا استعمال امریکہ میں عام ہے۔اس میں ۶۲ فیصد کثیر ناسیر شدہ، ۲۵ فیصد یک ناسیر شدہ اور ۱۳ فیصد سیر شدہ روغنی ترشے ہوتے ہیں۔

سویابین تیل Soyabeen

سویابین سے حاصل کیا ہوا تیل ہے۔ جو کثیر ناسیر شدہ چکنائی ہے۔اس کا استعمال پکوان اور تلن کے علاوہ غذائی صنعت میں بے شمار اشیاء تیار کی جاتی ہیں۔اور ہائیڈروجن آمیزی سے مختلف چکنائی تیار کی جاتی ہیں۔ اس تیل میں ۶۱ فیصد کثیر ناسیر شدہ ۲۴ فیصد یک ناسیر شدہ اور ۱۵ فیصد سیر شدہ روغنی ترشوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

بنولہ یا روئی کے بیج کا تیل (cotton seed oil)

یہ بنولہ یعنی روئی کے بیجوں سے نکالا گیا ہلکے زرد یا صاف رنگ کا تیل ہوتا ہے۔ بنولہ تیل کو قدرتی طور پر hydrogenated تیل کہا جاتا ہے کہ اس میں oleic palmittc اور stearic روغنی ترشے پائے جاتے ہیں۔ان کی موجودگی سے بنولہ تیل کے لیے بہت مناسب تیل ہے۔اس میں ۵۰ فیصد کثیر ناسیر شدہ، ۲۱ فیصد یک ناسیر شدہ اور ۲۴ فیصد سیر شدہ روغنی ترشے ہوتے ہیں۔

ہائیڈروجن آمیز چکنائیاں (hydrogenated or trans fats

مختلف نباتی تیل (vegetable oils) یا نباتی تیلوں کے مرکب میں ہائیڈروجن کے اضافے سے تیار کی جانے والی چکنائی کو ہائیڈروجن آمیز چکنائی یعنی hydrogenated fats کہتے ہیں۔

پہلی مرتبہ ۱۸۹۰ء میں ایک فرانسیسی کیمیاءدان پال سباٹائر (paul sebatier) نے ہائیڈروجن آمیز

(hydrogenatien) کا طریقہ دریافت کیا تھا لیکن اسکو فروغ اور مقبولیت دوسری جنگ عظیم کے دوران حاصل ہوئی جب قدرتی مسکہ کی قلت اور راشننگ کے سبب ہائیڈروجن آمیزی سے تیار کیا ہوا مارجرین(margarine)مصنوعی مکھن فراہم کیا جانے لگا۔

ہائیڈروجن آمیزی میں ایک catalyst عموماًnickel(نکل) کی موجودگی میں ہائیڈروجن کو نباتی تیل یا تیلوں کے مرکب میں ایک دباؤ سے گزارا جاتا ہے۔اس عمل سے ناسیر شدہ تیل کے دہرے بند ہائیڈروجن قبول کر کے سیر شدہ حالت اختیار کرتے ہیں ۔ ہائیڈروجن آمیزی سے مائع چکنائی ٹھوس شکل اختیار کرتی ہے۔دلکش سفید رنگ ابھر آتا ہے۔چکنائی کو استحکام ملتا ہے۔وہ زیادہ stable ہوتی ہیں۔باسیر شدہ چکنائیاں کم stable ہوتی ہیں۔اور وہ آکسیجن سے تعامل کر کے جلد خراب ہوتی ہیں۔لیکن ہائیڈروجن آمیزی تکسیدی عمل کو عرصہ تک روکتی ہے۔اسی لیے ہائیڈروجن آمیزی چکنائی سے بنی اشیاء کو زیادہ عرصہ رکھا جاتا ہے۔لیکن اس سے نقصان دہ ٹرانس روغنی ترشے بنتے ہیں۔

وناسپتی vegetable ghee

تیلوں میں مکمل ہائیڈروجن آمیزی سے تیار کی جانے والی سفید رنگ کی ٹھوس چکنائی کو مصنوعی گھی کہا جاتا ہے۔ایسے گھی کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔اسے ہندوستان میں وناسپتی گھی کے نام سے مونگ پھلی سے بنایا جاتا ہے۔اس میں وٹامن اے ملانے کا لزوم ہے۔

مارجرین margarine

دوسری جنگ عظیم کے دوران مکھن یا مسکہ کی شدید قلت سے نمٹنے کے لیے مارجرین یا مصنوعی مکھن یا مصنوعی مسکہ تیار کیا گیا تھا تب سے لوگ مارجرین استعمال کرنے لگے ہیں۔ مارجرین کو نباتی تیلوں میں ہائیڈروجن آمیزی کے عمل سے تیار کیا جاتا ہے۔مارجرین میں پانی دودھ، دودھ سے بنی اشیاء، پروٹین نمک اور مسالے ملائے جاتے ہیں اور حیاتین اے اور ڈی کا اضافہ بھی کیا جاتا ہے۔مارجرین میں سیر شدہ چکنائی

کی کم مقدار ہوتی ہے۔اور کولیسٹرول بالکل نہیں ہوتا کم توانائی بھی ملتی ہے۔لیکن ہائیڈروجن آمیزی کے سبب اس میں ٹرانس روغنی ترشے بنتے ہیں۔جو قدرتی روغنی ترشوں سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔

شارٹننگ shortening

شارٹننگ کو plastic fats بھی کہا جاتا ہے۔اس کی تیاری میں emalsifiers مائع تکسید مادے اور دوسرے اجزا کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ شارٹ (short) سے مراد غذائی اشیاء کو خستہ بنانے کی خاصیت ہے اور غذائی اشیا کو خستہ بنانے کے لیے استعمال ہونے والی چکنائی کو شارٹنگ کہا جاتا ہے۔ مافی میں جانوروں کی چربی کا استعمال ہوتا تھا۔لیکن اب نباتی تیلوں سے بنائی گئی شارٹننگ کا استعمال عام ہے۔

مایونیز mayonnaise

مایونیز سلاد اور دوسری غذائی اشیاء پر ڈال کر کھانے والی چٹنی ہے۔ جو انڈے کی زردی، نباتی تیلوں اور مسالوں سے تیار کی جاتی ہے۔ یہ فرانس کی ڈش ہے۔اس میں ۳۰ سے ۶۵ فیصد تک چکنائی ہوتی ہے۔

سلاد ڈریسنگ salad dressings

سلاد ڈریسنگ میں چکنائی emulsiform میں ہوتی ہے۔یعنی چکنائی کے بہت چھوٹے چھوٹے زرات پانی میں بکھرے ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ چکنائی نباتی تیل ہوتی ہے۔جس میں جزوی ہائیڈروجن آمیزی کی جاتی ہے۔ چکنائی کے علاوہ انڈے کی زردی، نمک، مسالے، سرکہ اور نشاستہ کو بھی سلاد ڈریسنگ میں استعمال کیا جاتا ہے۔

ہمیں اضافی چکنائی کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر ہم اپنی غذا میں اضافی چکنائی (added fats) بشکل تیل یا گھی استعمال نہ کریں بھی تو ہمیں غذا سے دس سے پندرہ فیصد حرارے غیر مرئی چکنائی (invisible fats) سے مل جاتے ہیں۔ بہت سی غذائی اشیاء میں قدرتی طور پر چکنائی پائی جاتی ہے۔ جیسے گوشت دودھ دالوں اور اجناس میں چکنائی کی قابل لحاظ

مقدار ہوتی ہے۔

یہ مشاہدہ دلچسپ ہے کہ انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو غذا میں اضافی چکنائی استعمال کرتی ہے۔ جبکہ عالم حیوانات (animal kingdom) کا کوئی دوسرا جانور اپنی غذا میں علیحدہ سے چکنائی استعمال نہیں کرتا صرف چکنائی، شکر اور نمک استعمال کرنے کا خمیازہ انسانوں کو کئی امراض جیسے ذیابیطس، ہائی بلڈ پریشر، دل کے امراض وغیرہ کی شکل میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔

زیادہ چکنائی کا حصول نقصان دہ ہے

یہ بات ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہماری غذا میں چکنائی کا حصول زیادہ ہو رہا ہے۔ زیادہ چکنائی کا حصول عموماً مرئی چکنائی (دکھائی دینے والی چکنائی visible fats) کی شکل میں مختلف تحقیق سروے اور چربی اور تیلوں کی کھپت سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ماضی کی بہ نسبت اب ہم زیادہ چکنائی استعمال کرنے لگے ہیں۔ صرف چکنائی ہی نہیں ماضی کے مقابلے میں شکر اور سادہ کاربوہائیڈریٹس کا حصول بھی اب زیادہ ہو رہا ہے۔ لحمیات کے حصول میں بھی معمولی اضافہ ہوا ہے۔ چکنائی اور سادہ کاربوہائیڈریٹس کے زیادہ استعمال کے ساتھ نشاستہ (stareces) یعنی پیچیدہ کاربوہائیڈریٹس کے حصول میں تقریباً ۵۰ فیصد کمی دیکھی گئی ہے۔ مختلف سروے مطالعوں اور تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ زیادہ چکنائی کا استعمال نقصان دہ ہوتا ہے۔ غذا میں چکنائی کے زیادہ استعمال کو موٹاپا۔ قسم ذیابیطس۔ دل کے امراض چند کینسر اہم سبب بتایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ چکنائی کے کئی نقصانات ہیں جیسے (ا) غذا میں سیر شدہ چکنائی اور ٹرانس چکنائی کی زیادتی سے خون کولیسٹرال میں اضافہ ہوتا ہے۔ خون کولیسٹرال میں اضافے سے اہم اعضاء کی شریانوں میں چکنائی اور دوسرے مادے جمع ہوتے ہیں۔ جس سے دوران خون متاثر ہوتا ہے۔ اس عمل کو صلابت شریان یعنی alherosclerosis کہتے ہیں صلابیت شریاں کے سبب دل کا کام متاثر ہوتا ہے۔ اور فالج کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

۲) خون میں چکنائی کولیسٹرال کے اضافے سے مرارہ یا پتے (Gall.Bladdes) کے امراض لاحق ہوتے ہیں۔ پتے میں سوزش ہوتی ہے اور کولیسٹرال جمع ہوکر پتھری (gall stones) بن سکتا ہے۔

۳) زیادہ چکنائی سے جگر متاثر ہوتا ہے۔ جگر میں چکنائی جمع ہونے کی حالت کو fatty liver کہتے ہیں۔ اگر خاطر خواہ توجہ نہ کی گئی تو یہ حالت cirrhosis میں تبدیل ہوتی ہے۔ جگر کا فعل متاثر ہوتا ہے اور پھر وہ وقت بھی آتا ہے۔ جب جگر کام کرنا بند کر دیتا ہے۔

۴) چکنائی کے زیادہ استعمال سے چند قسم کے کینسر جیسے چھاتی کا کینسر (breast canser) بڑی آنت کا کینسر (colon cancer) سے متاثر ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

۵) چکنائی کے زیادہ استعمال اور موٹاپے کے سبب بلڈ پریشر میں اضافہ دیکھا گیا ہے۔ جب زائد جسمانی وزن کم کیا جاتا ہے تو بلڈ پریشر بھی کم ہوتا ہے۔

۶) چکنائی کی زیادتی سے چند تحولی عارضے (metabolic abnermalities) لاحق ہوتے ہیں۔ انولیسن مدافعت (insulin resistance) بڑھتی ہے خون میں یورک ایسڈ (uric acid) کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے اور مرض گٹھیا (gout) ہوسکتا ہے۔

چکنائی برداشت کرنے کی صلاحیت

عام طور پر جسم میں چکنائی اچھی طرح ہضم اور جذب ہوتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک دن میں انسانی جسم ۳۰۰ گرام تک چکنائی ہضم اور جذب کر سکتا ہے۔ عام طور پر ہماری غذا میں ۵۰ سے ۱۰۰ گرام تک چکنائی ہوتی ہے۔ بہت کم لوگوں میں زیادہ چکنائی ہضم کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں میں چکنائی کھانے سے ہضمی نظام میں مختلف شکایات جیسے اپھارہ، گیس، اجابتیں وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔

غذائی چکنائی سفارشی مقدار

ہمیں اندازہ ہونا چاہیے کہ یومیہ کتنی چکنائی کی ضرورت ہے۔ ہماری غذا میں کاربوہائیڈریٹس

(carbohydrates) لحمیات (proteins) اور چکنائی توانائی Fats فراہم کرتے ہیں۔ ماہرین کے مطاق ہماری غذا میں توانائی کا ۵۰ سے ۶۰ فیصدی حصہ کاربوہائیڈریٹس یا شکریات سے آنا چاہئے ۔لحمیات کا حصہ ۱۲ سے ۲۰ فیصد ہونا چاہیے اور چکنائی یا روغنیات سے ۳۰ فیصد سے کم ہونا چاہیے۔

غذائی چکنائی کی یومیہ سفارشی مقدار

صحت کی برقراری کے لیے ہمیں ہر دن ایک مناسب مقدار میں چکنائی کی ضرورت پڑتی ہے۔توانائی دینے کے علاوہ چکنائی ہمیں ضروری یا لازمی روغنی ترشے اور روغن میں حل پذیر حیاتین (vitamin, A D E S K) فراہم کرتی ہے جو جسم کی بہتر کارکردگی اور صحت کے لیے درکار ہیں مختلف تحقیق اور سروے سے پتہ چلا ہے کہ اگر یومیہ درکار توانائی کا ۱۵ فیصد حصہ چکنائی سے ملتا ہے۔تو چکنائی کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے۔یعنی اتنی مقدار میں چکنائی سے ہمیں ضروری روغنی ترشے اور چکنائی میں حل پذیر وٹامنز مہیا ہو جاتے ہیں۔ ماہرین چکنائی کی آخری حد (upper limit) ۳۰ فیصدی یومیہ مقدار مقرر کیا ہے۔اور چکنائی کی مقدار کو مختلف اقسام میں اسطرح تقسیم کیا ہے۔ سیر شدہ چکنائی ۱۰ فیصد سے کم مقدار ہونی چاہیے اس میں ٹرانس روغنی ترشوں کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ یہ صحت کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔

غذا اور تغذیہ

ڈاکٹر عابد معز کے مطابق ہما ی غذا مختلف اشیاء پر مشتمل ہوتی ہے۔غذائی اشیاء کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے تاکہ ہماری صحت نہ صرف برقرارر ہے بلکہ ہم بیماریوں سے بھی محفوظ رہیں۔زمانہ قدیم سے ہماری غذاؤں میں ترکاری اور پھل شامل رہے ہیں۔ترکاری اور میوہ یا پھل حیاتین (Vitamins) اور معدنیات (Minerals) سے بھر پور ہوتے ہیں یہ دونوں جسم میں اہم فرائض انجام دیتے ہیں جیسے بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت میں اضافہ کرتے ہیں اور ان میں چکنائی یا چربی اور کولیسٹرال نہیں ہوتا کیونکہ ترکاری اور پھل نباتاتی غذا ہیں ۔ اسی لیے ترکاریوں اور میوؤں کو مدافعتی غذا کہتے ہیں:

> ''ترکاریوں اور میوؤں میں کئی کیمیائی مادے پائے جاتے ہیں جنہیں Phytochemicals کہا جاتا ہے۔ان مادوں کی جسمانی ضرورت اور افعال واضح نہیں ہیں۔لیکن یہ طے ہے کہ وہ ہماری صحت کی برقراری میں معاون ہیں۔ چند Phytochenmcals مانع تکسید مادوں Antioxidants کے طور پر کام کرتے ہیں۔جسم میں استعمال عمل Metabolic Process کے دوران نقصان دہ مادے Free Radicals وجود میں آتے ہیں۔مانع تکسید مادے محفوظ طریقے سے Free Radicals کو جسم سے باہر نکالتے ہیں۔رنگین پھلوں اور ترکاریوں میں مانع تکسید مادّوں اور دوسرے Phytochenmicals کی وافر مقدار پائی جاتی ہے۔ترکاریوں اور پھلوں کا رنگ ان ہی Phytochemicals کے سبب

ہے۔..........ترکاریوں اور پھلوں کے زائد استعمال سے دل کے امراض جیسے
ہارٹ اٹیک اور فالج Stroke میں کمی دیکھی گئی ہے۔ چودہ برسوں تک جاری
ایک اسٹڈی سے معلوم ہوا کہ ترکاری اور پھل زیادہ نوش کرنے والے اشخاص
دل کے امراض اور فالج سے کم متاثر ہوئے ہیں۔ترکاری اور میوہ کھانے والوں
میں بلڈ پریشر بھی کم دیکھا گیا ہے۔ان کے خون کولیسٹرال میں بھی کمی دیکھی گئی
ہے۔اسی لیے زیادہ خون کولیسٹرال رکھنے والوں کو ترکاریوں اور پھلوں کی زیادہ
مقدار کھانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ترکاریوں اور پھلوں کے استعمال سے چند
اقسام کے کینسر میں کمی دیکھی گئی ہے۔ہضمی نظام کے کینسر جیسے معدہ اور بڑی
آنت Colon کے کینسر کی شرح ان لوگوں میں زیادہ پائی گئی جو ترکاری اور پھل
کم کھاتے تھے''۔[1]

غذا کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہر عمر میں ہماری پہلی اور سب سے اہم ضرورت غذا ہے۔ ہم اپنی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہردم سرگرداں رہتے ہیں۔انسانی زندگی کا دارومدار جسم کے مختلف عضوی نظام کی کارکردگی پر ہے۔جسم کے مختلف نظام،اعضاء جیسے دل کا حرکت کرنا،دوران خون،نظام تنفس، نظام ہضمی وغیرہ کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے توانائی چاہیے۔ ہماری غذا مختلف اشیاء خورد ونوش پر مشتمل ہوتی ہے۔جیسے دودھ،پھل،اناج،ترکاری،گوشت مشروبات وغیرہ جب ہم ان اشیاء کو کھاتے ہیں تو یہ اشیاء معدہ اور آنتوں میں ہضم ہو کر مختلف کیمیائی مادوں میں تبدیل ہوتی ہیں۔ ان کیمیائی مادوں کو مقویات Nutrients کہتے ہیں:

''ہماری غذا مختلف اشیائے خورد ونوش پر مشتمل ہوتی ہے۔ دودھ،اناج، پھل ترکاری گوشت،مشروبات وغیرہ غذا کا حصہ بنتے ہیں۔غذائی اشیاء معدہ اور آنتوں میں ہضم ہو کر مختلف کیمیائی مادوں میں تبدیل ہوتی ہیں۔ان کیمیائی

---

[1] ترکاریوں اور پھلوں کی افادیت۔غذا اور تغذیہ۔(زیر طبع)

مادوں کو مقویات Nutrients کہتے ہیں ۔ ہمارے جسم کو لگ بھگ پچاس مقویات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر مقوی جسم میں ایک یا ایک سے زیادہ افعال انجام دیتا ہے۔ کسی ایک غذائی شئے میں تمام مقویات یکجا نہیں ملتے۔ مقویات مختلف غذائی اشیاء میں الگ الگ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے ہماری غذا مختلف اشیاء پر مشتمل ہونی چاہیے''۔ ؎۱

کاربوہائیڈریٹ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہمارے جسم کو درکار توانائی کا زیادہ تقریباً تین چوتھائی حصہ کاربوہائیڈریٹس فراہم کرتے ہیں۔ دماغ اور اعصابی نظام کو کام کرنے کے لیے صرف گلوکوز ہی درکار ہے۔ ہمارا جسم لحمیات سے بہت کم توانائی حاصل کرتا ہے۔ لحمیات کو دیگر اہم افعال جیسے جسم کی تعمیر نو (نمو) اور مرمت میں استعمال کے لیے ترجیح دی جاتی ہے۔ چکنائی توانائی کا مرتکز ذریعہ ہے اور جسم میں توانائی چربی کی شکل میں جمع کی جاتی ہے جسے نامساعد حالات میں استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ایک پیچیدہ عمل کے ذریعہ چکنائی سے توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس عمل میں کیٹون Ketone نامی مادہ بنتا ہے جس کی خون میں زیادہ مقدار نقصان دہ ہوتی ہے''۔

جدول ملاحظہ فرمائیں:

ایک گرام مقویات سے حاصل ہونے والی توانائی

مقوی	کیلوری	جول
کاربوہائیڈریٹس Carbohydrates	4	17
لحمیات Proteins	4	17
چکنائی Fats	9	37
الکحل Alcohol	7	29

؎۱ ۔ہمیں کتنی غذا چاہیے؟۔ غذا اور تغذیہ۔ زیر طبع

؎۲ غذا سے ہمیں توانائی ملتی ہے۔ جون 2006ء غذا اور تغذیہ۔ زیر طبع

جب ہم ضرورت سے زیادہ غذا حاصل کرتے ہیں تو جسم کو ملنے والی توانائی چربی کی شکل میں جمع ہونے لگتی ہے۔ چربی مخصوص خلیوں اور بافتوں میں جمع ہوتی ہے جنہیں شحمی خلیے Fat Cells اور شحمی بافتے Fatty Tissues کہتے ہیں۔

چربی توانائی Energy کا ذخیرہ ہے۔ یہ فاقے کے دوران جسم کو درکار توانائی فراہم کرتی ہے۔ ہمارے جسم میں چربی سے اتنی توانائی جمع رہتی ہے کہ جس سے ساٹھ (60) دن بغیر غذا کے زندہ رہ سکتے ہیں جسمانی چربی توانائی دینے کے علاوہ دیگر افعال بھی انجام دیتی ہیں، چربی کے دیگر افعال کے تعلق سے عابد معز لکھتے ہیں:

> ''چربی توانائی Energy کا ذخیرہ ہے۔ کھانے کے درمیان اور فاقے کے دوران جسم کو درکار توانائی چربی فراہم کرتی ہے، نامساعد حالات میں زندہ رہنے کے لیے توانائی چربی سے حاصل کی جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہمارے جسم میں اتنی توانائی جمع رہتی ہے جس سے ساٹھ دن بغیر غذا کے حاصل کئے رہا جا سکتا ہے۔ توانائی کا ذخیرہ ہونے کے علاوہ چربی چند دوسرے اہم فرائض بھی انجام یتی ہے۔ جلد کے نیچے چربی کی ایک تہہ موجود ہوتی ہے۔ یہ تہہ انسانی جسم کو انتہائی درجہ حرارت کے خلاف محفوظ رکھتی ہے۔ مختلف اعضاء کے اطراف چربی کا خول ہوتا ہے۔ جوان اعضاء کو مار اور صدمے سے محفوظ رکھتا ہے جلد کے نیچے چربی کی بدولت ہمارے جسم اور ہماری شکل کو ہمواری اور خوب صورتی عطا ہوتی ہے''۔ [1]

انسان کو زندہ رہنے کے لیے چربی بے حد ضروری ہے اس کے بغیر انسانی صحت متاثر ہوتی ہے چربی انسانی جسم کے مختلف حصوں میں ہوتی ہے جیسے گردے، جگر، دل، پھیپھڑے، ہڈیوں کے گودے آنتوں میں وغیرہ۔ مردوں اور عورتوں میں مختلف مقامات پر چربی جمع ہوتی ہے اس تعلق سے وہ لکھتے ہیں کہ:

---

[1] کیا آپ کی توند نمایاں ہو رہی ہے۔ غذا اور تغذیہ۔ زیر طبع

''ماہرین کے مطابق ہماری زندگی کے لیے چربی بے حد ضروری ہے جس کے بغیر صحت متاثر ہوسکتی ہے اور زندگی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔اس چربی کو ضروری چربی Essential fat کہا جاتا ہے۔ضروری چربی ہڈیوں کے گودے۔دل، پھیپھڑے، جگر طحال، گردے، آنتیں، اعصابی نظام اور عضلات میں پائی جاتی ہے۔ضروری چربی تقریباً چار سے سات فی صد جسمانی وزن ہوتی ہے۔اس ضروری چربی کے علاوہ عورتوں میں مزید چربی چھاتی Breast ، دھڑ کا نچلا حصہ Pelvic Region اور ران Thighs پر ہوتی ہے۔ عورتوں میں ان مقامات پر موجود چربی کو Sex Specific Fat کہتے ہیں ۔خیال کیا جاتا ہے کہ یہ چربی حمل اور دودھ پلانے کے دوران خرچ ہونے والی توانائی کا سہارا بنتی ہے اور زنانہ ہارمون کے زیر اثر جمع ہوتی ہے''۔ [1]

موٹاپا

زمانہ قدیم یا چند برس پہلے موٹاپے کو مرفع حالی، صحت مندی اور کامیابی کی نشانی سمجھا جاتا تھا لیکن آج سائنس دانوں نے موٹاپے کو مضر صحت قرار دیا ہے بلکہ اس کو ایک مرض تصور کرتے ہیں۔موٹاپا غذائی بے اعتدالیوں کے سبب ہونے والا مرض ہے:

زائد چربی موٹاپے کا سبب بنتی ہے جو کسی بھی وقت توند کی شکل اختیار کرسکتی ہے۔ڈاکٹر عابد معز مردانہ اور نسوانی موٹاپے کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شحم اندوزی کا دوسرا انداز مردانہ Android Type ہے چربی کمر Waist اور پیٹ Abdomen پر جمع ہوتی ہے۔ پیٹ اور کمر پر جمع زائد چربی کو عرف عام میں توند کہتے ہیں۔ یہ قسم مردوں میں عام ہے۔اس انداز کی شحم (شکم) اندوزی سے جسمانی ہیئت سیب Apple سے مشابہ ہوتی ہے۔اس

---

[1] ۔کیا آپ کی توند نمایاں ہورہی ہے۔غذا اور تغذیہ۔زیر طبع۔

قسم کے موٹاپا کو مردانہ قسم کا موٹاپا Android Type obesity، مرکزی موٹاپا Central Obesity، شکمی یا توندی موٹاپا Obesity Obdominal اور بدن کو سیب کے شکل Apple Shaped Body کا بدن کہتے ہیں۔ نسوانی یا زنانہ قسم Gynoid Type عورتوں میں عام ہے۔ اس قسم میں چربی بدن کے نچلے حصوں Phesic Region میں اور ران پر جمع ہوتی ہے۔ اس انداز کی شحم اندوزی سے جسمانی ہئیت ناشپاتی Pear سے مشابہہ ہوتی ہے۔ اس قسم کے موٹاپے کو نسوانی یا زنانہ قسم کا موٹاپا Obesity Gynoid Type اور بدن کو ناشپتی شکل کا بن Body pear shaped کہتے ہیں''۔ [1]

پیٹ اور کمر پر زائد جمع چربی کو عرف عام میں توند کہتے ہیں، اس کے بڑھنے سے نئی نئی اور خطرناک خطرناک بیماریاں جسم کو مسکن بنالیتی ہیں جیسے ذیابیطس، بلڈ پریشر، فالج وغیرہ ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ پیٹ اور کمر پر زائد چربی کے مضر اثرات پر وہ لکھتے ہیں:

''کمر بڑھنے کے ساتھ جسم میں گلوکوز کے تحول Metabolism میں بے اعتدالی شروع ہوتی ہے جسے Impaired Glucose Metabolism کہتے ہیں۔ انسولین مدافعت Resistance Insulin میں اضافہ ہوتا ہے اور آخر میں بڑی کمر رکھنے والا شخص ذیابیطس (قسم دو(۲) Type -2 کا شکار ہوجاتا ہے ماہرین کہتے ہیں کہ ذیابیطس کا تعلق عام موٹاپے سے زیادہ کمر کی چوڑائی سے ہے۔ چوڑی کمر رکھنے والوں میں بلڈ پریشر زیادہ ہوتا ہے اور دل اور شریانوں کے امراض Cardiovascular diseases جیسے دورۂ قلب انجینا فالج وغیرہ لاحق ہونے کے امکانات بڑھ

---

[1] ۔ کیا آپ کی توند نمایاں ہورہی ہے۔ غذا اور تغذیہ۔ زیر طبع۔

جاتے ہیں۔خون میں چکنائی کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے۔خون کولیسٹرال اور خون ٹرائی گلیرائڈس الگ الگ یا ایک ساتھ بڑھتے ہیں۔خون میں یورک ایسڈ Uric Acid نامی مادہ بھی بڑھنے لگتا ہے۔ ماہرین مروں میں 94 سنٹی میٹر (۳۷) انچ) اور خواتین میں ۸۰ سنٹی میٹر ۳۲ انچ سے کم کمر کے محیط کو مناسب یا طبعی قرار دیتے ہیں جو صحت کے لیے نسبتاً کم خطرہ ہے۔کمر کے محیط میں اضافہ سے صحت متاثر ہونے کے امکانات بھی بڑھنے لگتے ہیں۔ جب کمر مردوں میں ۱۰۲ سنٹی میٹر (۴۰ انچ) اور عورتوں میں ۸۸ سنٹی میٹر (۳۵ انچ) سے تجاوز کر جاتی ہے تو قسم دو ذیابیطس اور دل کے امراض سے متاثر ہونے کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں"۔ [1]

حیاتین (وٹامنز) (A) Vitamins

غذا کے بغیر زندگی کا وجود ممکن نہیں ہے۔ہمیں نہ صرف زندہ رہنے بلکہ صحت مند تندرست اور توانا رہنے کے لیے ہر روز غذا استعمال کرنی پڑتی ہے۔غذا جسم میں مختلف فرائض انجام دیتی ہے۔مختلف اعضاء کی کارکردگی کے لیے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔غذا کا مقصد بھوک مٹانے کے علاوہ جسم کو صحت مند اور تندرست رکھنا اور جسم کی نشو ونما بھی ہے۔ غذا چھ اجزاء (مقویات) پر مشتمل ہوتی ہے کاربوہائیڈریٹس Carbohydrates، لحمیات Proteins چکنائی، Fats حیاتین Vitamins اور پانی Water.

وٹامنز کیمیائی مرکبات ہوتے ہیں۔جنہیں ہمارا جسم غذا سے حاصل کرتا ہے۔ ہمارا جسم بہت سارے وٹامنز تیار نہیں کرسکتا اسی لیے ہمیں خارجی ذرائع سے وٹامنز کی ضرورت پوری کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے جسم کو پندرہ سے زیادہ وٹامنز درکار ہیں۔خارجی ذرائع سے وٹامنز کا استعمال دوصورتوں میں ضروری

---

[1] ۔ناپ تول کر صحت کا اندازہ کیجئے۔غذا اور تغذیہ۔زیرِ طبع

ہے پہلی صورت حیاتین کی کمی سے ہونے والے شکایات اور تکالیف کا ازالہ کرنے کے لیے اور حیاتین کی زائد مقدار کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی بلکہ چند وٹامنز کی زائد مقدار نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ طب کی دنیا میں لفظ وٹامن کے تعلق سے ڈاکٹر عابد معز اس طرح رقم طراز ہیں:

> 1912ء میں پولینڈ کے سائنس دان کیسی مرفنک Casimir Funk نے وٹامن کا لفظ استعمال کیا۔ اس کے بعد جب بھی کوئی نیا وٹامن دریافت ہوا تو اس کا نام انگریزی حروف تہجی پر رکھا گیا جیسے وٹامنس اے وٹامنس بی، وٹامن سی، وغیرہ۔ بعد میں جب کیمیائی طور پر وٹامن کو پہچانا گیا تو اس کا کیمیائی نام بھی رکھا گیا، جیسے ایسکوربک ایسڈ Ascorbic Acid ہے۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ وٹامن بی چند وٹامنز کا مجموعہ ہے۔ آج اس مجموعہ کو وٹامن بی کامپلکس Vitamin B Complex کہا جاتا ہے۔ آٹھ سے زیادہ وٹامنز کو بی کامپلکس گروپ میں شامل کیا جاتا ہے''۔ [1]

ہمارے جسم کو صحتمند رہنے کے لیے کئی قسم کے وٹامنز کی ضرورت ہوتی ہے جیسے BCDE وغیرہ۔ ہر وٹامن مختلف خصوصیات رکھتا ہے اور اس کا کیمیائی نام بھی الگ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عابد معز نے وٹامن A کی خصوصیات بتاتے ہوئے اس جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ کن کن ذرائع سے حاصل ہوتا ہے:

> وٹامن اے کا کیمیائی نام Refinol ہے۔ یہ ایک قسم کا الکحل Alcohol ہے۔ ایٹی نال حیاتیاتی غذا میں پایا جاتا ہے۔ جگر، انڈے کی زردی، مسکہ، دودھ اور مچھلی میں وٹامن اے موجود رہتا ہے۔ وٹامن اے بعض مچھلی کے جگر کے تیل میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ انڈے میں وٹامن اے کے ساتھ کیروٹین (carotene) بھی موجود رہتا ہے۔ ......نباتیاتی غذا میں سبز پتے اور رنگین ترکاریوں اور پیلے پھلوں میں ایک زرد رنگ کا مادہ کیروٹین (carotene)

---

[1] ۔ حیاتین اور ہماری صحت۔ غذا اور تغذیہ۔ زیر طبع

پایا جاتا ہے۔ انسانی جسم کیروٹین سے وٹامن اے تیار کرسکتا ہے۔ اس بنا پر کیروٹین کو پرووٹامن (provitamin A) کہا جاتا ہے۔ ہرے پتے والی ترکاریاں پالک، میتھی، پتہ گوبھی، امباڑہ رنگین ترکاریوں میں گاجر اور کدو اور پیلے پھلوں آم اور پپئی میں کروٹین بکثرت پایا جاتا ہے۔ ایک سو گرام ترکاری جس میں کیروٹین موجود ہو، ان کا ہر روز استعمال وٹامن اے کی ضرورت پوری کردیتا ہے۔ ...... جگر وٹامن اے کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ صحت مند انسان میں وٹامن اے جگر میں چھ سے نو ماہ تک کام آنے کی مقدار میں جمع ہوسکتا ہے۔ غذا میں ایک طویل عرصہ تک وٹامن اے کی زائد مقدار نقصان دہ ہوتی ہے۔ سردرد، چڑچڑاپن، متلی، قے اور بھوک نہ لگنے کی شکایات ہوتی ہیں۔ غذا میں وٹامن اے لینے سے یہ شکایات دفع ہوجاتی ہیں۔[1]

وٹامن A انسان کو عمر کے ہر حصہ میں چاہئے لیکن شیر خوار بچہ کے لیے اشد ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''چوں کہ وٹامن اے کی کمی پانچ سال سے کم عمر بچوں میں عام ہے۔ بچوں کو وٹامن اے کی کمی سے محفوظ رکھنے کے لیے ماں کو بہتر غذا دی جانی چاہئے۔ تاکہ بچوں کے جگر میں پیدائش کے وقت وٹامن اے اور لوہے کافی مقدار میں جمع رہے۔ جو چھ ماہ سے ایک سال تک کام آسکے۔ پیدائش کے بعد شروع کا دودھ جیسے colostrum کہتے ہیں۔ بچہ کو پلانا چاہئے۔ اس دودھ میں وٹامن اے کی وافر مقدار موجود رہتی ہے۔ ماں کے دودھ میں وٹامن اے کا انحصار ماں کی غذا پر ہوتا ہے۔ اس لیے دودھ پلانے والی خواتین کی غذا میں وٹامن اے کا خاص خیال رکھا جانا چاہئے''۔ [2]

---

[1] ۔ حیاتین اور ہماری صحت ۔ غذا اور تغذیہ ۔ زیر طبع

[2] بینائی کے لیے درکار وٹامن A، غذا اور تغذیہ ۔ زیر طبع

جس طرح وٹامن اے شیر خوار بچہ کے لیے ضروری ہے اس طرح آنکھوں کی بینائی کے لیے بھی ضروری ہے۔اس تعلق سے ڈاکٹر عابد معز رقمطراز ہیں:

انسانی آنکھ میں بینائی کے لیے دو مختلف عضو ہوتے ہیں۔ Rods مدھم روشنی بینائی کا فرض انجام دیتے ہیں اور Cones روشنی میں اور رنگوں کو دیکھتے ہیں۔ دونوں کی بہتر کارکردگی کے لیے ایک کیمیائی مادہ وٹامن اے درکار ہے۔ جب روشنی اس مادہ پر پڑتی ہے تو چند کیمیائی تبدیلیوں کے بعد دماغ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے۔اس عمل کو ہم بینائی کہتے ہیں''۔ [1]

وٹامن A کی اہمیت وافادیت کے ساتھ اس کی منجملہ خصوصیات پر ڈاکٹر عابد معز نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

انسان کو صحت مند رہنے کے لیے وٹامنز درکار ہیں۔ وٹامنز کیمیائی مرکبات ہیں ۔جنھیں غذا سے حاصل کیا جاتا ہے۔ وٹامن اے(Vitamin A) بینائی کے لیے ضروری ہے وٹامن اے کی کمی ہمارے ملک کی صحت عامہ کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ ...... بینائی کے اہم کام کے علاوہ وٹامن اے جسم میں چند دوسرے فرائض بھی انجام یتا ہے۔ وٹامن اے جلد اور معکوسی جھلیوں (Mucous membranes) کو صحت مند رکھتا ہے۔ وٹامن اے نشو ونما کے لیے بھی ضروری ہے۔ وٹامن اے امراض کے خلاف قوت مدافعت بڑھانے کا سبب بھی بنتا ہے۔ ......عموماً غذا میں وٹامن اے اور کیروٹین کی کمی مقدار موجود رہنے سے وٹامن اے کی کمی ہوتی ہے۔ غذا میں چکنائی کی کمی سے وٹامن اے اور کیروٹین کا انجذاب ٹھیک طرح سے نہیں ہوتا۔ چند قسم کی پیچش میں بھی وٹامن اے کی کمی لاحق ہوسکتی ہے۔ وٹامن اے کی کمی پانچ سال سے کم عمر بچوں میں عام

---

[1] ۔ بینائی کے لیے درکار وٹامن A، ۔غذا اور تغذیہ۔ زیر طبع

ہے۔ان بچوں میں وٹامن اے کی کمی اکثر و بیشتر پروٹین اور توانائی کی کمی سے ہونے والی بیماریوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ وٹامن اے کی کمی سے بینائی اور آنکھ متاثر ہوتی ہے۔ چار قسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔شب کوری یا رتوندھی سب سے پہلے ہونے والی شکایت ہے۔متاثرہ بچے کو مدھم روشنی اور رات میں دکھائی نہیں دیتا۔ ماں باپ محسوس کرتے ہیں کہ بچہ رات میں ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پاتا۔

شب خوری کے بعد آنکھ کا سفید حصہ جسے Conjunctiva متاثر ہوتا ہے۔آنکھ کا یہ حصہ روکھا اور گدلا ہو جاتا ہے۔آنکھ میں چمک باقی نہیں رہتی۔ان تبدیلیوں کو (Conjuctival xerosis) کہا جاتا ہے۔ جلد یا دیر سفید تکونے اور کھردرے دھبے نمودار ہوتے ہیں۔ ان دھبوں کو بیٹائس اسپاٹ (Bilots spots) کہتے ہیں۔ وٹامن اے استعمال کرنے سے یہ شکایات دور ہو جاتی ہیں۔ خاطر خواہ علاج نہ ہونے پر آنکھ کی پتلی میں زخمی ہوتا ہے جسے (corneal ulcer) کہتے ہیں۔اس وقت اگر فوری علاج نہ کیا گیا تو بینائی کے لالے پڑ جاتے ہیں۔پُتلی کے زخم سے سوراخ پڑ جاتا ہے جس سے آنکھ کا اندرونی مادہ باہر ابل پڑتا ہے۔آنکھ ہمیشہ کے لیے ضائع ہو جاتی ہے اور بچہ بینائی سے محروم ہو جاتا ہے۔آنکھ کی اس حالت کو keratomalacia اور وٹامن اے کی کمی سے ہونے والے اندھے پن کو vitamin a deficiency blindness کہتے ہیں۔

بینائی اور آنکھ متاثر ہونے کے علاوہ وٹامن اے کی کمی سے بچوں کو بار بار چھوت کی بیماریاں ہوتی ہیں۔ کھانسی ، بخار اور اجابتوں کی شکایات تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ہوتی ہیں۔

---

[1] بینائی کے لیے درکار وٹامن اے، غذا اور تغذیہ۔ زیر طبع

حیاتین سی (c)

وٹامن سی تاریخ میں ایک اہم واقعہ سے پہچانا جاتا ہے۔مشہور سیاح واسکوڈی گاما 1497ء میں ہندوستان کے سفر پر تھا،اس کے ساتھ کل ایک سوساٹھ آدمی سوار تھےلیکن وٹامن سی کی کمی سے دوران سفر ایک سولوگوں کی موت واقع ہوئی۔اس مرض کو اسقربوط (Seurvy) کہتے ہیں۔ڈاکٹر جیمس لیڈ نے 1753ء میں بتایا کہ سنگترہ، مالٹا اور لیمومرض اسقربوط کو روکتا ہے تب سے سمندری سفر کے دوران پھلوں کا رس رکھا جانے لگا۔1920ء کے عہد میں وٹامن سی (C) کو پہنچانا اور تیار کیا گیا۔بعد میں اس کو مختلف بیماریوں کے علاج میں استعمال کیا جانے لگا۔جیسے سردی، زکام، الرجی، انفکشن کی بیماریوں میں زخموں اور آپریشن کے بعد یہ وٹامن شربتوں میں اور گوشت سے بنی اشیاء کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اس کا زیادہ مقدار میں استعمال نقصاندہ ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ زائد مقدار میں استعمال پیشاب کی نالیوں میں پتھری بننے کا سبب ہوتی ہے۔وٹامن سی اور اس کی خصوصیات بیان کرتے ہیں ہوئے عابد معز لکھتے ہیں:

> ''وٹامن سی کا کیمیائی نام (Ascorbic Acid) ہے۔ یہ وٹامن پانی میں حل پذیر ہے۔گرمی یا درجہ حرارت پر اور Oxidation کے عمل سے وٹامن سی ضائع ہوجاتا ہے۔وٹامن سی جسم کے خلیوں کو آپس میں جوڑنے میں مدد دیتا ہے۔وٹامن سی کی کمی سے Collagen نامی پروٹین کم مقدار میں بنتا ہے۔ ہڈیوں، دانت اور خون کی نالیوں کی دیواروں کے خلیوں کو آپس میں جوڑے رکھنے کے لیے وٹامن سی ضروری ہے۔ زخم ٹھیک ہونے کے لیے بھی Collagen چاہیے جس کا انحصار وٹامن سی پر ہے۔وٹامن سی کی کمی سے زخم دیر سے مندمل ہوتے ہیں،لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وٹامن سی کی زائد مقدار

سے زخم وقت پر ہی ٹھیک ہوتے ہیں۔ وٹامن سی کی زائد مقدار زخم ٹھیک ہونے
کے لیے درکار وقت میں کمی نہیں کرسکتی۔ خلیے آپس میں مضبوطی سے جڑے رہتے
ہیں تو جراثیم حملہ آور نہیں ہو سکتے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وٹامن سی قوت مدافعت
میں اضافے کا باعث ہی بنتا ہے۔ وٹامن سی لوہے کے انجذاب میں مدد دیتا
ہے۔ وٹامن سی کی کمی سے متاثر ہونے والے دو تہائی مریضوں میں خون کی کمی
پائی جاتی ہے۔ وٹامن سی دوسرے وٹامنز کی بہ نسبت بہت جلد ضائع ہو جاتا
ہے۔ زائد حرارت دھوپ اور ہوا میں کھلا چھوڑ دینے سے وٹامن سی کی کیمیائی
ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھلوں اور ترکاریوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے
کرنے پیلنے اور زائد عرصہ تک ہوا میں کھلا چھوڑنے سے وٹامن سی
Oxidation کے عمل سے ختم ہو جاتا ہے۔ پکوان میں سوڈے کا استعمال اور
پیتل کے برتنوں میں پکوان کرنے سے وٹامن سی ضائع ہو جاتا ہے'' [1]

وٹامن سی حیات انسانی کے لیے بے حد ضروری ہے۔اس کی کمی سے چند بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ وٹامن سی بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت بڑھاتا ہے۔ڈاکٹر عابد معز وٹامن سی کے متعلق لکھتے ہیں:

'' وٹامن سی کی کمی سے اسقربوط نامی مرض ہوتا ہے۔ اس مرض میں
مسوڑے پھول جاتے ہیں۔ دو دانتوں کے بیچ میں سوجن زیادہ ہوتی ہے۔ان
سے خون رستا ہے۔ مسوڑوں پر مختلف جراثیم حملہ آور ہوتے ہیں۔ منہ سے بو آتی
ہے۔ خون کی چھوٹی نالیوں سے خون بہہ کر جلد کے نیچے جمع ہونے لگتا ہے۔ جسم
کے مختلف حصوں میں چھوٹے چھوٹے زیر جلد خون کے دھبے نمودار ہوتے ہیں۔
کمزوری اور نقاہت رہتی ہے۔ ہڈیاں بھی متاثر ہوتی ہیں''۔ [2]

---

[1]۔ بہتر خوبیوں کا حامل وٹامن سی۔ غذا اور تغذیہ۔ زیر طبع

[2]۔ بہتر خوبیوں کا حامل وٹامن سی۔ غذا اور تغذیہ۔ زیر طبع

وٹامن سی کن کن ذرائع سے حاصل کی جاسکتی ہے اس تعلق سے ڈاکٹر عابد معز نے اس طرح اظہار کیا ہے۔

''وٹامن سی آملہ، امرود (جام)، لیمو، سنگترہ اور سنگترے کی ذات کے پھل، ہری ترکاریاں، جیسے ہری مرچ، پالک، ٹماٹر، پپئی، بیگن، پھول گوبھی، گڈے والی ترکاری اور آلو میں وٹامن سی اچھی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ غذائی اجناس اور مختلف دالوں میں وٹامن سی نہیں پایا جاتا لیکن جب انہیں بھگویا جاتا ہے، اوران میں کونپلیں نکل آتی ہیں تب غذائی اجناس اور دالوں میں وٹامن سی کی وافر مقدار پیدا ہوتی ہے۔ اس عمل کو Sprouting کہتے ہیں۔............ حیاتیاتی غذاؤں میں وٹامن سی نہ ہونے کے برابر پایا جاتا ہے۔ صرف جگر میں وٹامن سی کی قابل قدر مقدار موجود رہتی ہے''۔ [1]

ایک اور مضمون حیاتین اور ہماری صحت، میں کس طرح وٹامنز ضائع ہوتے ہیں اس جانب توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غذا میں وٹامنز کی مقدار کا انحصار غذا کے اجزا اور غذا تیار کرنے اور محفوظ رکھنے کے طریقوں پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چاول کو پالش کرنے سے وٹامن بی کامپلکس ختم ہوجاتے ہیں۔ سبزیوں کو زیادہ دھونے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے اور پکانے کے لیے استعمال کیا گیا پانی پھینک دینے سے پانی میں حل پذیر وٹامنز ضائع ہوجاتے ہیں۔ پھلوں کو کاٹ کر ہوا میں کھلا چوڑ دینے سے وٹامن سی ناکارہ ہوجاتا ہے''۔ [2]

علم سائنس نے بے شمار تجربوں کے ذریعہ طب کے میدان میں مختلف دواؤں کی ایجادات سے

---

[1] بہتیرے خوبیوں کا حامل وٹامن سی۔ غذا اور تغذیہ۔ زیرطبع

[2] ۔ حیاتین اور ہماری صحت۔ غذا اور تغذیہ۔ زیرطبع۔

طب کے دامن کو وسیع کیا ہے لیکن آج ہم معمولی سے معمولی بیماری کو کم کرنے کے لیے غیر ضروری دواؤں کے عادی ہو چکے ہیں۔ غیر ضروری حیاتین استعمال کرنے سے ہم خود غذا سے لاپرواہی برتتے جا رہے ہیں، حیاتین تبھی فائدہ مند ہوتے ہیں جب غذا میں دوسرے اجزاء موجود ہوں۔ ان کی غیر موجودگی میں حیاتین اپنی کارکردگی نہیں رکھ سکتے۔ حیاتین کی زائد مقدار کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچاتی بلکہ چند وٹامنز زائد مقدار میں نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں، غذا سے لاپرواہی اور زائد وٹامنز کے استعمال سے ہونے والے مضر اثرات کے تعلق سے عابد معز لکھتے ہیں:

''وٹامنز کا غیر ضروری استعمال جیب پر گراں بار ہونے کے علاوہ انسانی صحت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ روغن میں حل پذیر حیاتین اے، ڈی، ای اور کے اگر ایک عرصہ تک زائد مقدار میں حاصل کئے جائیں تو ان کے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وٹامن اے کے زائد استعمال سے درد سر متلی۔ قئے، بھوک نہ لگنا، چڑ چڑا پن۔ سر میں موجود پانی میں اضافہ، ہڈیوں کی سوجن، جلد کا رنگ پیلا پڑنا بالوں کا گرنا اور دوسری شکایات لاحق ہوتی ہیں۔ وٹامن ڈی کی زیادتی سے بھوک نہ لگنا، متلی قئے، وزن میں کمی، خون میں کیلشیم کی زیادتی، مختلف اعضاء میں کیلشیم جمع ہونا، کمزوری وغیرہ جیسی شکایتیں ہوتی ہیں۔ وٹامن ای کی زائد مقدار سے سر درد، کمزوری چکر آنکھوں میں اندھیری، منہ کا پکنا، خون شکر میں کمی اور دوسری شکایات کے ساتھ جنسی غدود کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ یہ مضر اثر اس خوبی کے خلاف ہے جس کے لیے وٹامن ای کا استعمال ہوتا ہے''۔ [1]

اسی طرح ایک اور مضمون ''بھوک اور ناقص تغذیہ سے جنگ'' میں وٹامنز .A,B,C,D کی منجملہ خصوصیات پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''حیاتین اے (Vitamin A) کی کمی سے بینائی متاثر ہوتی ہے اور بچوں

---

[1] ۔ وٹامنز کی دواؤں کا غیر ضروری استعمال۔۔ غذا اور تغذیہ۔ زیر طبع

کی شرح اموات میں اضافہ بھی دیکھا گیا ہے۔ حیات بی کامپلکس (vitamin B Complex) کی کمی سے اعصابی قلبی، جلدی اور ہضمی شکایات ہوتی ہے۔خون کی کمی بھی ہوسکتی ہے۔حیاتین سی (Vitamin C) کی کمی سے قوت مدافعت میں کمی ہوتی ہے۔حیاتین ڈی (Vitamin-D) کی کمی سے سوکھا Rickets) ہوتا ہے۔اس مرض میں ہڈیاں متاثر ہوتی ہیں۔ کیلشیم کی کمی سے ہڈیاں کمزور ہوتی ہیں۔ایوڈین کی کمی سے جسمانی اور دماغی نمو پر برا اثر پڑتا ہے لوہا یا فولاد Iron کی کمی خون کی کمی Iron, DefiCiency Anemia عام ہے۔خواتین اور بچے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔لوہے کی کمی حاملہ خواتین کی شرح اموات میں اضافہ کا باعث بھی ہے''۔ [1]

لحمیات پروٹین: Protein

جسم میں پانی کے بعد پروٹین لحمیات کی وافر مقدار پائی جاتی ہے۔ ہمارے جسم کا اٹھارہ فی صد جسمانی وزن لحمیات پر مشتمل ہوتا ہے۔ پروٹین جسم میں خلیوں اور بافتوں کی شکل میں ہوتا ہے، اس کا اہم کام جسم کی تعمیر نو (نمو) اور مرمت ہے۔جسم میں پروٹین اور توانائی کی کمی کی وجہ سے حسب ذیل بیماریاں لاحق ہوتی ہیں جیسے:

''ہمارے ملک میں پائی جانے والی غذائی بیماریوں میں اہم بیماریاں پروٹین اور توانائی کے کم حصول سے ہوتی ہیں۔ایک طرف کواشیورکر، دوسری جانب مراسمس نامی بیماریاں ہیں۔ یہ امراض عموماً پانچ سال سے کم عمر بچوں میں ہوتی ہیں۔ایک سے تین برس کی عمر نشو ونما میں بہت اہم ہوتی ہیں۔اس دوران مناسب غذا ملنی چاہیے۔تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ ہمارے ملک میں پروٹین سے زیادہ توانائی کی کمی ہوتی ہے۔......کواشیورکر نامی مرض میں پیروں پر سوجن

---

[1] ۔بھوک اور ناقص تغذیہ سے جنگ۔غذا اور تغذیہ۔زیر طبع۔

نمو دار ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ جسم کے دوسرے حصوں تک پھیلتی ہے ۔ جلد کھردری اور جگہ جگہ سے پھٹ جاتی ہے۔ بالوں کا رنگ تبدیل ہوجاتا اور وہ کمزور ہو کر گرنے لگتے ہیں۔ بچہ چڑچڑا رہتا ہے۔کواشیورکر کے برخلاف مراسمس جسے سوکھے کی بیماری کہا جاتا ہے جس میں بچہ دبلا نحیف اور ناتواں ہوجاتا ہے۔ چہرے اور بدن سے چکنائی ختم یا غائب ہوجاتی ہے۔ ہڈیاں اور پسلیاں واضح دکھائی دینے لگتی ہیں‘‘۔ [1]

معدنیاتMinerals

انسانی جسم چار اجزاء پانی ،لحمیات، چربی، اور معدنیات سے بنا ہے۔لحمیات جسم میں خلیوں اور بافتوں کی شکل میں ہوتے ہیں پانی خلیوں کے اندراور باہر رہتا ہے،توانائی چربی کی صورت جمع ہوتی ہے۔جسم کے بنیادی ڈھانچہ کے لیے معدنیات درکار ہیں۔ جو جسمانی وزن کے چھ فی صد حصہ پر قابض ہیں۔ معدنیات کی تین چوتھائی مقدار کیلشیم اور فاسفورس کی ہوتی ہیں کیلشیم فاسفورس اور لحمیات سے ہڈیاں بنتی ہیں۔ اس تعلق سے ڈاکٹر عابد معز لکھتے ہیں:

’’معدنیاتMinerals بھی ہمارے جسم کی بناوٹ اور کارکردگی کے لیے درکار ہیں، تغذیہ میں معدنیات سے مراد ان غیر نامیاتی معدنی جیسے سوڈیم، ایوڈین، کیلشیم ہے جو ہمارے جسم کو درکار ہیں۔ چند معدنیات جیسے کیلشیم، فاسفورس میگنیشیم ،سوڈیم، پوٹاشیم اور کلورائڈ کی خاصی مقدار ہمارے جسم میں پائی جاتی ہے۔ جب کہ دوسرے معدنیات بہت کم مقدار میں درکار ہوتے ہیں۔ انہیں Trace Elements کہا جاتا ہے۔ان میں لوہا یا فولاد، جست ایوڈین، تانبا، کرومیم، سیلینیم اور فلورائڈ شامل ہیں۔ دو معدنیات گندھک (سلفر) اور کوبالٹ اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ وہ وٹامنز اور امینو ترشوں کا ملحق

---

[1] ۔مضمون غذائی بیماریاں ۔۔غذا اور تغذیہ۔ زیر طبع

> ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر وہ وٹامنز اور امینو ترشے صحیح ڈھنگ سے کام نہیں کر سکتے'' ۔[1]

پانیWater

پانی کو بعض ماہرین ایک مقوی Nutrient قرار دیتے ہیں۔ ہمارے جسم کو پانی کی وقفہ وقفہ سے ضرورت پڑتی ہے۔ اس اہم مقوی کی مقدار بھی دوسرے مقویات سے زیادہ بڑی ہے۔ ایک عام انسان کے لیے یومیہ 2500 ملی لیٹر پانی درکار ہوتا ہے جب کہ کاربوہائیڈریٹس یومیہ درکار مقدار 500 گرام کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ دوسرے مقویات اس سے کم مقدار میں درکار ہوتے ہیں۔ پانی کی ضرورت کا اندازہ فی کیلوری ایک ملی لیٹر کے حساب سے لگایا جاتا ہے۔ درجہ حرارت میں اضافہ ہونے اور دیگر حالتوں میں پانی کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ اکثر غذائی اشیاء میں پانی موجود رہتا ہے۔ خشک اشیاء میں بھی پانی پایا جاتا ہے۔ غذا سے توانائی حاصل کرنے کے عمل سے بھی جسم میں پانی بنتا ہے:

> ''انسانی جسم کا بچپن سے ستر 70% وزن پانی پر مشتمل ہے۔ پانی کا تین چوتھائی حصہ خلیوں کے اندر Intracellular اور ایک چوتھائی حصہ خلیوں کے باہر Extracellular خون اور دوسرے جسمانی سیال کی شکل میں موجود رہتا ہے۔ زیادہ چربی سے پانی کم ہوتا ہے، موٹے لوگوں کے مقابلے میں دبلے اور بڑوں کی بہ نسبت بچوں میں پانی کی زیاہ مقدار ہوتی ہے۔ جسم کی کارکردگی کے لیے پانی کی مناسب مقدار ضروری ہے'' ۔[2]

غذا ہمارے جسم کو توانائی فراہم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ غذا ہمارے جسم میں دوسرے اہم کام انجام دیتی ہے۔ زندگی کی ایک اہم خوبی نشوونما ہے جو پیدائش کے بعد ایک عمر تک مسلسل جاری رہتی ہے۔ ہماری غذا مختلف کیمیائی مادوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان کیمیائی مادوں کو مقویات Nutrients کہتے ہیں ہمارے

---

[1] ۔ مضمون ۔ غذائی اجزاء ۔ غذا اور تغذیہ ۔ زیر طبع

[2] ۔ کیا آپ موٹے ہیں ۔ غذا اور تغذیہ ۔ زیر طبع

جسم کو لگ بھگ پچاس مقویات کی ضرورت ہوتی ہے ہر مقوی ایک یا ایک سے زیادہ کا انجام دیتا ہے۔ان مقویات کو ان کی درکار مقدار کے لحاظ سے دو زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔کلاں مقویات Macro - Nutrients اور خرد مقویات Mico-Nutrients ۔حیاتین اور معدنیات خرد مقویات کے زمرے میں آتے ہیں۔ان سے جسم کو توانائی نہیں ملتی لیکن جسم کے مختلف افعال اور نمو کے لیے ضروری ہیں وہ بہت کم مقدار میں درکار ہوتے ہیں۔کاربوہائیڈریٹس ، چکنائی اور لحمیات کلاں مقویات کے زمرے میں آتے ہیں۔انسانی جسم کا تانا بانا ان ہی تین اجزاء پر بنتا ہے یہی تین مقویات جسم کو توانائی فراہم کرتے ہیں یہ مقویات کثیر مقدار میں درکار ہوتے ہیں۔ڈاکٹر عابد معز نے ان چار مقویات کی مجملہ خصوصیات ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے:

''انسانی جسم کا بچپن سے ستر فیصد 70% وزن پانی پر مشتمل ہے۔ پانی کا تین چوتھائی حصہ خلیوں کے اندر Intracellular اور ایک چوتھائی حصہ خلیوں کے باہر Extracellular ۔خون اور دوسرے جسمانی سیال کی شکل میں موجود رہتا ہے۔زیادہ چربی سے پانی کم ہوتا ہے۔موٹے لوگوں کے مقابلہ میں دبلے اور بڑوں کی بہ نسبت بچوں میں پانی کی زیادہ مقدار ہوتی ہے۔جسم کی کارکردگی کے لیے پانی کی مناسبت مقدار ضروری ہے۔......جسم میں پانی کے بعد پروٹین یعنی لحمیات کی وافر مقدار پائی جاتی ہے۔اٹھارہ فیصد جسمانی وزن لحمیات پر مشتمل ہوتا ہے۔ خلیے اور بافتے درحقیقت لحمیات ہی ہوتے ہیں ، لحمیات کا ایک تہائی حصہ عضلات میں پایا جاتا ہے۔

جسم کو بنیادی ڈھانچہ کے لیے معدنیات Minerals درکار ہیں۔ جو جسمانی وزن کے چھ فیصد حصہ پر قابض ہیں۔معدنیات کی تین چوتھائی مقدار کیلشیم اور فاسفورس کی ہوتی ہے۔کیلشیم ، فاسفورس اور لحمیات سے ہڈیاں بنتی ہیں۔جسم میں چربی یا شحم Fat کی مقدار بدلتی رہتی ہے۔عام حالات میں عورت

میں چربی کی مقدار (بارہ سے پچیس فیصد جسمانی وزن) مرد (آٹھ سے پندرہ فیصد جسمانی وزن) کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔جسم میں چربی مختلف فرائض انجام دیتی ہے، چربی سے انسانی شکل وصورت برقرار رہتی ہے۔جسم کو حاصل ہونے والی زائدتوانائی Energy چربی کی شکل میں جمع ہوتی ہے''۔ [1]

ریاح،گیس FLATULENCE

پیٹ میں ہوا بھرنے یا گیس جمع ہونے کی شکایت کو ریاح گیس یا بارشکم اور اپھارہ بھی کہا جاتا ہے۔ ہر انسان اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ پیٹ میں ہوا یا گیس جمع ہونے کی دو وجوہات ہیں۔پہلی وجہ ناک اور منہ کے ذریعہ نگلی ہوئی ہوا اور دوسری جو پیٹ کے اندر آنت میں غیر ہضم کھانے پر بیکٹیریا کے اثر کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔کھانے اور پینے کے دوران زیادہ ہوا معدہ کے اندر جاسکتی ہے۔اسٹرا Straw کے ذریعہ مشروب پینے اور چیونگم چبانے سے زیادہ ہوا معدہ میں جاتی ہے۔مصنوعی دانت اور حلق سے بات کرنے کی عادت سے بھی زیادہ ہوا نگلی جاتی ہے۔جلدی جلدی سانس لینے اور منہ سے ہوا معدے کے اندر چلی جاتی ہے۔اس تعلق سے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیے:

''پیٹ میں ہوا یا گیس جمع ہونے کی دو وجوہات ہیں۔پہلی وجہ ناک اور منہ کے ذریعہ نگلی ہوئی ہوا ہے اور دوسری وہ ہوا یا گیس ہے جو پیٹ کے اندر آنت میں غیر ہضم کھانے پر بیکٹیریا Bacteria کے اثر کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔آنت میں پیدا ہونے والی گیس کو ہم دو مختلف عنوانات پیٹ میں گیس پیدا ہونے کے اسباب اور گیس پیدا کرنے والی غذائی اشیاء کے تحت بیان کریں گے۔ ہمارے معدہ Stomach میں ہوا کی ایک مقدار موجود رہتی ہے۔یہ بات قدرتی اس لیے ہے کہ معدہ کا تعلق منہ اور ناک کے ذریعہ باہر فضا

---

[1] ۔کیا آپ موٹے ہیں۔غذا اور تغذیہ۔زیر طبع

سے ہے۔عموماً معدہ میں ہوا زیادہ ہوا اور تکلیف دینے لگے تو سبب دریافت کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

کھانے اور پینے کے دوران زیادہ ہوا معدہ کے اندر جاسکتی ہے۔تیزی سے کھانا یا پینا، بغیر چبائے نگلتے جانا۔چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینا جیسی حرکات زیادہ ہوا نگلنے کا سبب بنتی ہیں۔اسٹراStraw کے ذریعہ مشروب پینے اور چیونگم چبانے سے زیادہ ہوا معدہ میں جاتی ہے۔کاربونیٹڈ Carbonated مشروبات یعنی وہ مشروبات جن میں کاربن ڈائی آکسائڈCorbondioxide ملی ہوتی ہے۔ کا استعمال میں معدہ میں ہوا کے داخلے کا سبب ہے خراب مصنوعی دانت اور حلق سے بات کرنے کی عادت سے بھی زیادہ ہوا نگلی جاتی ہے۔ جذباتی ہلچل یا ہیجان کے سبب بھی زیادہ ہوا معدہ میں جاتی ہے۔ پریشانی یا غم میں آہیں بھرنے رونے، جلدی جلدی سانس لینے اور منہ سے سانس لینے سے ہوا معدہ کے اندر داخل ہوتی ہے۔ ہوا کے زیادہ نگلنے کوAerophagia کہتے ہیں''۔ [1]

ناک اور منہ کے ذریعہ نگلی ہوئی ہوا اور پیٹ کے اندر غیر ہضم غذا کے زیر اثر پیدا ہونے والی ہوا کے درمیان تقابل کرتے ہوئے ان کی الگ الگ خصوصیات اس طرح بیان کی ہے:

''یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آنتوں میں پیدا ہونے والی گیس اوپر کا سفر نہیں کرتی۔آنتوں میں پیدا ہونے والی گیس کا زیادہ حصہ جذب ہوجاتا ہے کچھ حصہ پاد کی شکل میں خارج ہوتا ہے۔ڈکار کے ذریعہ خارج ہونے والی ہوا دراصل ہماری نگلی ہوا غذا کے ہضم نہ ہونے اور غیر ہضم غذا کے سڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔اس خیال کے حامی لوگ ڈکاروں کے ذریعہ خراب ہوا کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس طرح بعض اشخاص ڈکاریں لینے کے عادی بن جاتے

---

[1] ۔بادشکم۔ہم ہوا نگلتے ہیں۔غذا اور تغذیہ۔زیر طبع

ہیں۔ یہ سارا خیال ہی غلط ہے اور دانستہ ڈکار کی کوشش کرنا نامناسب نہیں ہے''۔[1]

منہ اور ناک کے ذریعہ نگلی ہوئی ہوا معدے میں جا کر واپس آنے والی ہوا کو ڈکار کہتے ہیں۔ دراصل یہ آکسیجن اور نائٹروجن پر مشتمل فضائی ہوا ہوتی ہے۔اسی لیے ڈکار میں کسی قسم کی بو نہیں ہوتی۔بعض اوقات ڈکار کے ساتھ معدہ کا ترشہ اوپر آتا ہے تو کھٹے ذائقے کا احساس ہوتا ہے اس کو کھٹی ڈکار کہتے ہیں:

''نگلی ہوئی ہوا ڈکار کی شکل میں واپس نکلتی ہے۔معدہ میں زیادہ ہوا جانے کے سبب ڈکار بھی آتی ہیں۔منہ اور ناک کے ذریعہ نگلی ہوا اور اصل عام فضاء کی ہوا ہے اور یہ ہوا آکسیجن اور نائٹروجن پر مشتمل ہوتی ہے۔اسی لیے ڈکار میں کسی قسم کی بو نہیں ہوتی۔ڈکار کے ساتھ جب غذا کا کچھ حصہ یا معدہ کا ترشہ اوپر آتا ہے تو کھٹے ذائقے کا احساس ہوتا ہے۔ایسی صورت میں لوگ کھٹی ڈکاریں آنے کی شکایت کرتے ہیں۔یہ بات دلچسپ ہے کہ ڈکار لینے سے ہوا خارج ہوتی ہے اور اطمینان اور آرام کا احساس ہوتا ہے لیکن ڈکار خود ہوا نگلنے کا باعث بھی بنتی ہے۔ہوا نگلنے، ڈکار لینے اور پھر ہوا نگلنے کا سلسلہ دیر تک چل پڑتا ہے۔...... جب معدہ میں زیادہ ہوا داخل ہوتی ہے تو معدہ پھیلتا ہے اور پیٹ بھرنے، ابھرنے اور پھیلنے کا احساس ہوتا ہے۔بے چینی رہتی ہے۔ پیٹ میں تکلیف بھی ہوتی ہے۔ڈکاریں لی جاتی ہیں یا آتی ہیں۔بعض مرتبہ پیٹ میں بھری ہوا اوپر پہنچ کر سینے میں شدت کی تکلیف کا باعث بنتی ہے۔سینہ کی اس تکلیف کو کبھی دل کا درد سمجھ کر پریشان ہوجاتے ہیں تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل کے حقیقی درد کو گیس کی تکلیف سمجھ لیا جاتا ہے۔دوسری صورت خطرناک ہوسکتی ہے،اسی لیے ڈاکٹر سینہ کی تکلیف میں احتیاطاً ای سی جی کروانے کا مشورہ دیتے ہیں''۔[2]

---

[1] ۔بارشکم ہم ہوا نگلتے ہیں۔ غذا اور تغذیہ۔زیر طبع

[2]۔ بادشکم ہم ہوا نگلتے ہیں۔غذا اور تغذیہ۔زیر طبع

تقریباً ایک سو قسم کے بیکٹیریا ہماری بڑی آنت میں موجود رہتے ہیں۔ آنتوں میں ہضم نہ ہونے والی غذا کو یہ بیکٹیریا حملہ کر کے اپنی غذا بناتے ہیں جس کے نتیجہ میں سڑاند پیدا ہوتی ہے اور مختلف گیسس بنتی ہیں۔ بیکٹیریا یا جراثیم کی منجملہ خصوصیات پر لکھتے ہیں:

'' ہماری چھوٹی آنت کے آخری حصہ اور بڑی آنت میں بیکٹیریا Bacteria موجود رہتے ہیں۔ ایک سو قسم سے کچھ کم بیکٹیریا آنتوں میں دریافت ہوئے ہیں۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی آنت میں کوئی بیکٹیریا نہیں ہوتا یعنی اس کی آنت جراثیم سے پاک ہوتی ہے۔............آنتوں میں موجود بیکٹیریا فائدہ مند ہوتے ہیں۔ وٹامن کی کمی قابل لحاظ مقدار یہی بیکٹیریا فراہم کرتے ہیں نوزائدہ بچوں میں بیکٹیریا کی غیر موجودگی کے سبب انہیں وٹامن کے دستیاب نہیں ہوتا، بعض بچوں کو اس وجہ سے وٹامن کی کمی ہوسکتی ہے۔ آنتوں میں موجود بیکٹر یا بہت کم مقدار میں وٹامن بی ۱۲ بھی بناتے ہیں۔ آنتوں میں موجود بیکٹر یا ہضم نہ ہونے والی غذا پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ بیکٹیریا کے عمل سے غیر ہضم غذا Undigested بالخصوص ریشے دار Fiber اشیاء میں سڑاند Putrefaction پیدا ہوتی ہے۔ اس سڑاند کے نتیجہ میں بڑی آنت میں مختلف گیسس بنتی ہیں جن میں کاربن ڈائی آکسائڈ Carbon Dioxide اور ہائیڈروجن Hydrogen پیش پیش ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ بدبودار گیس جیسے Indole Skatole اور سلفر ڈائی آکسائڈ Sulfer Dioxide بھی ہوتی ہے یہی گیس ریح کے لیے ذمہ دار ہیں۔........بیکٹیریا کے اثر سے پیدا ہونے والی گیس کا زیادہ تر حصہ بالخصوص کاربن ڈائی آکسائڈ اور ہائیڈروجن جسم میں جذب کر لیا جاتا ہے اور بقیہ گیسس ایک اندازے کے مطابق چھ سو لیٹر یومیہ پادیا ریاح کی شکل میں خارج کی جاتی ہے۔ آنتوں میں پیدا ہونے والی گیس اوپر کی جانب سفر نہیں کر سکتی یعنی وہ معدہ میں نہیں جاتی۔

اس کی وجہ ہمارے ہضمی نظام کی ساخت اور فعل ہے۔ یہ بات یادرکھنے والی ہے کہ معدہ میں ترشہ Acid کے سبب عموماً بیکٹیریا نہیں پائے جاتے ہیں لیکن ایک قسم کا بیکٹیریا H.Pylori پایا جاتا ہے جو السر کا باعث بنتا ہے۔ دوسرے قسم کے بیکٹر یا نہ ہونے سے معدہ میں غذا کی سڑاند سے گیس پیدا ہونے کا امکان نہیں رہتا۔ معدہ میں نگلی ہوئی ہوا جمع ہوتی ہے جو ڈکار کی صورت میں واپس نکلتی ہے"۔ [1]

شکر Sugar

شکر قدرتی طور پر نباتات Plant Kingdom میں پائی جاتی ہیں، جیسے پھلوں گھاس پتوں اور جڑوں میں شکر پائی جاتی ہے۔ پھلوں اور ترکاریوں میں میٹھا ذائقہ فرکٹوز کی بدولت ہے۔ شکر ایک سفید رنگ کا قلمی مادہ ہے Crystalline Substance جو فرکٹوز اور گلوکوز کے ایک ایک سالمہ Molecule سے مل کر بنا ہے۔

عام طور پر شکر کو گنّا Sugar Cane اور چقندر Beetroot سے کشید کیا جاتا ہے، جب ہم پھل اور ترکاری کھاتے ہیں تو ہمیں شکر ملتی ہے اس شکر کو خلفی شکر Intrinsic Sugar کہتے ہیں اور غذا کی تیاری یا تیار غذا میں شکر ملائی جاتی ہے۔ یہ اضافی شکر کہلاتی ہے۔ اضافی شکر خالص سکروز ہے۔ شکر کی زائد مقدار جراثیم کی افزائش کو روکتی ہے۔ اس خوبی کے سبب شکر کو غذائی محافظ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی دوسری خوبی ہے کہ غذائی اشیاء کی ساخت میں تبدیلی پیدا کرتی ہے، جیسے بعض اشیاء جو نرم اور ملائم Soft ہوتی ہے ان میں شکر کے اضافے سے سختی پیدا ہوجاتی ہے شکر میں غذائیت نہیں ہوتی اس سے صرف توانائی یا طاقت ملتی ہے۔ شکر کے تعلق سے لکھتے ہیں

"یہ بات یادرکھنی چاہیے کہ شکر سے ہمیں صرف توانائی یا طاقت Energy

---

[1] ۔ بادشکم، گیس پیدا ہونے کے اسباب۔ غذا اور تغذیہ۔ زیر طبع

ملتی ہے۔شکر میں غذائیت نہیں ہوتی ۔شکر میں پروٹین حیاتین (وٹامنز)
معدنیات وغیرہ نہیں پائے جاتے۔اس بنا پر شکر کو Empty Calories
یعنی خالص حرارے کہا جاتا ہے۔ایک گرام شکر سے ہمیں چار حرارے حاصل
ہوتے ہیں۔شکر میں حراروں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔غذا میں زائد شکر کے
استعمال سے غذائیت متاثر ہوتی ہے۔زائد شکر والی غذاؤں میں پروٹین، ریشہ
Fiber بی کامپلکس اور وٹامن سی کی کمی دیکھی گئی ہے''۔ [1]

مصنوعی مٹھاس Artificial Sweetenes

شکر سے پرہیز کی صورت میں میٹھے ذائقے کی تسکین کے لیے سائنس دانوں نے 1879ء سے ایسے کیمیائی مرکبات Chemical Compounds دریافت کیے ہیں جو بہت ہی کم مقدار میں میٹھا ذائقہ پیدا کرتے ہیں، اس سے توانائی شکر کی بہ نسبت بہت کم مقدار میں ملتی ہے جس کو عام طور پر نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔سکرین جسم میں جذب ہوکر پیشاب کے ذریعہ بغیر تبدیل ہوئے خارج ہوتی ہے۔

سیکرین Seccharin

سیکرین پہلی مصنوعی مٹھاس ہے جو 1879ء میں دریافت ہوئی اور بیسویں صدی کے ابتداء میں دستیاب ہے۔شکر یا چینی سے سیکرین تین سے پانچ سو گنا زیادہ میٹھی ہوتی ہے۔............سیکرین گولیوں اور عرق یا شربت کی شکل میں دستیاب ہے سیکرین کی ایک گولی 15 ملی گرام کی ہوتی ہے۔عموماً ایک گولی یا چار قطرے سیکرین، ایک چمچہ شکر کے برابر مٹھاس پیدا کرتی ہے۔

اسپارٹیم Aspartame

''اسپارٹم عام شکر سے تقریباً دو سو گنا زیادہ میٹھی ہے۔اس حساب سے مٹھاس کے معاملہ میں صرف

---

[1] ۔شکر کا استعمال کم کریں۔غذا اور تغذیہ۔زیر طبع

پانچ گرام اسپارٹم ایک کلوگرام شکر کے مساوی ہے۔اسپارٹم کا مزا شکر سے بہت حد تک ملتا ہوا ہے۔درحقیقت اسپارٹم دو امینو ترشے Amino Acids اسپارٹک ایسڈ Aspartic Acid اور فنائیل الانین Phenylalanine کا مرکب ہے۔

ایسا سلفیم کے Acesulfane K

''ایسا سلفیم کے عام چینی سے تقریباً ایک سو پچاس گنا زیادہ میٹھی ہوتی ہے۔ایسا سلفیم کے کو 1967ء میں دریافت کیا گیا۔ایسا سلفیم کے کا مزا سیکرین سے بہتر ہے۔ایسا سلفیم کے گرمی برداشت کرنے صلاحیت رکھتی ہے۔جس کے سبب اس کا استعمال تیار کھانوں میں بھی ہوتا ہے۔ایسا سلفیم کے مشروبات کو میٹھا کرنے اور میٹھائیوں چیونگم اور دوسرے کھانوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ایسا سلفیم کے کیمیائی تبدیلی کے بغیر پیشاب کے ذریعہ جسم سے خارج ہوتی ہے۔

سائیکلا میٹ Cyclamate

سائیکلا میٹ عام شکر سے تقریباً تیس گنا زیادہ میٹھی ہوتی ہے۔ایک وقت (1950ء اور 1960ء کی دہوں میں) اس کا بہت استعمال ہوتا تھا لیکن مضر اثرات کے سبب 1970ء کے دہے میں سائکلا میٹ کا استعمال کئی ممالک میں ممنوع قرار دیا گیا۔

ایلیٹیم Alitame

ایلیٹیم ،اسپارٹک ایسڈ اورالانین Alanine کا مرکب ہے جو شکر سے دو ہزار گنا زیادہ میٹھی ہوتی ہے۔ایلیٹیم زیادہ گرمی برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ایک گرام ایلیٹیم سے صرف ڈیڑھ حرارے حاصل ہوتے ہیں۔ایلیٹیم کو ابھی عام استعمال اجازت نہیں ملی ہے۔

تھوماٹن Thaumatin

تھوماٹن ایک پٹروین ہے جومغربی آفریقہ میں پائے جانے والے ایک درخت سے حاصل کی جاتی ہے۔تھوماٹن شکر سے تقریباً تین ہزار گنا زیادہ میٹھی ہوتی ہے۔تھوماٹن کو بھی عام استعمال کی اجازت ابھی حاصل نہیں ہوئی ہے۔

نمک۔ایوڈین۔فلورین۔نیامن

غذائی اشیاء کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے تاکہ ہماری صحت نہ صرف برقرار رہے بلکہ ہم بیماریوں سے محفوظ بھی رہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ صحت بخش غذائی اشیاء کا انتخاب کریں اور غیر یا کم صحت بخش غذائی اشیاء سے پرہیز کریں یا انہیں کم کھائیں۔ہمیں زائد نمک کی ضرورت نہیں ہے۔ضرورت سے زیادہ نمک کا استعمال بلڈ پریشر میں اضافہ کرتا ہے۔اس کی خصوصیات پر طبی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سوڈیم Sodium عرف عام میں نمک کا ضرورت سے زیادہ استعمال بلڈ پریشر میں اضافہ کرتا ہے۔اورخون دباؤ میں اضافہ High Blood Pressure دل کے امراض، فالج اور دوسری بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔اسی لیے ایسی غذائی اشیاء کا انتخاب کیا جانا چاہیے جن میں نمک نہ استعمال کیا گیا ہے۔یہ بات یادرکھنے والی ہے کہ ہمیں زائد نمک کی ضرورت نہیں ہے۔سوڈیم کی درکار مقدار ہمیں عام غذا سے حاصل ہوجاتی ہے۔غذائی تیاری میں جو نمک ڈالا جاتا ہے وہ ذائقہ کے لیے ہوتا ہے۔یا غذا کو محفوظ کرنے یا دوسرے مقاصد کے پیش نظر ہوتا ہے''۔[1]

ایوڈین کی کمی سے وقوع پذیر ہونے والے امراض کی جانب یوں اشارہ کیا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''لوہے کی طرح ایوڈین نامی معدن انسانی جسم کو درکار ہے۔گلے میں موجود ایک غدود Lbyroid Glands کے لیے ضروری، ایوڈین کی کمی سے

---

[1] صحت مند غذائی اشیاء کا انتخاب۔غذا اور تغذیہ۔زیر طبع

Goiter نامی مرض ہوتا ہے۔غدود بڑھ جاتا ہے۔ یہ مرض عموماً اونچے مقامات جیسے ہمالیہ پہاڑ پر عام ہے۔ یہاں کے لوگوں کی غذا میں ایوڈین کی مقدار کم ہوتی ہے، دوسرے مقامات پر بھی ایوڈین کی کمی ہوتی ہے۔علاج کے لیے ایوڈین دیا جاتا ہے۔ایوڈین ملا ہوا نمک کے استعمال کا مشورہ دیا جاتا ہے"۔ ۱؎

فلورین کی زیادتی سے نشونما ہونے والے مرض کی نشاندہی یوں کروائی ہے:

"ہمارے ملک کے چند علاقوں میں پانی میں فلورین کی مقدار زیادہ پائی جاتی ہے۔اس پانی کے استعمال سے دانت اور ہڈیاں متاثر ہوتی ہیں۔اس مرض کو Flourosil کہا جاتا ہے۔ پیر کی ہڈیاں متاثر ہوکر گھٹنے کے اندر کی جانب ہوجاتے ہیں جسے Genu Valgum کہا جاتا ہے"۔ ۲؎

☆☆☆

۱؎ ۔غذا کی بیماریاں، ۔غذا اور تغذیہ۔ زیرطبع

۲؎ ۔غذائی بیماریوں۔غذا اور تغذیہ۔ زیرطبع

اختتامیہ

اختتامیہ

ادیب سماج کا ایک ذمہ دار فرد ہوتا ہے۔سماج کی ناہموار صورت حال کی اصلاح کرنا اس کا اولین فرض ہوتا ہے اس فرض کو ادیب اپنے انفرادی طریقے سے نبھاتا ہے۔اسی طرح عابد معز نے بھی اپنے آس پاس کی ناہموار صورت حال کی اصلاح کا فرض کبھی ظرافت کے نشتر سے تو کبھی سنجیدگی و متانت سے بخوبی انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر عابد معز کی ادبی شخصیت کے ہمہ جیت پہلو ہیں وہ بہ یک وقت کالم نگار انشائیہ نگار افسانہ نگار اور طبی و سائنسی مضمون نگار کے علاوہ ممتاز طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔دراصل ادبی دنیا میں آپ نے ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ہی قدم رکھا،ان کی تقریباً تمام ادبی تحریروں میں طنز و مزاح کے عناصر پائے جاتے ہیں۔عابد معز نے اپنے گرد پیش ، ماحول کی ناہمواریوں کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا۔ان کے طنز کے پیچھے اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے۔وہ روزمرہ کے معاملات و واقعات کو مزاحیہ انداز میں لیکن آسان و سلیس زبان میں پیش کرتے ہیں۔جس سے ان کا مزاح عوامی مزاح کی ترجمانی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عابد معز اپنی فکاہیہ تحریروں کے موضوعات میں جس طرح مواد کی فراہمی مکالمہ نویسی اور کردارکشی کرتے ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انکی فکائیہ تحریریں موجود معاشرے کی داستان معلوم ہوتی ہیں۔وہ اپنی تحریروں میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتے ہیں۔وہ واقعہ کے چشم دید گواہ کی طرح قاری کو پوار منظر دیکھاتے ہیں۔قاری بھی انھیں اپنا ہمسفر سمجھتا ہے۔

عابد معز کا مزاح شائستہ و بامقصد ہوتا ہے وہ کسی بھی ناہموار صورت حال پر کتنا ہی شدت سے طنز

کریں لیکن شائستگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے انکا مزاح قہقہہ کے بجائے زیرلب تبسم کا حامل ہے۔ جس کے باعث ابتداء میں خشک محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ دیگر مزاح نگاروں کی طرح اپنے موضوع کے تمہید میں قاری کو متاثر کرنے کے لیے پھکڑ پن یا غیر اخلاقی واقعات کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ان کا مزاح ابتداء سے آخر تک مہذب ہوتا ہے۔ مہذب ہونے کے باوجود قاری کے دل میں انبساط پیدا کرتا ہے۔ اور شروع سے آخر تک قاری کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آتی ہے تو دل مسرت سے آمیزہ ہو جاتا ہے۔

اردو طنز و مزاح کی روایت و تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر مشہور مزاح نگار مزاح پیدا کرنے کے لیے اپنا ایک خاص اسلوب و طرز نگارش اختیار کرتا ہے۔ بعض مزاح نگار لطائف کا سہارا لیتے ہیں تو کوئی مخصوص لب و لہجے کا سہارا لیتا ہے کچھ مزاح نگار قدم قدم پر مزاح پیدا کرنے کے لیے مخصوص شخصیت یا واقعات کو بار بار دہراتے ہیں۔ اسکے علاوہ اردو کے فکائیہ ادب میں چند ایسے بھی مزاح نگار ہیں جنھوں نے مزاح موضوعات اور واقعات کی پیشکش میں ادبی سطح کو برقرار رکھا ہے۔ ان کے مزاح میں علمیت، ذہانت، آگہی، دانشمندی کا عنصر برقرار رہا ہے جیسے مشتاق احمد یوسفی، مشفق خواجہ، وغیرہ۔ عابد معز کے معاصرین میں یوں تو اعلیٰ درجہ کے مزاح نگار ہیں لیکن جس قدر عابد معز کے مزاح میں ادبی سطح برقرار رہتی ہے۔ دیگر مزاح نگاروں کے یہاں اس کا فقدان نظر آتا ہے۔

عابد معز کی ادبی خدمات میں انشائیہ نگاری بھی قابل اعتراف ہے۔ ان کے انشائیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی انشائیہ نگاری ایک خاص انفرادیت رکھتی ہے۔ ایک اچھے انشائیہ نگار کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کا تعلق ہمیشہ روح عصر سے جڑا ہوتا ہے۔ عابد معز ایک ایسے بیدار مغز انشائیہ نگار ہیں کہ ان کے فکری شعور میں عصری حسّیت بنیادی جز ہے وہ ہمیشہ عصری موضوعات چاہے ملکی سطح پر ہوں یا عالمی سطح پر فوراً متوجہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے عصر حاضر کے انشائیہ نگاروں میں عابد معز کی شخصیت اپنے انوکھے اسلوب اور طرز اظہار کے باعث ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

عابد معز ایک جدید حسیت کے انشائیہ نگار ہیں ان کے بے شمار انشائیوں میں ہمیں جدید موضوعات، جدید عنوانات، جدید لفظیات، اور جدید سائنسی آلات کی توضیحات نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز کے انشائیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے انشائیے فنی اعتبار سے کامیاب ہیں۔ اس لحاظ سے ہم عابد معز کو ایک کامیاب انشائیہ نگار کہہ سکتے ہیں۔

عابد معز کی ادبی خدمات میں شگفتہ افسانہ نگاری بھی قابل قدر ہے۔ ان کے مزاحیہ افسانوں میں انسانی جذبات، سماج کی خامیاں و خوبیاں، زندگی کی تلخ حقیقتیں، میاں بیوی کے باہمی تعلقات اور طبی مسائل و سائنسی ایجادات موضوع ہوتے ہیں۔ عابد معز کی افسانہ نگاری کی خوبی یہ ہے کہ ہر تحریر میں ان کی شخصیت جھلکتی ہے یہی نہیں بلکہ اپنی ہر کہانی میں کہیں نہ کہیں ایک کردار کی حیثیت سے شامل رہتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پائے جانے والے کردار خیالی ہونے کے باوجود حقیقی معلوم ہوتے ہیں اجنبی بھی نہیں لگتے۔ ان کے شگفتہ افسانے نہ صرف افسانوی ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں نئے ذائقہ کے حامل بھی ہیں۔ عابد معز نے روز مرہ زندگی سے تعلق رکھنے والے موضوعات پر مختصر و جامع انداز میں جس طرح شگفتہ افسانے لکھے اس سے نئے لکھنے والوں کو ایک تحریک بھی مل سکتی ہے۔

عابد معز بلند پایہ مزاح نگار انشائیہ نگار اور افسانہ نگار کے علاوہ ایک کامیاب کالم نگار بھی ہیں۔ ان کے کالم حالت حاضرہ اور عالمی صورت حال کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ جنھیں ہند و پاک اور خلیجی ممالک میں بھی سراہا گیا ہے۔ عابد معز کے کالم عصری حاضر کے اہم واقعات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عابد معز کے کالم میں دور حاضر کے سماجی و معاشی موضوعات کے علاوہ سائنس و ٹکنالوجی یا جدید ایجادات سے تعلق رکھنے والے موضوعات بھی پائے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے کالم کا قاری ہمیشہ نئے علوم سے اپنا رشتہ جوڑے رکھتا ہے۔

عابد معز کے کالموں کا اسلوب طنزیہ و مزاحیہ ہونے کے باوجود سنجیدگی کا احساس دلاتا ہے کیونکہ

انھوں نے اپنے کالموں میں سنجیدگی اور مزاح کی ادبی سطح کو برقرار رکھتے ہوئے علاقائی، قومی و بین الاقوامی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے کالم کے قاری ہنسی ہنسی میں دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے وقعات و حالات سے باخبر ہونے کے ساتھ محظوظ بھی ہوتے ہیں۔

الغرض عابد معز عصر حاضر کے نمائندہ کالم نگار ہیں جنہوں نے سماجی سیاسی، معاشتی اور طبعی او سائنسی موضوعات کو اپنے کالموں کا موضوع بنایا ہے۔ عابد معز کی علمی و ادبی خدمات کا ایک روشن پہلوطبی خدمات بھی ہیں۔ انھوں نے ادبی تخلیقات کے علاوہ صحت، طب وتغذیہ کے موضوعات پر اردو زبان میں بے شمار مضامین و کالم لکھے ہیں۔ جو مختلف قومی و بین الاقوامی اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

عابد معز نے صحت، طب اور تغذیہ کے موضوعات پر نہایت سلیس اور آسان زبان میں معلومات فراہم کی ہے اور سائنس اور طب کی بے شمار اصطلاحات کو بھی سادہ سلیس و آسان زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ جس سے قاری کو متعلقہ معلومات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی بات کو واضح انداز میں سمجھانے کے لیے مختلف تصویروں کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس طرح بے شمار خوبیوں کی وجہ سے عابد معز کی یہ تحریریں مقبول عام ہو چکی ہیں۔

اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی نے عابد معز سے سائنسی تصانیف خصوصاً ''ذیابیطس کے ساتھ ساتھ، کوالیسٹرال کم کیجئے'' کے حوالے سے اردو کی سائنسی ادب میں اضافہ کی حیثیت قرار دیا ہے اور ان تصانیف کی اہمیت وافادیت کو سمجھتے ہوئے داد دی ہے۔

الغرض عابد معز کی ادبی وطبی تخلیقات اردو ادب کے گراں سرمایے میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں وہ عصر حاضر کے کالم نگاروں اور طنز و مزاح نگاروں کی فہرست کے صف اول میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں، بلاشبہ جب کبھی اردو طنزیہ ومزاحیہ اور فکائیہ کالم کی تاریخ لکھی جائے گی تو مورخ عابد معز کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔

☆☆☆

کتابیات

کتابیات

عابد معز کی تصانیف

سلسلہ نشان	کتاب کا نام	موضوع	مقام اشاعت	سن اشاعت
1	اردو ہے جس کا نام	مضامین	حیدرآباد	زیرطبع
2	بات سے بات	کالم	حیدرآباد	جون ۲۰۱۲ء
3	چکنائی اور ہماری صحت	طبی	حیدرآباد	دوسرا ایڈیشن، مئی 2012
4	حج وعمرہ اور ہماری صحت	طبی	حیدرآباد	ستمبر 2012
5	ذیابیطس کے ساتھ ساتھ	طبی	حیدرآباد	تیسرا ایڈیشن۔۲۰۱۲ء
6	رمضان اور ہماری صحت	طبی	حیدرآباد	جون 2012
7	سگ گزیدہ	مضامین	حیدرآباد	جنوری ۱۹۹۵ء
8	عرض کیا ہے	افسانے	حیدرآباد	اگست ۲۰۱۱ء
9	غذا اور تغذیہ	طبی	حیدرآباد	(زیر اشاعت)
10	فارغ البال	انشائیے	حیدرآباد	مئی ۲۰۱۳ء
11	فاسٹ فوڈ اور سافٹ ڈرنکس	طبی	حیدرآباد	۔مئی 2013
12	کولسٹرال کم کیجیے۔	طبی	حیدرآباد	جون 2012ء
13	واہ حیدرآباد	مضامین	حیدرآباد	جنوری ۱۹۹۶ء
14	یہ نہ تھی ہماری قسمت	افسانے	حیدرآباد	جنوری ۲۰۱۲ء

دیگر تصانیف

سلسلہ نشان	مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
	ابن اسماعیل	اردو طنز و مزاح، احتساب و انتخاب	گلشن پبلشرز سری نگر،	1988
	احمد جمال پاشاہ	ظرافت اور تنقید	بہار اردو اکادمی پٹنہ	1982ء
	اظہار اثر	سائنس کیا ہے	جے کے آفسٹ پریس دہلی	1993
	اقبال قادری	رہبر اخبار نویس	ترقی اور ہند بیورو نئی دہلی	1989
	امداد صابری،	تاریخ صحافت اردو،		
	ایس جے صادق	اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد	حیدر آباد	1975
	ایس جے صادق	کنہیالعل کپور حیات اور کارنامے	دہلی	1975
	پروفیسر اختر انصاری	اردو افسانہ بنیادی تشکیلی عناصر	فرینڈس بک ہاؤس علی گڑھ	1946
	پروفیسر قمر رئیس	نیا افسانہ مسائل اور میلانات بہ یاد	اردو اکادمی دہلی	
	پطرس بخاری،	پطرس کے مضامین،	اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دہلی،	
	جمیل جالبی،	تاریخ ادب اردو (جلد دوم حصہ دوم)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1984
	چودھری رحیم علی الہاشمی	فن صحافت	انجمن ترقی اردو، نئی دہلی	1943
	ڈاکٹر نکہت آراء	اردو افسانہ اور تکنیکی مطالعہ	غازی آباد	
	رشید احمد صدیقی	طنزیات و مضحکات	دہلی	1983
	سردار جعفری،	ترقی پسند ادب،	انجمن ترقی اردو علی گڑھ،	1951ء
	سلیم اختر	انشائیہ کی بنیاد	شان ہند پبلی کیشنز نئی دہلی 1988	
	سید محمد حسنین	صنف انشائیہ اور انشائیے	نسیم بک ڈپو لکھنو 1973	

شفیق احمد	مجتبیٰ حسین بحیثیت کالم نگار، مقابلہ برائے ایم فل حیدرآباد۔		2002
طارق سعید،	اسلوب اور اسلوبیات،	لاہور،	1998
طارق سعید،	اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب،	ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ،	1996
طالب خوندمیری	سخن کے پردے میں	حیدرآباد	2005
طاہر تونسوی	طنز و مزاح تاریخ و تنقید	دہلی	1986
طاہر مسعود،	یہ صورت گر کچھ خوابوں کے،	مکتبہ تخلیق ادب کراچی۔	1985ء
عرشیہ جبین،	شارب ردولوی، شخصیت اور تنقید نگاری،	حیدرآباد۔	2005ء
فرقت کاکوروی،	اردو ادب میں طنز و مزاح،	ادارہ فروغ اردو لکھنو،	1964ء
فرمان فتحپوری،	اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے،	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	1992ء
فریدہ زین	دل سے دار تک	اردو اکیڈیمی	1982
فریدہ زین	سسکتی چاندنی	شالیمار پبلکیشنز حیدرآباد	1979
قمر رئیس،	ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر،	ثمر آفسٹ پریس نئی دہلی،	1987ء
کرشن چندر	شخصیت اور فن	محمد بیگ احساس	حیدرآباد
گوپی چند نارنگ،	ادبی تنقید اور اسلوبیات،	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1989ء
گوپی چند نارنگ	نیا اردو افسانہ انتخاب	اردو اکادمی دہلی	
محمد اسلم پرویز	سائنس پارے	کلاسیکل پرنٹرس نئی دہلی	1990
محمد سلم پرویز	سائنس کی باتیں	کلاسیکل پرنٹرس نئی دہلی	1976
محمد شکیل خان	اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب	عبارت آفسٹ دہلی	1988
محمد خان،	بجنگ آمد	کتاب والا دہلی،	1996ء
مظہر احمد،	پیروڈی،	شبانہ پبلی کیشنز، دلی۔	1991ء
مقصود اقبال	حیدرآباد میں کالم نگاری، مقابلہ برائے ایم فل	حیدرآباد۔	1991

منظر عباس نقوی،	اسلوبیاتی مطالعے	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ،	1989ء
نامی انصاری،	آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح،	ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ،	2003
نامی انصاری،	بیسویں صدی میں طنز و مزاح (انتخاب نثر)	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی۔	2002ء
نریندر لوتھر	مزاج پرسی	حیدرآباد	1983
نریندر لوتھر	الف تحاشا	حیدرآباد	1985
نریندر لوتھر	ہوائی کولمبس	حیدرآباد	1989
نریندر لوتھر	بند کواڑ	دہلی	1964
وزارت حسین	جدید علم سائنس	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	1997
وزیر آغا	اردو ادب میں طنز و مزاح	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ	1999
وزیر آغا	داستان سے افسانے تک	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	1987
وقار عظیم	داستان سے افسانے تک	طاہر بک ایجنسی دہلی	1982
وقار عظیم	نیا افسانہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	1977
یاسمین فاطمہ	جدید اردو افسانے میں عصری حسیت	مکتبہ شعر و حکمت	

☆☆☆

رسائل و جرائد

شگوفہ (ماہنامہ) حیدرآباد (دکن) نومبر 2008ء، عابد معز نمبر

انسائیکلوپیڈیا اور لغات

1	فرہنگ عامرہ	محمد عبداللہ خان	
2	اردو انگلش ڈکشنری	مولوی عبدالحق	2001
3	فرہنگ آصفیہ		
4	فیروز الغات	مولوی فیروزالدین	2000
5	نورالغات	مولوی نورالحسن نیر	1998

شخصی انٹرویو

1	ڈاکٹر عابد معز	حیدرآباد	حیدرآباد 15 جولائی 2012
1	نواب سکندر علی خان	حیدرآباد	بتاریخ 15 رجون 2013
2	خورشید احمد شفقت اعظمی	دہلی (بذریعہ میل)	8راپریل 2012
3	ڈاکٹر ابوالفظل سید محمد علی	امریکہ (بذریعہ میل)	6رمئی 2013ء
4	رشید انصاری	حیدرآباد	21رجون 2013ء
5	یوسف عبدالرحیم	بیدر	21رمئی 2013ء

DECLARATION

I ***MD MAJEED MIYAN*** here by declare that this thesis entitled **"ACADEMIC & LITERARY CONTRIBUTION OF ABID MOIZ,*(ABID MOIZ KI ILMI O ADBI KHIDMAT)*"** submitted by me under the gurdance and supervision of ***Dr.Rizwana Moin*** Assistant Professor is a bonafide research work. I also declare that it has not been submitted preveiously in part or in full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma.

MD MAJEED MIYAN

Date:

Signature of the Student

Regd.No.07HUPH14.

<u>**CERTIFICATE**</u>

This is to certify that the thesis entitled **"ACADEMIC & LITERARY CONTRIBUTION OF ABID MOIZ, *(ABID MOIZ KI ILMI O ADBI KHIDMAT)*"** submitted by ***MD MAJEED MIYAN,*** bearing **Reg.No. 07HUPH14** in partial fulfillment of the requirements of the award of Doctor of Philosophy in Urdu is a bonafide work carried out by him under my supervison and guidance.

This thesis has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for the award of any degree or diploma.

Date:

Signature of the Supervisor

Countersigned

Head of the Department

Dean of the School

عابد معز کی علمی و ادبی خدمات

تلخیص

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

نگران

ڈاکٹر رضوانہ معین

اسوسئیٹ پروفیسر شعبہ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

مقالہ نگار

محمد ماجد میاں

ایم اے، ایم فل

شعبہ اردو اسکول آف ہیومانٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد۔۵۰۰۰۴۶

جولائی ۲۰۱۳ء

ڈاکٹر عابد معز کی علمی و ادبی خدمات

تلخیص

ڈاکٹر عابد معز کی ادبی شخصیت کے ہمہ جہت پہلو ہیں وہ بہ یک وقت کالم نگار، انشائیہ نگار، افسانہ نگار اور طبی و سائنسی مضمون نگار کے علاوہ ممتاز طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔ دراصل ادبی دنیا میں آپ نے ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ہی قدم رکھا، ان کی تقریباً تمام ادبی تحریروں میں طنز و مزاح کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ عابد معز نے اپنے گرد و پیش ماحول کی ناہمواریوں کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا۔ ان کے طنز کے پیچھے اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے۔ وہ روزمرہ معاملات واقعات کو مزاحیہ انداز لیکن آسان و سلیس زبان میں پیش کیا ہے۔ جس سے ان کا مزاح عوامی مزاح کی ترجمانی کرتا ہے۔

اس مقالہ کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب عابد معز کی حیات اور شخصیت کے متعلق ہے۔ اس باب میں عابد معز کے آباء و اجداد، والدین و بھائی بہن کی تفصیلات دیتے ہوئے ان کی ولادت، تعلیم و تربیت، ملازمت، شادی، سماجی و ادبی خدمات، ادبی سفر کی ابتداء کے علاوہ ان کی تمام تصانیف کا اختصار سے جائزہ لیا گیا ہے۔ آگے ان کے مشاغل، حلقہ احباب کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہے۔ اسی طرح آگے عابد معز کی شخصیت کے پہلوؤں کا احاطہ بھی کیا گیا ہے جیسے ملنساری، شگفتہ مزاجی، اصول پسندی، قائدانہ صلاحیت وغیرہ۔

دوسرا باب عابد معز بحیثیت طنز و مزاح نگار پر مشتمل ہے۔ عابد معز نے اپنے گرد و پیش کے ماحول کی ناہمواریوں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ چنانچہ اس باب میں انھیں موضوعات کا تجزیہ کیا گیا ہے جیسے مہنگائی، معاشرے کی اخلاقی گراوٹ، اسلام مخالفت، جنگ و دہشت گردی، بڑھتی ہوئی آبادی، مغربی

معاشرہ کی تقلید کے علاوہ سماجی کردار میں پولیس، درزی، حجام وغیرہ۔

تیسرا باب عابد معز بحیثیت افسانہ نگار، انشائیہ نگار، کالم نگار کے عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں عابد معز کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے افسانوں کے نمائندہ موضوعات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔اسکے بعد عابد معز کی انشائیہ نگاری کا اختصار سے جائزہ لیتے ہوئے ان کے انشائیوں کی خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ عابد معز کی کالم نگاری پر اختصار سے روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کالموں کے اہم موضوعات ومقاصد کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں عابد معز کے مخصوص انداز بیان، حربہ اور اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے طنز ومزاح کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ جیسے لطیفہ گوئی، چٹکلہ بازی، خود برداشتہ مزاح، بذلہ سنجی، ضرب الامثال اور کہاوتیں، تراکیب، تلمیح، موازنہ، لفظی بازیگری اور مزاحیہ صورت واقعہ وغیرہ۔

پانچواں باب عابد معز کی طبی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ ہے جس میں ان کی چار اہم تصانیف تصانیف جو طب، صحت وتغذیہ کے موضوع پر مشتمل ہیں جیسے ذیابیطس کے ساتھ ساتھ، کولیسٹرال کم کیجیے، چکنائی اور ہماری صحت، غذا اور تغذیہ۔ان چاروں کتابوں پر مفصل روشنی ڈالتے ہوئے ان کتابوں کے ذریعہ طبی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

مقالہ کے آخر میں اختتامیہ رکھا گیا ہے جس میں عابد معز کی علمی وادبی خدمات کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عابد معز کے آباواجداد کا تعلق ضلع محبوب نگر تعلقہ کلواکرتی کے ایک عزت دار مرشدی گھرانے سے ہے۔عابد معز کے دادا میر سید محمد علی وطن تعلقہ کلواکراتی ضلع محبوب نگر میں پیدا ہوئے، عدالت میں محرر تھے۔ڈاکٹر عابد معز کے والد محترم سید خواجہ قطب الدین کی پیدائش 12 رمئی 1926ء کو کلواکرتی ضلع محبوب نگر میں ہوئی۔اور انتقال ۱۲ رجون ۱۹۹۳ء میں شہر حیدرآباد میں ہوا۔ابتدائی تعلیم میٹرک محبوب نگر کے تعلقوں

میں ہوئی انٹر میڈیٹ سٹی کالج حیدرآباد سے کیا۔B.Sc بھی اسی کالج سے کیا۔عثمانیہ یونیورسٹی سے M.Scفزکس میں کیا۔ M.Sc کے بعد بحیثیت لیکچرار تقرر ہوا۔وہ زیادہ عرصہ سائنس کالج سیف آباد میں رہے۔کچھ عرصہ نظام کالج اور عثمانیہ یونیورسٹی پی جی سنٹر ورنگل میں بھی رہے۔وہ ریڈر اور صدر کی حیثیت سے سائنس کالج سیف آباد سے ۱۹۸۶ میں ریٹائر ہوئے۔سید خواجہ قطب الدین نہایت شریف اور مذہبی انسان تھےاور نہایت ہی سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔

ڈاکٹر عابد معز کی ولادت ۲۵ جنوری ۱۹۵۵ءکو ننہیال قصبہ ماڑاپور ضلع محبوب نگر آندھرا پردیش میں ہوئی۔ان کا خاندانی نام سید خواجہ معز الدین ہے،ادبی دنیا میں وہ عابد معز کے نام جانے جاتے ہیں۔عابد معز کی ابتدائی وثانوی تعلیم انگلش میڈیم سے حیدرآباد میں ہوئی، عابد معز میٹرک کے بعد اپنا تعلیمی سفر جاری رکھتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کے لیےاس وقت کے شہرت یافتہ معروف درسگاہ انوار العلوم کالج ملے پلی حیدرآباد میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۳ء میں انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔انٹر میڈیٹ کے بعد ڈگری اور ڈگری کے بعد وہ آئی اے ایس کا امتحان دینا چاہتے تھے لیکن اپنے والد کی مرضی کے مطابق انہوں نے انٹر میڈیٹ کے بعد میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے انٹرنس ٹسٹ میں شرکت کی اور اس میں اچھا رینک ملا۔جس کی بناء پر ۱۹۷۳ میں انھیں عثمانیہ میڈکل کالج میں داخلہ ملا۔۱۹۷۹ء میں عثمانہ میڈیکل کالج سے MBBS پاس کیا اور ۱۹۸۵ء میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف نیوٹریشن اور عثمانیہ یورسٹی سے تغذیہ اور استحالی امراض میں پوسٹ گریجویشن ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔حصول تعلیم کے فوری بعد ۱۹۷۹ء میں حیدرآباد کے ایک محلّہ محمدی لائین میں کلینک پرکٹس شروع کی،بعد میں انہوں نے یہ کلینک اپنے گھر کے قریب کوٹلہ عالیجاہ میں منتقل کردیا ۔۱۹۸۲ء میں حکومت اندھرآپردیش کی جانب سے ان کا تقرر سیول اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے ضلع محبوب نگر میں ہوااس کے بعد ان کا تبادلہ حیدرآباد مولاعلی،اوپن جیل،مشیر آباد جیل میں ہوا،پھر عدالت عالیہ(ہائی کورٹ) میں خدمات انجام دی۔پانچ سال سرکاری ملازمت کرنے بعد ۲۷ اپریل ۱۹۸۷ءکو سعودی عرب

روانہ ہو گئے جہاں وزارت صحت، ریاض میں ماہر طبیب تغذیہ کے عہد پر کل ۲۳ سال تک معمور رہے۔ ڈاکٹر عابد معز اپریل ۱۹۸۷ء سے اگست ۲۰۱۰ء تک وزارت صحت سعودی عرب میں مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دی اب وہ فیمیلیا ہاسپٹل، روڈ نمبر ۱۲، بنجارہ ہلز، حیدرآباد میں خانگی پریکٹس کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر عابد معز کی شادی ۱۹۸۳ء میں فرحانہ محمدی صاحبہ سے ہوئی ان کی پیدائش، 1 / جون ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ فرحانہ محمدی کا تعلق جنوبی ہند سے ہے۔ انکی مادری زبان تیلگو ہے۔ ملیالم وتمل اور انگریزی خوب جانتی ہیں، شادی سے پہلے تھوڑی بہت ہندی سے واقفیت رکھتی تھیں لیکن اردو سے بالکل ناواقف تھیں۔ شادی کے بعد انھوں نے نہ صرف اردو میں بات کرنا سیکھا بلکہ اردو پڑھ بھی سکتی ہیں۔

ڈاکٹر عابد معز نے طالب علم کے زمانے سے لکھنا شرع کیا، تب وہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو انکا پہلا مضمون 'لائبریری میں چند گھنٹے'' نوجوانوں کے صفحہ روزنامہ ''رہنماء دکن'' میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اردو کے نامور مزاح نگار مسیح انجم نے ان کا تعارف شگوفہ کے مدیر سے کروایا۔ باقاعدگی سے چھپنے کا آغاز ماہنامہ شگوفہ سے ہوا۔ شگوفہ میں ان کا پہلا مضمون 'پیسہ' کے عنوان سے مارچ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ ماہنمامہ شگوفہ میں ''میرا شہر لوگاں سو معمور کر' کے عنوان کے تحت حیدرآباد پر موضوعاتی مضامین کا سلسلہ چلتا رہا۔

۱۹۸۷ء میں عابد معز ملازمت کے سلسلے میں سعودی عرب روانہ ہوئے جہاں انہوں نے ۲۳ سال گذارے۔ سعودی عرب میں بھی ملازمت کے ساتھ ادب تخلیق کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ سعودی عرب میں قیام کے بعد قیام نامہ عنوان کے تحت روز نامہ اردو نیوز جدہ میں تاثراتی مضامین لکھتے رہے۔ روز نامہ اعتماد حیدرآباد کے ادبی ایڈیشن اوراق ادب میں ہر دوشنبہ کالم میں 'پھر چھڑی بات' کے عنوان سے شائع ہوتے رہے جس کا سلسلہ مارچ ۲۰۰۶ء سے گسٹ ۲۰۰۸ء تک چلتا رہا۔ عابد معز کا ایک اور کالم 'بات سے بات' کے عنوان سے ہفتہ روز اردو میگزین جدہ سے ۲۵ مئی ۲۰۰۷ سے ۱۱۳ کٹوبر ۲۰۰۹ء تک چلتا رہا۔

عابد معز بحیثیت مضمون نگار، کالم نگار، انشائیہ نگار اور افسانہ نگار ادب کی خدمت کی ہے۔ان کی تخلیقات ہندو پاک کے علاوہ سعودی عرب کے مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔جیسے ماہنامہ شگوفہ، روابطہ، آج کل، افکار، چہارسو، اردو ڈائجسٹ، اردو پنچ، اردو نیوز، اردو میگزین وغیرہ بحیثیت ادیب عابد معز کی اب تک چھ کتابیں شائع ہوئی ہیں اور ایک زیر طبع ہے۔ان کتابوں کی تفصیل اس طرح ہے:

(۱)۔ واہ حیدرآباد مضامین کا مجموعہ جنوری ۱۹۹۶ء

(۲)۔ سگ گزیدہ مضامین کا مجموعہ جنوری ۱۹۹۵ء

(۳)۔ عرض کیا ہے شگفتہ افسانے گسٹ ۲۰۱۱ء

(۴)۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت شگفتہ افسانے جنوری ۲۰۱۲ء

(۵)۔ بات سے بات۔ کالم جون ۲۰۱۲ء

(۶)۔ فارغ البال۔ انشائیے مئی ۲۰۱۳ء

(۷) اردو ہے جس کا نام۔ زیر طبع

ادبی تخلیقات کے علاوہ ڈاکٹر عابد معز ''صحت ،طب اور تغذیہ، کے موضوعات پر اردو زبان میں بے شمار مضامین اور کالم لکھے ہیں۔جو مختلف اخبارات اور رسائل جیسے سائنس کی دنیا، کتاب نما، اردو نیوز، سیاست، منصف، اعتماد وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔روز نامہ منصف میں 'صحت وطب' کے عنوان سے ایک کالم ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۷ء تک لکھتے رہے۔اس کے علاوہ 'غذائیات'' کے عنوان سے روز نامہ 'اعتماد' میں ہر بدھ کے دن تغذیہ کے موضوع پر مختصر معلومات ۵ دسمبر ۲۰۱۲ء سے لکھ رہے ہیں۔اور اسی روز نامہ میں' شکر ریزے' کے عنوان سے مرض ذیابیطس کے متعلق اختصار سے ہر اتوار کو لکھ رہے ہیں۔یہ سلسلہ ۲۰۱۲ء سے جاری ہے۔عابد معز اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی صحت و تغذیہ کے موضوعات پر چند مضامین لکھے ہیں۔

عابد معز مختلف اوقات میں مختلف اخبارات و رسائل سے وابستہ رہے ہیں جیسے اردو زبان کے منفرد طنز

ومزاحیہ رسالے ماہانہ شگوفہ کے جنوری ۱۹۹۲ء سے اگست ۲۰۱۰ء تک ایڈیٹر اوو ریسینر کی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر ستمبر ۲۰۱۰ء اگسٹ ۲۰۱۱ء تک ماہنامہ شگوفہ کے معاون مدیر کے بھی فرائض انجام دئے۔ سعودی عرب کی وزرات صحت کے ادارہ التغذ والصحت کے مجلّہ کے انگریزی حصہ کے مدیر رہے۔ اس کے علاوہ دہلی سے شائع ہونے والے اردو ماہنامہ ''سائنس'' کی مجلس مشاروت کے رکن بھی رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے تین مضامین دہلی سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ماہنامہ 'کتاب نما'' میں مہمان اداریہ کی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ماہنامہ کتاب نما میں ان کا پہلا مہمان اداریہ ''اردو زبان میں سائنسی اور طبعی علوم کی پیش کش' کے عنوان سے اکٹوبر ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا اور دوسرا مہمان اداریہ اکٹوبر ۲۰۰۳ء کے شمارے میں ''اردو زبان کی تعلیم لازمی قرار دی جائے''۔ کے عنوان سے شائع ہوا۔ تیسرا مہمان اداریہ ''اکیسویں صدی: مزاح اور طنز کی صدی ہے' کے عنوان سے مارچ ۲۰۰۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ بحیثیت کالم نویس، روزنامہ اردو نیوز جدہ' ہفت روزہ اردو میگزین جدہ اور روزنامہ اعتماد، حیدرآباد سے وابستہ رہے ہیں۔

عابد معز مختلف علمی وادبی انجمنوں سے وابستہ رہے ہیں۔ ۱۹۸۳ء سے زندہ دلان حیدرآباد کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے وابستہ ہوئے۔ بعد ازاں زندہ دلان حیدرآباد کے شریک معتمد اور معتمد عمومی کے فرائض بھی انجام دئے۔ سعودی عرب پہنچنے کے بعد ریاض میں اردو کی ترقی وترویج کے لیے ۱۹۹۶ء میں'' ہندوستانی بزم اردو'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ اس انجمن کے بانی ممبر کے علاوہ ۲۰۱۰ء تک اس کے نائب صدر بھی رہے ہیں

ڈاکٹر عابد معز سعودی عرب میں ہندوستانی سفارت خانے کی جانب سے انڈین اسکولس، سعودی عرب کے ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۶ء تک بورڈ کے ممبر بھی رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سعودی عرب ریاض برسرِ خدمت گزار ہندوستانی ڈاکٹرز کی انجمن ''انڈین ڈاکٹر فورم'' کے جون ۲۰۰۶ء سے جون ۲۰۱۰ تک صدر کی حیثیت

سے خدمات انجام دی ہے۔

عابد معز گونا گوں غیر معمولی صلاحیتوں ہیں۔ان کی شخصیت بڑی پہلو دار ہمہ رنگ اور پر کشش ہونے کے ساتھ اپنی ذات سے خود ایک انجمن ہیں۔تاریخی،سماجی،سیاسی،مذہبی،طبی اور سائنسی موضوعات پر ان کی گہری نظر رہتی ہے۔وہ کسی بھی موضوع پر تر و تازہ معلومات دیتے،اور کھلے ذہن سے بات کرتے ہیں۔خاموش طبیعت کے مالک ہیں۔اس کے باوجود ان کی تحریروں سے ظرافت کے پھول جھڑتے ہیں۔

دراصل ادبی دنیا میں انھوں نے ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ہی قدم رکھا۔ان کی بیشتر ادبی تحریروں میں طنز و مزاح کے عناصر پائے جاتے ہیں۔عابد معز نے بھی اپنے گرد و پیش کے ماحول کی ناہمواریوں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ان کے طنز و مزاح کے پیچھے اصلاح کا جذبہ ہے انھوں نے اپنی فکاہیہ تحریروں میں اپنے عہد کی بے شمار ناہمواریوں کو اپنے طنز و مزاح کا موضوع بنایا ہے۔ان کے اہم موضوعات جیسے مہنگائی، بڑھتی ہوئی آبادی، محکمہ برقیات، ایرانڈیا، معاشرے کی اخلاقی گراوٹ، بم سازی، اسلام مخالف، مغربی معاشرے کی تقلید، جنگ، دہشت گردی، یورپ اور امریکہ، اردو زبان، انگریزی زبان، شعر و شاعری، نقاد، مزاح نگاری، سماجی کردار، ڈاکٹر، دواخانوں کی صورتحال، پولیس، درزی، حجام، شوہر، بیوی، نوجوانان، وغیرہیں۔

ڈاکٹر عابد معز کی فکاہیہ تحریروں کے موضوعات میں مواد کی فراہمی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکاہیہ تحریریں موجود معاشرے سے اخذ کی گئی ہیں۔عابد معز کی ظریفانہ تحریروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتے ہیں۔وہ واقعہ کے چشم دید گواہ کی طرح قاری کو پورا منظر دکھاتے ہیں۔قاری بھی انھیں اپنا ہمسفر سمجھتا ہے۔عابد معز کا مزاح شائستہ و با مقصد ہوتا ہے وہ کسی بھی ناہموار صورت حال پر کتنا ہی شدت سے طنز کریں لیکن شائستگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ان کا مزاح قہقہہ کے بجائے زیر لب تبسم کا حامل ہے۔عابد معز کا مزاح، زیر لب تبسم ہونے کے باعث ابتداء میں خشک محسوس

ہوتا ہے۔ کیونکہ دیگر مزاح نگاروں کی طرح وہ اپنے موضوع کی تمہید میں قاری کو متاثر کرنے کے لیے پھکڑ پن یا غیر اخلاقی واقعات کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ان کا مزاح ابتداء سے آخر تک مہذب ہوتا ہے۔ عابد معز کا مزاح مہذب ہونے کے باوجود قاری کے دل میں انبساط پیدا کرتا ہے اور شروع سے آخر تک قاری کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آتی ہے اور دل مسرت سے آمیزہ ہو جاتا ہے۔

عابد معز کامیاب مزاح نگار ہونے کے علاوہ اچھے افسانہ نگار بھی ہیں، ان کے افسانوں کے نمائندہ موضوعات میں انسانی جذبات، سماج کی خامیاں وخوبیاں، زندگی کی تلخ حقیقتیں، رشتوں کی نزاکت، باہمی تعلقات محبت، نفرت، عداوت، حسد جلن، غلط فہمیاں وغیرہ بھی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے سائنسی ایجادات اور طبی مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان تمام موضوعات پر انہوں نے ظریفانہ اسلوب کے ذریعہ روشنی ڈالی ہے۔ عابد معز کی افسانہ نگاری کی خوبی یہ ہے کہ ہر تحریر میں ان کی شخصیت جھلکتی ہے یہی نہیں بلکہ اپنی ہر کہانی میں کہیں نہ کہیں ایک کردار کی حیثیت سے شامل رہتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پائے جانے والے کردار خیالی ہونے کے باوجود حقیقی معلوم ہوتے ہیں، اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔

ان کے شگفتہ افسانے نہ صرف افسانوی ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اردو کے طنزیہ ومزاحیہ ادب میں نئے ذائقہ کے حامل بھی ہیں۔ عابد معز نے روزمرہ زندگی سے تعلق رکھنے والے موضوعات پر مختصر وجامعہ انداز میں جس طرح شگفتہ افسانے لکھے ہیں اس سے نئے لکھنے والوں کو ایک تحریک بھی مل سکتی ہے۔

عابد معز بلند پایہ مزاح نگار اور افسانہ نگار کے علاوہ ایک کامیاب کالم نگار بھی ہیں۔ ان کے کالم حالت حاضرہ اور عالمی صورت حال کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ جنھیں ہندو پاک اور خلیجی ممالک میں بھی سراہا گیا ہے۔ انہوں نے سماجی، معاشرتی، ثقافتی کے علاوہ سائنس وٹکنالوجی، صحت وطب اور تغذیہ جیسے موضوعات کو اپنی کالم نگاری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے کالموں کا اسلوب بھی مزاحیہ وطنز آمیز اسلوب

ہے۔ وہ اپنے کالموں میں قارئین کو ہنسی ہنسی میں دنیا میں وقوع پزیر ہونے والے واقعات سے مکمل آگہی کراتے ہیں۔سائنسی ایجادات وعالمی صورت حال کے منظر نامے کواس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان کے کالم معلومات کے خزانے معلوم ہوتے ہیں۔قاری ان کالموں کے باعث ہمیشہ نئے علوم سے اپنا رشتہ بنائے رکھتا ہے۔ عابد معز کے کالموں کا اسلوب سادہ سنجیدہ ہونے کہ ساتھ ظریفانہ بھی ہوتا ہے وہ اپنے کالموں میں ضرورت کے مطابق ظریفانہ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ وہ اپنے اس اسلوب میں جب لکھتے ہیں تو شائستگی کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ان کے ظریفانہ اسلوب میں پھکڑ پن کا عنصر کہیں نہیں ہوتا، ان کے کالم کی زبان نہایت پر لطف ہوتی ہے۔ وہ اپنی بات کو سمجھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے واقعات وفرضی کردار کا استعمال کرتے ہیں۔اور ایسے چٹخارے جملے استعمال کرتے ہیں کہ قاری زیر لب مسکراتے ہوئے ان کے کالم کا مطالعہ کرتا ہے یہی نہیں بلکہ باتوں باتوں میں وہ اپنے قاری کو متعلقہ موضوع پر غور وفکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔

عابد معز کی ادبی خدمات میں انشائیہ نگاری بھی قابل اعتراف ہے۔ان کے انشائیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی انشائیہ نگاری ایک خاص انفرادیت رکھتی ہے۔ایک اچھے انشائیہ نگار کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کا تعلق ہمیشہ روح عصر سے جڑ ہوا ہو۔ عابد معز ایک ایسے بیدار مغز انشائیہ نگار ہیں کہ ان کے فکری شعور میں عصری حسیت بنیادی جز ہے وہ ہمیشہ عصری موضوعات چاہے ملکی سطح ہو یا عالمی سطح پر فوراً متوجہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے عصر حاضر کے انشائیہ نگاروں میں عابد معز کی شخصیت اپنے انوکھے اسلوب اور طرز اظہار کے باعث ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

ڈاکٹر عابد معز کی تحریروں کا اسلوب ظریفانہ اور طنزیہ ہے۔ اس اسلوب کی بدولت وہ ایک طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے ابھر کر آتے ہیں۔انہوں نے اپنی تحریروں میں طنز ومزاح کیبنیادی اجز، موازنہ، لفظی بازیگری، مزاحیہ صورت واقعہ، مزاحیہ کردار اور تحریف کے علاوہ دوسرے حربوں کا استعمال کیا ہے۔ جیسے

لطیفہ گوئی، خود برداشتہ مزاح، محاوروں کا استعمال اور تحریف، ضرب الامثال اور کہاوتوں کا برمحل استعمال تراکیب، تشبیہہ، اشعار اور مصرعوں کا بھی استعمال کیا ہے۔

عابد معز کی علمی خدمات کا ایک روشن پہلو طبی خدمات بھی ہیں۔ انھوں نے ادبی تخلیقات کے علاوہ صحت، طب و تغذیہ کے موضوعات پر اردو زبان میں بے شمار مضامین و کالم لکھے ہیں۔ جو مختلف قومی و بین الاقوامی اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ عابد معز نے صحت، طب اور تغذیہ کے موضوعات پر نہایت سلیس اور آسان زبان میں معلومات فراہم کی ہے اور سائنس اور طب کی بے شمار اصطلاحات کو بھی سادہ سلیس و آسان زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ جس سے قاری کو متعلقہ معلومات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی بات کو واضح انداز میں سمجھانے کے لیے مختلف تصویروں کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس طرح بے شمار خوبیوں کی وجہ سے عابد معز کی یہ تحریریں مقبول عام ہو چکی ہیں۔ صحت، و تغذیہ کے موضوعات پر عابد معز کی اردو زبان میں اب تک چھ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، ایک اور کتاب زیر اشاعت ہے۔

۱)۔ ذیابیطس کے ساتھ ساتھ — اشاعتِ سوم مارچ ۲۰۱۲ء

۲)۔ چکنائی اور ہماری صحت — اشاعتِ دوم مئی ۲۰۱۲ء

۳)۔ کولیسٹرال کم کیجئے — جون ۲۰۱۲ء

۴)۔ رمضان اور ہماری صحت — جون ۲۰۱۲ء

۵)۔ حج و عمرہ اور ہماری صحت — ستمبر ۲۰۱۲ء

۶)۔ فاسٹ فوڈ اور سافٹ ڈرنکس — مئی ۲۰۱۳ء

۷)۔ غذا اور تغذیہ (زیر اشاعت)

الغرض عابد معز کی ادبی و طبی تخلیقات اردو ادب کے گراں سرمایے میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں وہ عصر حاضر کے کالم نگاروں اور طنز و مزاح نگاروں کی فہرست کے صف اول میں شمار کئے جانے کے مستحق

ہیں، بلاشبہ جب کبھی اردو طنز یہ ومزاحیہ اور فکائیہ کالم کی تاریخ لکھی جائے گی تو مورخ عابد معز کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔

☆☆☆

ACADEMIC & LITERARY CONTRIBUTION OF ABID MOIZ

(ABID MOIZ KI ILMI O ADBI KHIDMAT)

SYNOPSIS

A THESIS SUBMITTED TO THE UNIVERSITY OF HYDERABAD IN PARTIAL FULFILMENT OF THE REQUIREMENT FOR THE AWARD OF DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY

IN URDU.

SUBMITTED BY

MD MAJEED MIYAN

M.A,M.Phil

Supervisor By

Dr.RIZWANA MOIN

Associate Professor, Dept. of Urdu,University of Hyderbad

DEPARTMENT OF URDU
SCHOOL OF HUMANITIES.
UNIVERSITY OF HYDERABAD
(P.O) CENTRAL UNIVERSITY, GACHIBOWLI
HYDERABAD - 500046.
Andhra Pradesh , India
July 2013